مکتوبات شیخ عبدالحق محدث دہلوی

اردو

مترجم

جناب مولانا محمد فاضل صاحب دارالعلوم کراچی

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ بندر روڈ کراچی ۱

مکتوبات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

اردو

مترجم

جناب مولانا محمد فاضل صاحب دارالعلوم کراچی

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ بندر روڈ کراچی ۱

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ

اللہ تعالیٰ اپنی طرف جس کو چاہتا ہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص رجوع کرے اسکو اپنے تک رسائی دیتا ہے

مکتوبات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

اُردو

مترجم

جناب مولانا محمد فاضل صاحب دارالعلوم کراچی

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ بندر روڈ کراچی ۱

فہرست مضامین

مکتوب نمبر	بنام	صفحہ
	تعارف	۴
۱	بنام حضرت خواجہ باقی باللہؒ	۵
۲	" " " "	۱۱
۳	" " " "	۱۹
۴	" " " "	۲۳
۵	" " " "	۲۷
۶	" " " "	۳۸
۷	" " " "	۵۴
۸	" شیخ عبداللہ نیازی	۵۹
۹	" " " "	۶۴
۱۰	" " " "	۷۲
۱۱	" " " "	۷۶
۱۲	" نواب خانخاناں سپہ سالار	۸۴
۱۳	" نواب مرتضیٰ خان	۸۸
۱۴	" نواب خانخاناں سپہ سالار	۹۲
۱۵	" شیخ ابوالخیر مبارک	۹۶
۱۶	" نواب فرید مرتضیٰ خان	۹۹
۱۷	" " بر واقعہ وفات اکبر بادشاہ	۱۰۱
۱۸	" نواب خانخاناں صاحب	۱۰۹
۱۹	" "	۱۱۳
۲۰	" شیخ ابوالفیض فیضی	۱۱۵
۲۱	" نواب فرید مرتضیٰ خاں	۱۱۷
۲۲	" نواب خانخاناں صاحب	۱۲۰
۲۳	" شیخ اسماعیل	۱۲۴
۲۴	" نواب فرید مرتضیٰ خاں	۱۲۶
۲۵	" " " "	۱۲۹
۲۶	" " " "	۱۳۳
۲۷	" " " "	۱۳۶
۲۸	" " " "	۱۴۰
۲۹	" " " "	۱۵۲
۳۰	اپنی بیماری کے وقت تحریر فرمایا	۱۵۸
۳۱	" "	۱۶۳
۳۲	" "	۱۶۷
۳۳	بنام نواب فرید مرتضیٰ خاں	۱۶۹

مکتوب نمبر	بنام	صفحہ
۳۴	درباب اللہ بندہ	۱۷۴
۳۵	〃 〃 〃	۱۷۸
۳۶	〃 〃 〃	۱۸۱
۳۷	〃 〃 〃	۱۸۴
۳۸	〃 〃 〃	۱۸۷
۳۹	بنام شیخ نور الحق رح	۱۹۰
۴۰	〃 〃	۱۹۲
	تکملہ	۱۹۵
۴۱	بنام شیخ نور الحق رح	۱۹۶
۴۲	〃 〃 〃	۲۰۰
۴۳	〃 〃 〃	۲۰۳
۴۴	〃 〃 〃	۲۰۶
۴۵	〃 〃	۲۰۸
۴۶	〃 شاہ ابو المعالی رح	۲۱۲
۴۷	〃 〃 〃	۲۱۴
۴۸	〃 〃 〃	۲۱۶
۴۹	〃 〃 〃	۲۲۱
۵۰	〃 〃 〃	۲۲۵
۵۱	〃 〃 〃	۲۳۱
۵۲	〃 شیخ نور الحق رح	۲۳۵
۵۳	〃 〃 〃	۲۳۸
۵۴	〃 〃 〃	۲۴۱
۵۵	〃 〃 〃	۲۴۴
۵۶	〃 〃 〃	۲۴۷
۵۷	〃 〃 〃	۲۵۰
۵۸	〃 〃 〃	۲۵۴
۵۹	مکتوب النبیؐ الاجلّ فی تعزیۃ ولد معاذ بن جبل رضؓ	۲۵۷
۶۰	بنام شاہ ابو المعالی قدس سرہ	۲۵۹
۶۱	〃	۲۶۲
۶۳	〃 شیخ نور الحق دہلوی رح	۲۶۸
۶۴	〃 〃 〃	۲۷۲
۶۵	〃 〃 〃	۲۷۷
۶۶	〃 〃 〃	۲۷۹
۶۷	تتمہ	۲۸۲
۶۸		۲۸۳
۶۹	مختصر سوانح حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح	۲۸۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٰھی لا احصی ثناء علیک۔ وصلوٰۃ علیٰ نبیک الداعی الیک۔ انت کما اثنیت علی نفسک۔ وھو کما صلیت علیہ فی کتابک الذی لا یاتیہ الباطل من خلفہ ولا من بین یدیہ

درحقیقت اللہ کی حمد وثنا اور نبی مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کا حق اللہ کے سوا کوئی ادا نہیں کرسکتا، اور اس گوہر کو حق تعالٰی کے دست قدرت کے سوا کوئی نہیں پاسکتا، کیونکہ کوئی بھی آپؐ کی ذات اقدس کو اللہ کی طرح نہیں پہچان سکتا جس طرح اللہ تعالٰی کی ذات کو آپؐ کی طرح کوئی نہیں پہچان سکتا۔ خدا ہے اور بندہ، خدا خدا ہے اور آپ بندہ، باقی تمام بندے آپؐ کے طفیلی ہیں، اللّٰھم احمد ذاتک بذاتک وصل علی محمد افضل صلوٰتک وعلی الہ وصحبہ وسلم۔

اما بعد۔ فقیر حقیر عبدالحق بن سیف الدین دہلوی نے اپنے وہ خطوط ورسائل جمع کر دیئے ہیں جو وقتی تقاضوں اور حالات کے مناسب لکھے ہیں، ان میں بعض دوستوں کی خاطر بعض اہل سلوک وتصوف کے لئے اور بعض سعید و دیندار امرا و حکام کی خدمت میں لکھ کر بھیجے گئے، اور بعض خود اپنے نفس کی نصیحت کی خاطر لکھے گئے کہ وہ اس نصیحت کا سب سے زیادہ مستحق ہے، اور بندہ کو یہ حکم ہے کہ دین کی ان باتوں کے علاوہ جن سے شریعت کی ترویج وتجدید، عقائد کی حفاظت یا سنت کا استحکام ہوتا ہے اور کوئی بات نہ کہے، اور حد اعتدال و دائرۂ احتیاط سے کبھی خارج نہ ہو اور نہ اشارات وجودیہ اور تاویلات باطنیہ کو ہاتھ لگائے۔

اس بندۂ عاجز کو مشائخ کا یہ حکم بھی ہے کہ دقائق وحقائق بیان نہ کرے بلکہ امت کے سامنے معاملات کو اور اپنے عیوب پر تنبیہ کو واضح کرے، نیز علم باطن کو علم ظاہر پر مقدم نہ کرے اور نہ باطن کو چھوڑ کر ظاہر پر اکتفا کرے، اس حکم کے مطابق اس عاجز کا تصنیف وتالیف، نقل و ترجمہ اور ائمۂ دین کے کلام میں اکثر یہ طریقہ ہے کہ راہ تنزیہ اختیار کرتا ہے، اور درحقیقت اسی کو زیادہ محکم واسلم پایا بھی ہے کہ زبان وقلم کی لغزش اور سرکشی ونافرمانی کی لعنت سے حفاظت ہو جاتی ہے، ہاں ضمناً کسی مقام کی تشریح یا رفع اشکال کے موقعہ پر ایسا کلام آگیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اہل دین کی نظر قبول واصلاح اس پر پڑے گی، اور چشم عنایت اس کو دیکھیں گے اور طالبان راہ حق اور سالکان طریقت کے لئے نافع ومفید ہوگی، اور مقصود سے پردے اٹھادے گی انہ قریب مجیب وایاہ ارجو والیہ انیب +

مکتوب نمبر ۱

بنام حضرت خواجہ محمد باقی قدس اللہ سرہ

سلوک طریق الفلاح عند فقد التربیة بالاصطلاح

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علےٰ رسول اللہ وعلےٰ آلہ واصحابہ ھداۃ طریق الحق ومحیی دین اللہ۔

بندۂ حقیر کو آپ کا گرامی نامہ ایک صاحب نے لاکر دیا، مجھے اس دو وجہ سے تعجب ہوا اول اس طرح کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شغل وحضور اور سکوت کی حالت عطا فرمائی ہے اس سے کس طرح اس طرف التفات ہوا، دوسرے اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آپ نے اس حقیر کو ان باتوں سے مخاطب فرمایا ہے جو صرف اہل کے سامنے ظاہر کی جاسکتی ہیں، گویا اس طرح آپ نے اس حقیر کو قابل اعتبار سمجھا، اس حقیر میں کہاں یہ اہلیت اور کہاں یہ مناسبت، کہ مجھ جیسے بے مایہ کے سامنے یہ باتیں بیان کی جائیں، بہرحال آپ جب اس وادی میں لے آئے ہیں تو بے شک اس میں کوئی راز ہوگا صادقین کا یہ وصف ہوتا ہے کہ وہ ہر طالب کو فائدہ پہنچاتے اور ہر مطلوب سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر دوسرے فقرہ کا مصداق یہ فقیر ہے تو پہلے آپ کی ذات ہے

یقیں میداں کہ شیرانِ شکاری	دریں رہ خواستند از مور یاری

یعنی یقین جانو کہ شکاری شیر بھی اس راہ میں چیونٹی کی مدد کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک سالک نے فرمایا ہے کہ جب مجھے اپنے سے بڑا عالم مل جائے تو وہ میرے فائدہ (اور علوم) حاصل کرنے کا دن ہے، جب مجھے اپنا جیسا مل جائے تو وہ میرے مذاکرہ کا دن ہے، جب مجھ سے ادنیٰ درجہ کا شخص مل جائے تو وہ میرے فائدہ پہنچانے کا دن ہے، اور جب مجھے ان میں سے کوئی نہ ملے تو وہ میری مصیبت کا دن ہے، ہمارے زمانہ میں باہمی مذاکرہ غنیمت ہے تاکہ عمل کی توفیق حاصل ہو سکے۔ وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر یعنی ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے اور ایک دوسرے کو صبر کا حکم

دیتے ہیں۔

گرامی نامہ میں اس پر حیرت کا اظہار ہے کہ نہ تو مجاہدہ و ریاضت کی کماحقہٗ طاقت ہے نہ وہ نظر ہے کہ حق و باطل میں امتیاز کر کے کسی حق پرست صاحب دل بزرگ کا دامن پکڑے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس زمانہ میں اس درد کا کوئی علاج نہیں، ہر طالب صادق کا اس آفت کی وجہ سے جگر خون ہو رہا ہے اور اسی حسرت میں وہ عاجز و درماندہ ہو گیا ہے، بعض عارفوں کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قواعد و ضوابط کے باوجود جو اس کام کی معرفت و تعیین کے لئے مقرر ہیں یہ مردم شناسی اور کسی ولی کا حصول سالک کے دائرۂ طاقت سے باہر ہے اور ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ یہ قواعد و ضوابط بالکل ٹھیک ہیں کہ ان سے سرمو تجاوز کرنا غلطی میں ڈال دے گا لیکن اس وقت تو یہ کام مشکل ہے کہ جمال مقصود پر ابہام کا نقاب پڑا ہوا ہے۔

مشہور ہے کہ طریقت یہ ہے کہ کسی کو کسی صاحب دل کے ساتھ محبت ہو جائے، اس صورت میں اگر مدت صحبت تھوڑی ہو تب بھی کام پورا جائے گا، اور نعمت الفت کے بغیر اگر سالہا سال صحبت واضح رہے تو کوئی فائدہ برآمد نہ ہوگا، اصل یہی محبت ہے، صحبت کم ہو یا زیادہ۔ لا الہ اللہ محمد رسول اللہ۔

اب واضح ہو گیا ہو گا کہ اولیائے کرام ؒ کا حصول، مردان خدا کی معرفت، اور ان کے نور ولایت سے استفادہ قوت ممیزہ کے زورِ بازو اور پائے طلب کی دوڑ دھوپ سے نہیں ہو سکتا، الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمائے اور اس کاربستہ کی گرہ کھولے، پھر بھی ناامید نہ ہونا چاہیئے اور اس مقصود کے لئے الحاح و زاری کے ساتھ دعا کرنے اور دل میں تڑپ پیدا کرنے سے نہ بیٹھ رہنا چاہیئے کہ برتر و بزرگ خدا دعاؤں کا قبول کرنے والا اور فقرا کو عطاؤں سے نوازنے والا ہے، انہ علی کل شئی قدیر

مشائخ ؒ کی وہ چند باتیں جو اس وقت یاد ہیں اور مقصود کے مناسب تمام مطالب و مقاصد کے لئے جامع ہیں، آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں جن کا مطالعہ اور بار بار کا تکرار بہت مؤثر اور مفید ہوگا، بہتر ہوگا کہ ان میں سے دو عبارتیں بعینہٖ نقل کر دی جائیں کہ یہ طریقہ احتیاط کے قریب اور اپنی طرف سے تصرف کی آلودگیوں سے پاک و صاف ہے (اور ہو سکتا ہے) کہ بہت سے حاملانِ علم ایسے شخص کو بات پہنچا دیں جو ان سے زیادہ

سمجھدار اور دانا ہے۔

شیخ ابوالعباس حضرمی نے فرمایا ہے کہ "تربیت بالاصطلاح اٹھ چکی ہے اور اب ہمت و حال سے افادہ ہی باقی رہ گیا ہے، لہذا اب کتاب و سنت کا اتباع بغیر کمی بیشی کے لازم ہے، اور یہ حق تعالیٰ، اپنے نفس اور مخلوق کے معاملات میں جاری ہے حق تعالیٰ کے معاملہ میں تو تین چیزیں ہوں گی (۱) فرائض کی ادائیگی (۲) حرام چیزوں سے بچنا (۳) اس کے احکام کے آگے سر جھکا دینا، نفس کے معاملہ میں بھی تین چیزیں ہیں (۱) حق بات میں انصاف کرنا (۲) نفس کے لئے انتقام و انتصاف کو ترک کرنا (۳) اخذ ورد، جلب و دفع اور اقبال و ادبار میں اس کی سازشوں سے ڈرتے رہنا، اور مخلوق سے معاملہ بھی تین چیزوں کے ساتھ ہو گا (۱) ان کے حقوق کو ادا کرنا (۲) ان کے اموال وغیرہ پر نظر نہ رکھنا (۳) اور ایسی باتوں سے گریز کرنا جو ان کے دلوں کو بدل دے الا کسی واجبی حق میں جس سے کوئی چارہ کار نہ ہو۔

اور ہر وہ مرید جو شہسواری کی طرف راغب ہو اور مصالح عامہ کو ترجیح دے، یا عام طور پر منکرات کو مٹانے میں مشغول ہو جائے، یا دوسرے فضائل کو چھوڑ کر صرف جہاد کی طرف متوجہ ہو جائے حالانکہ اسے جہاد میں نہ جانے سے کوئی گناہ بھی نہ ہو، یا تمام فضائل کا احاطہ کرنا چاہے، یا اپنے بھائیوں کی پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑ جائے اور ظاہر یہ کرتا ہو کہ ان عیوب کو چھڑانا مقصود ہے، یا دائمی طریقہ پر سماع (مباح) کا عمل رکھے، یا تعلیم و تعلم کے علاوہ کسی اور غرض سے بکثرت اجتماعات و جلسے کرے، یا اپنی دیانت کی کمی کی وجہ سے دنیا داروں کی طرف مائل ہو جائے، یا معاملات و عیوب کے علاوہ دقائق و غوامض کو اختیار کرے، یا بغیر کسی مرشد، امام اور عالم کے مقرر کئے ہوئے لوگوں کی تربیت میں لگ جائے یا ہر حق و باطل کہنے والے کا تفصیل احوال کے بغیر اتباع کرنے لگے یا اللہ تعالیٰ سے نسبت رکھنے والے بندوں کی تذلیل کرے اگرچہ انہیں وہ سچا نہ سمجھتا ہو، یا رخصتوں اور تاویلوں کو اختیار کرنے لگے، یا باطن کو ظاہر پر ترجیح دے، یا باطن سے قطع نظر کر کے صرف ظاہر پر اکتفا کرے، یا ظاہر و باطن میں مطابقت نہ رکھے، یا عمل کو چھوڑ کر صرف علم پر اکتفا کرے، یا عمل کو چھوڑ کر صرف حال کو کافی سمجھے، یا علم و عمل دونوں کو ترک کر کے صرف حال پر اکتفا کرے، یا اپنے علم، عمل اور دیانت میں ان اصول کی

خلاف ورزی کرے جو ائمۂ دین کی کتب میں مسلم و مکتوب ہیں مثلاً "باطن" میں ابن عطاء اللہ کی کتابیں، اور "ظاہر" میں ابن الحجلا، کی "مدخل" نامی کتاب، اور ان کے شیخ ابن ابی حمزہ کی کتاب اور اسی طرح کے دوسرے محققین ___ تو ایسا شخص یقیناً ہلاک ہونے والا ہے جس کی کوئی نجات نہیں، اور جو ان پر عمل کرے تو وہ انشاء اللہ نجات و سلامتی حاصل کرنے والا ہے، اور اللہ ہی توفیق دینے والا اور حفاظت فرمانے والا ہے ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس آیت کریمہ کا کیا مطلب ہے، یا ایھا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم، یعنی اے ایمان والو تم صرف اپنی فکر کرو (جس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے کو تبلیغ و نصیحت نہ کرو) تو آپ نے فرمایا کہ (یہ حکم اس زمانہ میں ہے) جب تم بخل و حرص کو لوگوں کا پیشوا اور خواہشات کا مکمل اتباع اور ہر شخص کو اپنی رائے پر پھولا ہوا دیکھو تو اس وقت تم صرف اپنی فکر کرو ___ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحف ابراہیم علیہ السلام میں لکھا ہوا ہے کہ "عقلمند پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو جاننے والا اور اپنی زبان کو قابو میں رکھنے والا اور اپنی حالت کی طرف توجہ کرنے والا ہو۔ اور عقلمند پر ضروری ہے کہ اس کے اوقات چار حصوں میں تقسیم ہوں (۱) وہ وقت جس میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے (۲) ایسا وقت جس میں اپنے پروردگار سے مناجات کرے (۳) ایسا وقت جس میں وہ اپنے بہی خواہوں سے ملاقات کرے جو اس کے عیوب اسے بتلائیں اور اللہ کے راستہ کی رہنمائی کریں (۴) وہ وقت جس میں وہ اپنے نفس کو اس کی جائز و مباح خواہشات پوری کرنے کے لئے چھوڑ دے۔" اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عنایت فرمائے اور ہمارا مدد فرمائے

وھو حسبنا ونعم الوکیل وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم تسلیما کثیرا

ابدا الی یوم الدین، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

حضرت شیخ ؒ نے "تربیت اصطلاحی" کا مفہوم اس طرح بیان فرمایا ہے کہ "زمانۂ قدیم میں مرشد و کامل مشائخ خانقاہیں اور خلوت گاہیں مخصوص طرز پر بناتے تھے، اور مریدوں کو ان خانقاہوں میں بٹھاتے، اور ان مریدوں کے کھانے پینے کا معاملہ اپنی مصلحت و اجتہاد کے مطابق معین فرماتے، اور ہر ایک مرید کو مخصوص ذکر و شغل کی تعلیم فرماتے اور نماز باجماعت یا کسی دوسری شدید ضرورت کے علاوہ انہیں باہر نہ نکلنے دیتے اور اس وقت بھی ان کی حالت و روش پر پوری نظر رکھتے، اور ان کی نگاہوں کو ادھر ادھر

دیکھنے اور زبان کو غیر ذکر میں مشغول ہونے سے روکتے تھے اور ہر روز ایک بار یا دو بار ان کے احوال و خواطر اور ارادت و معاملات کی کیفیت دریافت فرماتے تھے اور جو کچھ بھی مصلحت و مزاج اور اصلاحِ کار کا طریقہ ہوتا مثلاً کھانے پینے یا ذکر و شغل میں کوئی ترمیم کرنا تو ویسا ہی تصرف فرماتے، بعینہٖ وہ طریقہ اختیار فرماتے جو طبیب حاذق کسی مریض کے ساتھ اختیار کرتا ہے، اور ہر ایک کو ایک معین مدت کے بعد اس خلوت سے کامل و واصل فرماتے، کسی کو ایک سال کے بعد کسی کو چھ مہینے کسی کو ایک چلہ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم —— یہ ہے مراد تربیت اصطلاحی سے، اور یہ طریقہ حضرات متقدمین کا اپنے مریدوں کے ساتھ تھا، اور تربیت کی یہ قسم اس زمانہ میں ختم ہو چکی ہے "ولم یبق الا الافادۃ بالھمۃ والحال" یعنی صرف ہمت و حال سے افادہ باقی رہ گیا ہے اس سے شیخ کی ہمت و حال مراد ہے، فرماتے ہیں کہ ہمت و حال کے ذریعہ اس طرح ارشاد و افادہ ہو کہ شیخ مرید کو ظاہر میں تو احکام شریعت کی تعلیم اور آداب طریقت کی تلقین میں مشغول رکھے اور باطن میں اپنے ہمت و حال کو جتنی بھی اس میں قوت و نفوذ ہو مرید کی درستگی میں صرف کر دے اور اپنے قول و عمل و حال سے اسکی ہدایت و تکمیل کر دے، اور طالب کی استعداد و توجہ اور استمداد و اعتقاد، نیز شیخ کی ہمت و حال اور تصرف و کمال کے تفاوت کے اعتبار سے یہ طریقہ بھی موثر ہوتا ہے، اور تاثیر صحبت و نفوذ ہمت کی وجہ سے شیخ کے احوال کی نورانیت اور صفائی مرید میں سرایت کر جاتی ہے، یہ ہے افادہ بہ ہمت و حال کا طریقہ۔

فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ اس زمانہ میں بھی موجود ہے، اور وہ حضرات مشائخ جو مریدوں کی اس طریقہ سے تربیت کرتے ہیں باقی ہیں، اور یہ بھی کم ہو چلا ہے —— فرماتے ہیں کہ اس طریقہ میں بھی مشائخ کے دو دستور ہیں، تو مرید کو شروع میں طبیعت کی پسندیدہ اور مانوس چیزوں اور سابقہ عادتوں سے باختیار دور کرتے ہیں، اس کے بعد ان کو کارِ حق اور طریقت میں استعمال کرتے ہیں، اور بعضے مریدوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی پسندیدہ چیزوں سے ان کو روکنے میں جلدی نہیں کرتے تاکہ ہمت و حال کے تعاون سے رفتہ رفتہ جس مدت میں خدا چاہے نورانیت باطن ان میں سرایت کر جائے اور خود بخود رذائل کی تاریکیوں سے علیٰحدہ ہو کر فضائل کے انوار سے منور ہو جائیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ طریق آسان و سہل اور قریب تر ہے اور ہمارے شیخ کا ہماری تربیت کے سلسلہ میں

یہی طریقہ تھا، واللہ الموفق ـــــ کلام شیخ ختم ہوا۔

اور آیا اس راہ طریقت میں کسی شیخ مرشد کی اقتدا ضروری ہے یا کتبِ مشائخ کا علم و تتبع کافی ہے اس میں بھی تفصیل واختلاف شیخ کامل و عالم، عارف و فہیم سیدی احمد عرف رزوق نے اپنی کتاب "قواعد الطریقہ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ" میں فرمایا ہے کہ متاخرین مشائخ اندلس میں مشائخ کو چھوڑ کر صرف کتابوں پر اکتفا کرنے کے سلسلہ میں اختلاف ہوا، تو انہوں نے مختلف شہروں کے علما کو سوالات بھیجے، ہر عالم نے اپنے علم کے موافق جواب دیا، اور تمام جوابوں کا حاصل تین چیزیں ہیں (۱) مشائخ کے لحاظ سے (مشائخ بھی تین قسم کے ہیں) شیخ[۱] تعلیم میں تو شیخ کی ضرورت ایسے ہوشیار و عقلمند کیلئے نہیں رہتی جو علم کے ماخذ جانتا ہو بلکہ صرف کتابیں ہی اس کے لئے کافی ہوتی ہیں، اور شیخ[۲] تربیت تو عقلمند و ناصح کے دین کیلئے ایسے شیخ کی صحبت کافی ہوتی ہے اور شیخ[۳] ترقیہ سے تو ملاقات و تبرک ہی کافی ہے حالتِ[۲] مرید کے اعتبار سے (مرید کی دو قسمیں ہیں) بلید[۱] و بیوقوف کے لئے تو تربیت کرنے کے واسطے ایک شیخ کی ضرورت ہے اور لبیب[۲] و عقلمند کے لئے اگرچہ کتابوں سے ہی ترقی حاصل ہو جائیگی لیکن اپنے نفس کی رعونت سے اگرچہ واصل ہو جائے محفوظ نہیں رہ سکتا مجاہدات[۳] کے لحاظ سے (مجاہدات کی بھی تین قسمیں ہیں) تقویٰ[۱] کے بیان کرنے اور عام ہونے کے لئے تو شیخ کی ضرورت ہی نہیں اور استقامت میں زیادہ مناسب چیز کی شناخت کرنے میں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے اگرچہ بعض اوقات عقلمند آدمی شیخ کے بغیر بھی صرف کتابوں سے اسے حاصل کر سکتا ہے اور مجاہدہ[۳] کشف و ترقیہ میں، تو شیخ کا ہونا ضروری ہے کہ فتوحات میں اس کی طرف رجوع کیا جا سکے جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نبوت سے سرفراز ہوئے تو اخبار نبوت وغیرہ بتانے کے لئے ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لے گئے، اور یہ طریقہ پہلے طریقہ کے قریب اور اس کے ہی مشابہ ہے۔ واللہ اعلم ۞

مکتوب نمبر ۲

اصول الطریقۃ لکشف الحقیقۃ

بجانب حضرت خواجہ محمّد باقی قدس سرہٗ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ـــــ شیخ شہاب الدین احمد عرف رزوق رضی اللہ عنہ نے اصول طریقت کے سائل کو جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ـــــ "اصول طریقت پانچ ہیں۔ ۱۔ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرنا ۲۔ اقوال و افعال میں سنت کا اتباع کرنا ۳۔مخلوق کی رضا مندی و ناراضی میں اس سے اعراض کرنا ۴۔قلیل و کثیر میں اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا ۵۔اور مصیبت و راحت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔ اب رجوع و استقامت سے تقویٰ میں استحکام، نگہداشت و حسن اخلاق سے سنت پر استحکام، صبر و توکل کی وجہ سے مخلوق سے اعراض کرنے میں پختگی، قناعت و تفویض کے باعث اللہ تعالیٰ سے راضی رہنے میں استحکام اور راحت میں حمد و شکر اور سختی و مصیبت میں اللہ کے سامنے گڑگڑانے کے سبب رجوع الی اللہ میں استحکام حاصل ہوتا ہے ان سب باتوں کے اصول بھی پانچ ہیں۔ بلند ہمتی۔ اللہ کے حرمات کی حفاظت حسن خدمت۔ عزم کا پورا کرنا اور نعمت کو بڑا سمجھنا۔ کیونکہ جو عالی ہمت ہوگا اس کا مرتبہ بلند ہوگا اور جو اللہ تعالیٰ کی حرمات کی حفاظت کرے گا اس کی حرمت محفوظ ہوگی اور جو اچھی خدمت کرے گا اس کی عزت ضروری ہوگی، اور جو اپنے عزم کو پورا کرے گا وہ ہمیشہ ہدایت پر رہیگا، اور جو نعمت کو بڑا سمجھے گا تو اس کا شکر ادا کرے گا اور جو نعمت کا شکر ادا کرے تو وہ اللہ کے وعدہ کے مطابق زیادہ نعمتوں کا مستحق ہوگا۔

معاملات کے بھی پانچ اصول ہیں۔ احکام پر عمل کرنے کے لئے علم حاصل کرنا۔ اپنے عیوب دیکھنے کے لئے مشائخ کی صحبت اختیار کرنا۔ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے رخصتوں اور تاویلوں کا ترک کر دینا۔ استحضار کے لئے اپنے اوقات کا وظائف میں مشغول کر دینا اور غلطی اور خواہشات نفسانی کے جال سے بچنے کے لئے اپنے نفس کو متہم سمجھنا۔ لہٰذا خوب سمجھ لو کہ) طالب علم کی آفت (اور اس کے حصول کی بڑی رکاوٹ) عمر، عقل اور دین کے کچے لوگوں کی صحبت ہے جو نہ کسی اصل میں مقید نہ کسی قاعدہ کے پابند، صحبت مشائخ کی آفت اعراض

اور فضول میں مشغول رہنا ہے، اور رخصتوں اور تاویلوں کے ترک کرنے کی آفت اپنے نفس پر (حد سے زیادہ) شفیق ہونا ہے، ضبط اوقات کی آفت فضائل میں وسیع النظر ہونا ہے اور اہتمام نفس کی آفت اس کے اچھے احوال اور اس کی استقامت سے مانوس ہوجانا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وان تعدل کل عدل لا یوخذ منھا یعنی اگر وہ پورا پورا انصاف کرے تب بھی وہ قبول نہ ہو۔ اور حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی نفس کے بارے میں فرمایا وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا مارحم ربی یعنی میں اپنے نفس کی برارت نہیں کرتا کہ نفس تو برائی کا حکم دیتا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم فرمائے۔

امراض نفس کے علاج کے بھی پانچ اصول ہیں ۱۔ کھانے سے معدہ کو ہلکا رکھنا۔ ۲۔ پیش آمدہ چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ۳۔ فتنوں کے مواقع اور ان مقامات سے بھاگنا جہاں امر متوقع کے واقع ہونے کا اندیشہ ہو ۴۔ خلوت وجلوت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور استغفار پر مداومت کرنا ۵۔ اور ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنا جو اللہ کے راستہ کی رہنمائی کرے یا اللہ کے احکام کو بتلائے۔

شیخ ابوالحسن شاذلی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے میرے حبیب نے یہ نصیحت فرمائی کہ اپنا قدم صرف اس جگہ رکھو جہاں اللہ کے ثواب کی امید ہو، اور صرف اس جگہ بیٹھو جہاں غالباً معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اور صرف ایسے شخص کی صحبت اختیار کرو جس سے طاعات وعبادات پر مدد ملتی ہو اور اپنے لئے صرف ایسے شخص کا انتخاب کرو جس سے ایمان میں اضافہ ہو، اور ایسے لوگ کم ہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو دنیا کی طرف تیری رہنمائی کرے تو اس نے تجھے دھوکہ میں مبتلا کیا، اور جو عمل کی جانب تیری رہنمائی کرے تو اس نے تجھے تعب میں مبتلا کیا، اور جو اللہ کی جانب تیری رہنمائی کرے اس نے تجھ سے خیر خواہی کی۔

آجکل کے درویشوں کو میں نے پانچ چیزوں میں مبتلا پایا ہے ۱۔ علم کے مقابلہ میں جہالت کو اختیار کرنا ۲۔ ہر (حق وباطل کے) نعرہ لگانے والے سے دھوکہ میں مبتلا ہونا ۳۔ امور میں بیجا جرأت وجسارت ۴۔ طریق سے امور کا تقرر ۵۔ بغیر وجود شرط کے فتوحات میں جلدی کرنا، چنانچہ اس کے نتیجہ میں پانچ برائیوں میں مبتلا ہوگئے ۱۔ بدعت

کو ترجیح دی اور سنت کو چھوڑ دیا ۲- باطل کی پیروی کی اور حق سے آنکھ بند کرلی ۳- ہر معاملہ میں خواہشات کا اتباع کیا ۴- باطل کو طلب کیا حقائق کو چھوڑا ۵- جھوٹے جھوٹے دعوے کرنے لگے، چنانچہ اس سے پانچ مرض ظاہر ہوئے ۱- عبادات میں وساوس ۲- عادتوں کو آزاد چھوڑ دینا ۳- سماع اور عام اوقات میں اس کے لئے اجتماعات ۴- لوگوں کو بقدر امکان اپنی طرف مائل کرنا ۵- اہل دنیا کی حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کی صحبت اختیار کرنا، یہ لوگ اولیائے کرام کے واقعات سے دھوکہ میں مبتلا ہوگئے اور اگر تحقیق کرتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ عدم پابندی ضعیف لوگوں کی رخصت ہے اور وہ بھی بغیر زیادتی کے بقدر حاجت اس پر عمل کرتے ہیں، لہذا جو صاحب قدرت ہے وہ اس طرح آزاد نہیں ہوسکتا، اور سماع مغلوب الحال یا کامل کی رخصت ہے اور یہ بساط حق میں انحطاط جب کہ شرائط کے ساتھ، اہل سے اپنے محل اور ادب میں ہو، اور وساوس کی اصل سنت سے جہالت یا دماغی خیالات ہیں، اور مخلوق کے میلان کی طرف توجہ کرنا حق تعالیٰ سے بے رخی کا ذریعہ ہے یا یہ عالم مداہن، متکبر غافل اور صوفی جاہل کی علامت ہے، اور کچے لوگوں کی صحبت تاریکی اور دنیا و دین میں عار کا سبب ہے، اور ان کے منافع کا قبول کرنا اس سے بہت ہی بڑا ہے۔

حضرت ابومدین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جو تمہارے طریقہ پر نہ ہو وہ کچا ہے اگر وہ ستر سال کا ہو، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ کچا وہ ہے جو ایک حال پر برقرار نہ رہے، اور یہ وصف اکثر تم مجالس کے طلبگاروں میں پاؤ گے، لہذا ایسے لوگوں سے کوشش کرکے بچو۔

اور جو شخص اللہ کے ساتھ اپنی کسی حالت کا مدعی ہو اور پانچ چیزوں میں سے کوئی ایک چیز اس سے ظاہر ہو تو یا تو وہ جھوٹا ہے یا دیوانہ، ۱- اپنے اعضا کو اللہ کی نافرمانیوں میں آزاد چھوڑ دے، ۲- طاعات و عبادات میں تصنع سے کام لے، ۳- مخلوق سے حرص و طمع رکھے، ۴- اہل اللہ کی غیبت کرنا، اور ایسے شخص کا اسلام پر خاتمہ کم ہوتا ہے۔

اس شیخ کے شرائط جس کے حوالہ مرید اپنے آپ کو کردے پانچ ہیں، ۱- علم صحیح ۲- ذوق صریح، ۳- ہمت عالیہ، ۴- حالت پسندیدہ ۵- بصیرت کاملہ، اور جس شخص میں پانچ خصلتیں ہوں وہ شیخ ہونے کے قابل نہیں، ۱- دین سے جاہل ہونا، ۲- حرمات اہل اسلام کی پروا نہ کرنا، ۳- بیکار باتوں اور کاموں میں گھسنا، ۴- ہر معاملہ میں

خواہشات کا اتباع کرنا ۵۔بے پرواہی کے سبب بد اخلاق ہونا۔

مرید کے اپنے شیخ اور پیر بھائیوں کے ساتھ پانچ آداب ہیں، ۱۔حکم کی اتباع کرنا اگرچہ اس کے خلاف ظاہر ہو، ۲۔نہی سے بچنا اگرچہ اس میں موت نظر آئے ۳۔اس کی عزت وحرمت کی حفاظت کرنا سامنے، پیچھے، زندگی اور موت میں، ۴۔اس کے حقوق کو بقدر امکان بغیر کوتاہی کے پورا کرنا ۵۔اپنی عقل و ریاست کو دور کردینا ہاں جتنی مقدار شیخ کے موافق ہو اس میں حرج نہیں۔اگر شیخ مرشد نہ ہو تو یہی معاملہ اپنے پیر بھائیوں کے ساتھ کرے، اور اگر مذکورہ پانچ شرطوں میں کمی پائی جائے تو جن میں اسے کمال حاصل ہے اس میں تو اعتماد کرے اور باقی میں اخوت کا معاملہ کرے بحمداللہ اصول مذکورہ پورے ہوگئے۔

اے سالک تجھے چاہیئے کہ ان اصول کا مطالعہ ہر روز ایک دو مرتبہ کرلیا کر ورنہ ہفتہ میں ایک مرتبہ تو ضرور ہی کیا کرنا کہ ان کے معانی تیرے ذہن میں راسخ ہوجائیں اور ان کے تقاضہ کے مطابق تو ان پر عمل کرسکے، کیونکہ یہ اصول بہت سی کتابوں اور نصیحتوں سے بے نیاز کردیں گے، مشہور مقولہ ہے کہ "منزل تک پہنچنے سے محرومی کا سبب اصول پر عمل نہ کرنا ہے۔" جو ان میں غور کرے گا اسے یہ حقیقت معلوم ہوجائیگی پھر ان سے تذکر حاصل کرنے کے لئے ان کی پابندی کرتا رہے گا، وفقنا اللہ تعالیٰ و ایاک لمرضاتہ، انہ ولی ذلک والقادر علیہ وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

نیز آپ نے اپنے طریقہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے طریق کا دار و مدار پانچ چیزوں پر ہے تقویٰ پر ثابت قدمی اسے غیر مفید باتوں سے محفوظ رکھے گی، اور وہ صرف اللہ کی اطاعت کریگا، اور اتباع سنت میں پختگی اس طرح کہ اصح سنت یا جو اس کے قریب ہیں اسے اختیار کرے، اور اپنی توجہ مخلوق سے اسطرح اٹھالینا کہ انکے معاملہ میں اگر توجہ کرنا پڑے تو معمول یہ ہو کہ نہ تو محسن کی تعریف محسن ہونیکی حیثیت سے اور نہ غیر محسن کی مذمت غیر محسن ہونیکی حیثیت سے کرے، بلکہ اگر اسکی ضرورت پیش آئے تو اللہ کے حکم کی حیثیت سے ہو، اور مخلوق کو ان کے معاملات میں چھوڑ دینا ان کے شر سے بچنے اور ان کے ساتھ سلامتی وعافیت کے ساتھ رہنے کے واسطے، اور تقدیر کے سامنے صبر، رضا اور شکر کے ساتھ جھکنا، اور شیخ ابوالحسن شاذلی ؒ کے قول پر عمل کرنا کہ "تم تقویٰ کو اپنا وطن بنالو، اس کے بعد اگر نفس گلچھرے بھی اڑائے تو تمہیں ضرر نہ پہنچے گا، جب تک کہ

وہ کسی گناہ پر اصرار نہ کرے یا تم سے خوف وخشیت کو دور نہ کرے، اس قول میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ "جہاں بھی تم رہو اللہ سے ڈرتے رہو، اور ہر برائی کے بعد نیکی کر لیا کرو کہ یہ نیکی اس برائی کو مٹا دے گی اور لوگوں سے حسن اخلاق کا معاملہ کرو۔" اور اس قول میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو ترجیح دی گئی ہے کہ "جب تم بخل وحرص کو پیشوا، خواہشات کو امام اور ہر شخص کو اپنی رائے پر بھولا ہوا دیکھو تو تم صرف اپنی فکر کرو۔" اور امرا و حکام کی ظاہر میں اطاعت اور ان پر اعتراض نہ کرنے کو جس حالت میں بھی وہ ہوں تم اپنا شیوہ بنا لو، اللہ تعالیٰ ان سے خود حساب لے لیگا، اور چاشت کی نماز پڑھو، اور بغیر روزہ بھی رہا کرو اور حالت سفر میں قصر کرو۔ اور صلوٰۃ تسبیح پڑھا کرو، اور اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں تجرید یا اسباب عطا فرما رکھے ہیں ان کو ترجیح دو اور اپنے اختیار کو اس معاملہ میں کام میں نہ لاؤ اور ہر اس مباح پر عمل بھی کر لیا کرو جس سے نہ تو مروت میں کمی آتی ہے اور نہ دین میں نقصان پیدا ہوتا ہے، اور زندہ لوگوں کی ملاقات اور قبرستان کی آمد و رفت اس وقت تک رکھو جب تک کسی واجب میں یا مندوب مؤکد میں خلل نہ پڑتا ہو۔ اور ہر مومن کو باعث برکت سمجھو لیکن جو خلاف سنت کام کرتا ہو، اور ہر اس شخص کی جس کا عمل اور تقویٰ درست معلوم ہو اقتدا نہ کرو اور ہر بھلائی کی بنیاد اللہ سے اسکی دی ہوئی نعمتوں میں راضی ہو جانا اور ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے یہی ہر حاجت کی کلید ہے، اور مخلوق کے شر سے بھاگنا مضبوط قلعہ سے بھی بڑھ کر ہے، جن اصول پر طریقت کا دار و مدار تھا وہ پورے ہو گئے، اور ان میں غور و فکر کرنے سے انشاء اللہ حقیقت واضح ہو جائے گی، وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وسائر الانبیاء وسلم۔

رسالہ اصول الطریقہ سے یہ چند باتیں نقل کر دی ہیں، اگر توفیق خداوندی رفیق حال ہو اور اس راہ پر لے چلے، اور مذکورہ بالا چیزوں پر عمل کی توفیق ہو جائے تو بلاشبہ جوہر ایمان، نور معرفت، صفائی قلب اور کمال حال حاصل ہو جائے۔

شیخ ابو العباس حضرمیؒ نے فرمایا کہ "تم ہمیشہ ذکر اللہ میں مشغول رہو، اور بکثرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا کرو کیونکہ یہ درود ہی اللہ تک پہنچنے کا زینہ ہے جب کہ کسی مرید کو شیخ مرشد ہاتھ نہ آئے۔"

حضرت شیخ علی متقی رح نے شیخ احمد بن الصوفی رح کا ایک مقولہ نقل فرمایا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جس کی تربیت و ترقی اور منزل تک پہنچانے کے لئے شیخ مرشد نہ ہو تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کو لازم کرلے کیونکہ یہ درود شریف اس کی آداب نبویہ کے ساتھ تربیت کرے گا، اور اس کو اخلاق محمدیہ میں مہذب کرے گا، اور اس کو کمال کی چوٹی تک پہنچادے گا اور اس کو اللہ کے نزدیک بلند مرتبہ تک لے جائے گا۔ اور اس پر قرب و دیدار نبی ص کا انعام کرے گا"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب رض کو قل ھو اللہ احد پڑھنے اور بکثرت درود بھیجنے کا حکم فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ قل ھو اللہ احد پڑھنے سے اللہ کے ایک اور یکتا ہونے کو پہچان لیا، اور کثرت درود سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوگی، اور کہتے تھے کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بکثرت درود بھیجے وہ خواب اور بیداری میں آپ کے دیدار سے مشرف ہوگا۔

یہاں ایک رسالہ ہے جس کا نام "الفقر المحمدی" ہے اس میں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ توسل و توجہ، اور آپ کے ماسوا سے قطع تعلق ہو، اور فرمایا کہ سرچشمہ سے پانی لینے میں ہی زیادہ پاکیزگی اور صفائی ہوتی ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ حضرات مشائخ رح کے ذریعہ بھی توسل نہ کرنا چاہیئے جس طرح کہ معروف ہے نہ توجہ کرنا چاہیئے اور نہ ارادہ، کیونکہ تمام کائنات کے سردار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں لہذا تمام آپ ہی کے مرید ہوئے (لہذا سردار کے ذریعہ ہی توسل رہ گیا) اگرچہ اس کتاب کی بعض عبارتوں سے بھی ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ معاملہ ایسا نہیں، بلکہ دونوں طریقے کرنا چاہئیں، مشائخ رح کے ذریعہ بھی توسل کرنا چاہیئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھی، دونوں میں کوئی منافات نہیں۔ جب وہ رسالہ زیر نظر آئے گا تو حقیقت حال واضح ہوجائے گی واللہ اعلم۔

دوسرا فائدہ بزرگوں کی کتابوں کے مطالعہ سے متعلق ہے، ان بزرگوں کی تصنیفات میں امتیاز و تفصیل کے بغیر وسعت نظر سے بچنا بہت ضروری ہے واللہ یقول الحق وھو یہدی السبیل یعنی اللہ تعالی سچی بات کہتا ہے، اور سیدھے راستہ کی طرف

ہدایت فرماتا ہے۔

"قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ" میں فرمایا ہے کہ ناصحین نے ابن الجوزی کی کتاب "تلبیس ابلیس" اور حاتمی کی کتاب "فتوحات" بلکہ ان دونوں کی تمام کتب یا اکثر کتب کے دیکھنے سے سختی سے روکا ہے، اسی طرح ابن سبعین اور ابن الفارض اور جو ان کے ڈھنگ پر ہیں ان کی بھی کتابوں سے روکا ہے، علی ہذا امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" کے بعض مواضع جن میں اکثر "باب المہلکات" میں ہیں، علیٰ ہذا امام غزالی کی "نفخ والتسویہ" اور مضنون من غیر اہلہ اور "معراج السالکین" اور "المنقذ" سے، ابو طالب مکی کی "قوت القلوب" اور کتاب سہروردی وغیرہ بھی اسی فہرست میں ہیں، لہذا غلط مواقع سے بچنا چاہیئے یہ مطلب نہیں کہ تمام کو ترک کر دے اور یہ بات تین چیزوں سے حاصل ہوسکتی ہے ١۔ ذکاوت صادقہ ٢۔ فطرت سلیمہ ٣۔ ظاہر کو اختیار کر کے ماسوا کو چھوڑ دینا۔ ورنہ مطالعہ کرنے والے یا تو حضرات مصنفین پر اعتراض کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے یا صحیح بات اختیار نہ کرنے کی وجہ سے،

حضرت شیخ نے کتاب "فصوص وفتوحات" وغیرہ کے بارے میں فرمایا کہ ان کی واضح چیزوں سے لطف اندوز ہو اور مخفی وموہم چیزوں میں غور نہ کرے، فرماتے ہیں کہ یہ شکر چڑھا ہوا زہر ہے، اگر کوئی ان کے زہر سے بچ سکتا ہے تو ان کا مطالعہ باعث برکت ہے ورنہ خطرہ سے خالی نہیں، فرماتے ہیں کہ پہلے دل کو اہل سنت والجماعت کے طریقہ پر پختگی کے ساتھ جمادے کہ اس میں ذرا بھی تردد و تذبذب باقی نہ رہے، اس کے بعد اگر ان بزرگوں کی کتابوں سے مستفید ہو تو سلامتی کے قریب رہے گا، ورنہ وہ شخص جس کے دل میں ابھی کھدر بھدر ہے اور اعتقاد شریعت بھی ابھی کچا ہے اکثر شروع ہی سے ان بزرگوں کی مبہم وموہم اور مشکل باتوں میں غور و خوض کرنے لگے گا تو بڑی آفت میں مبتلا ہو جائے گا، اللہ تعالٰی محفوظ رکھے۔

اتفاقاً یہ چند باتیں نقل کر دی ہیں، ورنہ جب بھی آنجناب کو خط لکھنا چاہا اور اس قسم کی باتیں جو نظر سے گزریں ان کو نقل کرنا چاہا تو شرم وحجاب مانع ہوگیا، اور اپنی نالائقی و نااہلیت سامنے آگئی حتیٰ کہ اس مرتبہ قلم تقدیر سابق غور وفکر کے

بغیر چلنے لگا اور چند باتیں ظاہر ہوگئیں، معذور سمجھیں، اور تھوڑا وقت توجہ و حضور حق سے جو تمام طریق کا حاصل ہے فرصت ملے اور ان کلمات کے مطالعہ سے نور و حضور پیدا ہو تو راقم حروف کو بھی دعائے خیر سے محروم نہ فرمائیں دعا یہی ہے کہ اے خدا ہمیں حق کو حق سمجھنے اور اس کا اتباع کرنے کی توفیق اور باطل کو باطل سمجھنے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما، اور سب کا ماحصل یہ ہے کہ اے خدا ایمان پر خاتمہ ہو اور صلحا کی معیت حاصل ہو، عاقبت بخیر ہو۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمدؐ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

مکتوب نمبر ۳

تبیین الطریق لاھل الارادۃ بالتزام وظائف الخیر والعبادۃ

بنام حضرت خواجہ محمد باقی رحمۃ اللہ علیہ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ شیخ اجل، عارف باللہ حضرت علی متقیؒ اپنے رسالہ "تبیین الطریق" میں فرماتے ہیں کہ "اللہ تک پہنچانے کا راستہ عبادت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہے ان اللہ ربی وربکم فاعبدوہ. ھذا صراط مستقیم یعنی اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے لہذا اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

عبادت کی دو قسمیں ہیں ۱۔ فرض اور ۲۔ نفل، اور ان میں سے ہر ایک امتثالی بھی ہے اور اجتنابی بھی، امتثالی سے مراد یہ ہے کہ اس سے کسی فعل کا کرنا مطلوب ہو اور اجتنابی کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے مقصود ترک فعل ہو، اور قرب و نجات فرائض پر عمل کرنے کے ساتھ وابستہ ہے، اور نوافل پر عمل کرنا باعث تکمیل ہے، نوافل کے افراد بہت اور حد شمار سے متجاوز ہیں، لیکن انہیں دو قسموں یعنی امتثالی واجتنابی میں منحصر ہیں، امتثالی جیسے سنن مستحبات اور آداب کہ ان کا کرنا افضل ہو اور اجتنابی جیسے ترک مکروہات، ترک خلاف اولیٰ اور جس میں کوئی حرج نہ ہو اس کا اس لئے ترک تاکہ حرج والی چیزوں میں واقع ہونے سے حفاظت ہو جائے، جیسے کوئی مجرد جوان شکم سیری اور خوشبو کے استعمال کو اس لئے ترک کر دے کہ اسے غلبۂ شہوت اور حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے اور فرماتے ہیں کہ شیخ نجم الدین کبریٰؒ کے اس قول کہ "اللہ تک جانے والے راستے مخلوق کے سانسوں کی تعداد کے برابر ہیں" اور حدیث قدسی میں ارشاد خداوندی کہ "میں ہی وہ خدا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں ارحم الراحمین ہوں، میں نے تین سو دس سے کچھ اوپر

خصلتیں پیدا کی ہیں، تو جو شخص کلمۂ توحید کے ساتھ ان میں سے کسی ایک کو بھی کر لے تو میں اسے جنت میں داخل کروں گا۔" ان دونوں میں افراد نوافل امتثالی کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، جیسے ذکر لا الہ الا اللہ، نماز نفل، تلاوت قرآن کریم، استغفار، تسبیح، دعا، درود، روزۂ نفل، طواف نفل، صدقہ نفل، حج نفل، عیادت مریض، جنازہ کے ساتھ جانا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان مواضع میں جہاں یہ واجب نہ ہو، علوم دینیہ کا درس، اعانت مسلم کے مختلف اقسام کہ ان میں سب سے کم مسلمانوں کے راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے اور اس کے علاوہ لاتعداد نوافل۔

لہٰذا جو شخص ادائے فرائض کے بعد اپنے تمام اوقات یا اکثر اوقات کو ان افراد نوافل میں سے کسی ایک کے ساتھ اقسام اجتنابی کی رعایت کرتے ہوئے مشغول رکھے گا تو انشاء اللہ قرب خداوندی جو اس کا مقصود ہے حاصل ہو جائے گا، کیونکہ قرب خداوندی کے حصول کیلئے نوافل امتثالیہ کی تمام اقسام پر عمل کرنا نہ شرط ہے نہ ممکن، بلکہ صرف ایک فرد پر ہی مداومت کرنے سے کفایت ہو جائیگی۔ البتہ تمام حرام چیزوں اور مکروہات سے اجتناب کرنا شرط ہے اور یہ اجتناب ممکن بھی ہے، لہٰذا اگر یہ مان لیا جائے کہ "اللہ تک جانے والے راستے بہت ہیں یا اللہ تک جانیوالا راستہ صرف ایک ہے" تو یہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں نیز مشہور ہے کہ "ابناء السبیل اخیاف لیس بینھم خلاف" یعنی تمام سالک ایک ماں کی اولاد ہیں جن کے باپ متعدد و مختلف ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اوراد و معمولات کی تعیین اور نوافل و اذکار کے اختیار کرنے میں مشائخ کے مختلف طریقے ہیں لیکن سب کا مرجع اور اصل ایک ہی ہے وہ ہے عبادت، شریعت، تقویٰ اور اتباع کتاب و سنت۔ اور حضرات مشائخ ؒ نے تمام افراد نوافل میں کلمۂ لا الہ الا اللہ کو خصوصیت سے اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس کلمہ سے کثرت حضوری اور دیگر منافع اس طرح حاصل ہوتے ہیں کہ دوسرے کسی فرد سے نہیں ہو سکتے، باوجودیکہ نماز نفل ذکر سے افضل ہے، کیونکہ ذکر بھی نماز کا ایک جزو ہے، بسا اوقات اپنے مسلمان بھائی کی اعانت کہ فعل متعدی ہے، نماز نفل سے افضل ہو جاتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ قسم اجتنابی میں کمال و اہمیت زیادہ ہے، اس میں کمال تو اس طرح ہے کہ جو شخص قسم اجتنابی میں اپنے تمام اوقات کو مشغول کر لے اور صرف ادائے فرائض

پر اکتفا کرے اور نوافل کی قسم امتثالی کو ہاتھ نہ لگائے اور نہ اس میں کوشش کرے تو اس کو قرب خداوندی جو مقصود ہے حاصل ہو جائے گا، اگرچہ مدت دراز کے بعد ہو، جیسے کوئی بیمار کہ مضر چیزوں سے پرہیز کرتا ہے تو اگرچہ وہ معجون و شربت استعمال نہ کرے پھر بھی اس کی صحت کی امید ہے اگرچہ بدیر ہو، اور جو شخص قسم امتثالی میں کوشش کرتا ہے لیکن مکروہات و ممنوعات کا بھی مرتکب ہے وہ ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا، جیسے کوئی بیمار کہ دوائیں تو استعمال کرتا ہے لیکن پرہیز نہیں کرتا۔ اگر دونوں کام کرے تو لامحالہ بتمام وکمال مقصود کے قریب ہو جائے، اور قسم اجتنابی میں اہمیت اس طرح ہے کہ تمام عقلا کے نزدیک دفع ضرر حصول منفعت سے زیادہ اہم ہے، اسی طرح مکروہات سے بچنا نوافل پر عمل کرنے کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہوگا، مثلاً وہ شخص کہ اس کے کپڑے پر بمقدار کراہتِ نماز نجاست لگ جائے تو اس کو تھوڑا سا وقت اس نجاست کو دور کرنے میں خرچ کرنا اس وقت نوافل میں مشغول ہونیکے مقابلہ میں زیادہ اہم ہوگا۔

لہذا جب سالک اس راہ پر چلنا شروع کرے گا تو اپنے مقصود یعنی قرب الٰہی اور وصول الی اللہ تک پہنچ جائے گا، اور ”قرب الٰہی“ سے یہ مراد ہے کہ سالک غیر اللہ سے بعید ہو جائے، اور ”وصول“ سے مراد یہ ہے کہ غیر اللہ سے انقطاع ہو جائے، اور ”غیر“ سے مراد ممنوعات و مباحات ہیں اور ممنوعات میں تمام منہیات و مکروہات، اور مباحات میں مخلوق میں بطریق تعلق یا تعلیم مشغولیت داخل ہیں، جیسے آسمان، زمین، پہاڑ، درخت اور اسباب معاش وغیرہ، لہذا اگر کوئی سالک ممنوعات سے اجتناب کرتے ہوئے مباحات کی طرف بھی متوجہ ہے تو اس کا قرب ناقص، اور اگر مباحات سے بھی قطع نظر کرلی تو اس کا قرب کامل ہے، پس جس قدر سالک کو غیر اللہ سے بُعد ہوگا اسی قدر جناب باری عز اسمہ، سے قرب میسر ہوگا، ”غیر“ کو ہم دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وصولِ حق سے جو حجابات روکنے والے ہیں ان میں اصلی چار ہیں، دنیا، مخلوق، شیطان (چوتھا غالباً نفس ہوگا، جو اصل کتاب میں سہواً رہ گیا ہے) اور ان حجابات کو دور کرنے کے طریقے منہاج العابدین وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں، اور یہ ثابت ہو ہی چکا ہے

کہ وصول الی اللہ کا طریق ادائے فرائض کے بعد نوافل وعبادات کی کثرت ہے، وہ نوافل باعتبار نوع ہوں یا فرد، اور بعض نوافل قلیل الوقوع ہیں اور بعض کثیر الوقوع، قلیل الوقوع نوافل از جنس عبادات جیسے حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ، اور از جنس عادات جیسے کھانا، پینا، سونا اور لباس وغیرہ، لہٰذا طالب کو ان دونوں قسموں کے نوافل کا حاصل کرنا اور اپنے اوقات کو انہیں میں مشغول رکھنا ضروری ہے' اختصار کے طریقہ پر کتاب عین العلم اور احیاء العلوم کی مختصرات کافی ہیں، اور اگر ان کا احاطہ مقصود ہے تو احیاء العلوم اور فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

فرماتے ہیں کہ ہم نے قرب کی پہچان اور اس کے حاصل کرنے کے طریق کا جو ضابطہ بیان کر دیا ہے طالب کے لئے کافی ہے۔ رہ گئی مرشد و استاد کی ضرورت تو آسانی طریق اور منزل پر جلدی پہنچنے کے لئے ہے، ورنہ اگر توفیق الٰہی مدد فرمائے تو بغیر مرشد کے بھی اس راہ پر چلنا ممکن ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں تو ہم انہیں راستہ پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن اس طرح منزل پر پہنچنا بڑی سختیوں اور مدت طویل کے بعد ہوگا، واللہ اعلم

حضرت شیخؒ نے اس رسالہ کی پشت پر یہ عبارت بھی تحریر فرمائی ہے۔

فائدہ:۔ اس رسالہ کا منشا حقیقت قرب اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کر لینا ہے، لہٰذا جسے یہ علم حاصل ہوگیا وہ کسی دوسری چیز کا محتاج نہ ہوگا، مشہور مقولہ ہے کہ جس شخص کو معلوم ہو گیا کہ فلاں چیز اس وقت ضروری ہے اور اس کا حاصل کرنا بھی ضروری تو وہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے میں پریشان نہ ہوگا، اور جسے یہ معلوم نہ ہو تو وہ تمام چیزوں کے حاصل کرنے میں وقت ضائع کریگا (اور کچھ بھی حاصل نہ ہوگا)، اسی کے ہم معنی ایک اور مقولہ بھی ہے جسے اپنے نفع ونقصان میں امتیاز نہ ہو وہ ہمیشہ اپنے معاملہ میں متحیر رہے گا، اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ تو اپنے معاملہ میں اس لئے متحیر ہے کہ تجھے اپنے نفع ونقصان کا پتہ نہیں' اسی کو فارسی میں اس طرح کہا گیا ہے کہ ؎ زیان وسود خود نمیدانی ✣ ازاں جہت چنیں پریشانی

مکتوب نمبر ۴

بنام حضرت خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ

تنبیہ اھل النہیٰ ——— بتفاوت حال الابتداء والانتہاء

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ـــــ اپنے زمانہ کے شیخ المشائخ حضرت شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "عوارف المعارف" باب بدایات ونہایات میں فرمایا ہے کہ مبتدی کو ایسے درویشوں کے قریب نہ جانا چاہیئے جو تہجد کی نماز اور روزہ سے گریز کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے پاس بیٹھنا دنیا داروں کے پاس بیٹھنے سے بدتر اور ان کا ضرر دنیا داروں کے ضرر سے بہت زیادہ ہے. اور بسا اوقات یوں کہتے ہیں کہ عمل کرنا تو عبادت گزاروں کا شغل ہے، صاحب حال کا مقام اس سے بلند ہے، اور کہتے ہیں کہ صرف فرض نماز اور فرض روزہ کافی ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

شیخ فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں مبتدی کے کان میں نہ پڑنا چاہئیں، ما نا کہ ہم نے ان تمام امور کا تجربہ کرلیا اور فقرا و صالحین کی صحبت میں رہے اور ہمیں معلوم ہوگیا کہ جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں اور نوافل وعبادات کی زیادتی کے قائل نہیں ہیں اگرچہ صاحب احوال صحیحہ ہیں پھر بھی ان میں قصور ونقصان ہے' بندہ کو ہر فرض اور نفل پر پابندی سے عمل کرنا چاہیئے تاکہ ابتدا ہی میں ثابت قدم ہوجائے، اور مبتدی کو تلاوت قرآن کریم اور اس کو حفظ بھی کرتے رہنا چاہیئے اور جو شخص ذکر واحد کو تلاوت کے مقابلہ میں افضل کہے اس کی بات پر کان نہ دھرے کیونکہ قرآن کریم اور نماز وغیر نماز میں اس کی تلاوت کی برکت سے اس راہ میں جو بھی آرزو ہوگی وہ پوری ہوجائے گی۔ اور بعض مشائخ اپنے مریدوں کو ذکر واحد کا حکم جمعیت خاطر کی وجہ سے فرماتے، اور جو شخص خلوت میں

تلاوت اور ذکر واحد پر بھی عمل کرتا رہے تو اس کو تلاوت و نماز سے اتنا زیادہ فائدہ ہوگا جو ذکر واحد سے نہیں ہو سکتا، البتہ اگر تلاوت و نماز سے جی اکتانے لگے تو اس وقت نفس کے ساتھ ملاطفت کا معاملہ کر کے تلاوت سے ذکر کی طرف اتر آئے، کہ یہ ذکر نفس پر آسان اور ہلکا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ منتہی بھی کمال حال کے باوجود اپنے نفس کو سیدھا کرنے اور شہوات سے روکنے نیز کثرت صوم وصلوٰۃ اور مختلف قسم کی نیکیوں اور فضیلتوں کے حاصل کرنے سے بے نیاز نہیں ہو جاتا، وہ لوگ جنہوں نے یہ سمجھا کہ منتہی کثرت نوافل سے بے نیاز ہے کہ اگر وہ تہجد وغیرہ ترک کر دے تو کوئی مضائقہ نہیں یقیناً سخت غلطی کی ہے نہ اس وجہ سے کہ کثرت نوافل کا ترک کر دینا عارف کو معرفت سے محجوب کر دیتا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے مقامات کی ترقی رک جاتی ہے، ہاں منتہی کے قبضہ و اختیار میں اخذ و ترک ہوتا ہے کہ کبھی نرمی و ملاطفت سے نفس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور کبھی سیاست و تادیب کی غرض سے اس سے رخ پھیر لیتا ہے۔ واللہ اعلم

تنبیہ :۔ حضرت شیخ کا اس کلام سے مقصود اہل بطالت کی تردید اور سد ذرائع ہے یعنی ان لوگوں کی تردید جو اسقاط عمل کے قائل ہیں اور سیاست نفس و طریقۂ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں، اور احوال پر اکتفا کر کے اعمال کو چھوڑ بیٹھے ہیں تاکہ گمراہی سبب نہ بنے، ایسی ترغیب اور اس جیسے کلام کا کرنا مشائخ کے شایان شان ہے، لیکن اس کلام کے سیاق سے ظاہراً یہ مفہوم ہو رہا ہے کہ گویا یہ طریق اسی میں منحصر ہے، حالانکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ شیخ سہروردی ؒ نے یہ اپنا طریقہ بیان فرمایا ہے ورنہ جامع بات وہ ہے جو اس سے پہلے مکتوب میں تحریر ہوئی کہ سلوک و وصول اور اختیار اذکار و نوافل میں مشائخ کے مختلف طریقے ہیں جب کہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ عبادت میں کوشش اور اقامتِ سنت کے علاوہ کوئی طریق نہیں، لیکن عبادت کے اقسام و افراد بہت ہیں اور نوافل کے افراد بھی غیر محدود ہیں، جیسا کہ پہلے گزر گیا، اور مبتدی کو ذکر واحد سری یا جہری پر لگا دینا اور نماز و روزہ میں صرف ادائے فرض و سنت پر اکتفا کرانا،

اور تخلیۂ باطن کا اہتمام کرانا اور کلمۂ ذکر کے تکرار سے نقش توحید دل میں بٹھا دینا مشائخ میں ایک امر معروف و مقرر ہے، حتیٰ کہ مشہور ہے کہ مبتدی کی حالت کے مناسب ذکر ہے اور متوسط کی حالت کے مناسب تلاوت قرآن اور منتہی کی حالت کے مناسب نماز ہے، اور اگر کوئی مبتدی ہمیشہ ذکر میں مشغول، حقیقت ورع و تقویٰ حاصل کرنے میں کوشاں اور جناب حق کی طرف متوجہ و ملتجی رہے تو نماز و روزہ کے واجبات و سنن پر اکتفا کرنے کے باوجود یقینی طور پر منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اور سلسلۂ نقشبندیہ جو ایک معروف و مقرر طریقہ ہے اور اہل انصاف کے نزدیک حصول قرب و وصول و فنا میں اس سے زیادہ بہتر اور اقرب طریقہ کوئی نہیں اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ نماز، روزہ مختلف قسم کے اعمال و عبادات ظاہرہ اور اوراد کے بغیر صرف ذکر خفی پر مداومت اور قلب کو نقش اغیار سے پاک و صاف کر لیا جائے۔

اور منتہی کے باب میں شیخ نے جو یہ فرمایا ہے کہ اعمال و اوراد میں کوتاہی یا سستی ترقی و زیادت کے لئے مانع ہے تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ منتہی کی مقامات قرب میں زیادتی و ترقی کثرت نوافل و اوراد میں منحصر نہیں ہے کیونکہ فانی کی سیر سیر الی اللہ اور حصول مرتبۂ فنا کے بعد سیر فی اللہ ہے اور اسکی ترقی مقامات قرب اور تجلیات الٰہی میں ہے، اور ان تجلیات و مقامات قرب کی ترقی کا اقامتِ اعمالِ ظاہرہ میں منحصر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، دوام حضور و حفظ آداب قرب کے ساتھ اس میں توجہات و مراقبات قلبی بھی اس کا سبب ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا جوہر روح نور الٰہی سے منور اور اس کا لطیفۂ سر ذات حق سے واصل ہو گیا، اور وہ خود سے فانی اور حق کے ساتھ باقی ہو کر سیر فی اللہ میں دائم الترقی ہے، اگرچہ اس کو کثرت صوم و صلوٰۃ، تلاوت و قیام اور وہ اقسام عبادات تمام و کمال حاصل نہیں، قل کل یعمل علی شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلا یعنی آپ کہہ دیجئے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہے سو تمہارا پروردگار ان لوگوں کو جو راہ ہدایت پر ہیں خوب جانتا ہے، خلاصہ یہ کہ اعمال و افعال پر ترقی درجات قرب کا موقوف کر دینا محل کلام ہے، ہاں ایسا شخص ہمیشہ اعمال

خیر کا کرنے والا، ظاہر و باطن کے آداب کی رعایت کرنے والا اور صاحب نفس مطمئنہ ہے۔

عالم عارف ابوعبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی "نوادر الاصول" میں فرماتے ہیں کہ بعض کے دلوں میں نورانیت توجہ و توحید کے نور سے پیدا ہوتی ہے جو لاالہ الااللہ کی تصدیق ہے، اور یہی امتثال امر و نہی خداوندی پر آمادہ بھی کرتی ہے، اگرچہ بعض ظلمانی صفات جیسے حب دنیا وغیرہ دل میں باقی بھی ہوں، اور بعض کے دلوں میں نورانیت انابت الی اللہ اور ارادت کے نور سے پیدا ہوتی ہے جو تزکیۂ نفس اور صفائی باطن کا سبب ہے، اور ایسے شخص کے عمل کے آثار تائب کے عمل کے مقابلہ میں چند بر چند ہوتے ہیں، اور بعض کی نورانیت ذات حق کے نور کے سبب پیدا ہوتی ہے کہ ماسوائے مطلق سے فنا اور حدیثِ حق کے بقا کا باعث ہے، اور ایسے شخص کے ایک عمل کو بلکہ اس کے دل پر جو خیال گزرے اس کو بھی ثقلین کے اہل توبہ و انابت کا عمل نہیں پہنچ سکتا۔ یہ امام حکیم کے کلام کا خلاصہ ہے۔

عوارف میں بھی" باب اتخاذ الخلوۃ " میں فرمایا ہے کہ طالب صادق کو یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ خلوت سے مقصود تقرب الی اللہ ہے کہ اپنے تمام اوقات کو آباد کرے اور اپنے اعضا کو مکروہات سے روکے، پس بعض ارباب خلوت کے لئے مختلف اور اور پر مداومت مناسب ہوتی ہے، بعض کو ذکر واحد پر مواظبت، بعض کو دوام مراقبہ، بعض کو ذکر سے ورد کی طرف منتقل ہونا اور بعض کو ورد سے ذکر کی طرف، شیخؒ کا یہ کلام متعدد طرق کی رعایت میں جامع ہے، یہیں سے ظاہر ہو گیا کہ ابتدا و انتہا میں مقصود یہ ہے کہ بطالت و راحت کو ترک کرنا اور عمل کی ترغیب دینا، واللہ اعلم

مکتوب نمبر ۵

بنام خواجہ محمد باقی رحمۃ اللہ علیہ

تحصیل الکمال الابدی ـــ باختیار الفقر المحمدی

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ، اے اللہ ہمیں طریق سنت پر عمل و اتباع کی توفیق عطا فرما اور کجی، لغزش اور بدعت سے محفوظ فرما۔

ان بعض خطوط میں جو آں ہدایت پناہ کی خدمت میں ارسال کئے تھے "رسالہ فقر محمدی" کا ذکر آگیا تھا اور آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ "فقر محمدی" کیسا رسالہ ہے، اس کے مصنف کون ہیں، اس لفظ کے کیا معنی ہیں اور اس رسالہ میں کیا مضمون ہے؟

یہ رسالہ شیخ کامل عارف باللہ عالم باعمل احمد بن ابراہیم واسطی حضرمی کی تصنیف ہے، شیخ موصوف دیار عرب کے بڑے مشائخ اور تمام زمانہ کے بڑے اماموں میں سے ہیں، آپ اپنے زمانہ میں طریق اتباع سنت کی ترویج و تقویم میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، اور "فقر محمدی" سے مراد ارادت و درویشی محمدی ہے، اور اس رسالہ کا مضمون یہ ہے کہ توسل و توجہ اور استمداد و ارادت صرف بارگاہ نبوت سے ہونا چاہیئے۔ اور طریقہ سنت اور صحابہ و تابعین و سلف صالح کی سیرت کا التزام اور نئے نئے بدعت کے طریقوں سے بچنا چاہیئے۔

اب میں اس رسالہ کا مختصر ترجمہ بغیر کسی زیادتی کے کرتا ہوں تاکہ مقصود واضح ہو جائے، و باللہ التوفیق۔

فرماتے ہیں کہ بعض احباب نے مجھ سے فرمایا کہ میں ان کے لئے "فقر محمدی" کے طریق میں مختصر قواعد تحریر کروں، باوجودیکہ مجھے اپنی کم مائگی کا اعتراف ہے پھر بھی بقدر طاقت ان کے اس فرمان کو پورا کرنا میں نے مناسب سمجھا، اور اللہ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں۔

برادر عزیز! اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں توفیق عطا فرمائے اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم حقیقی اور صحیح فقر اختیار کرنا چاہتے ہو کہ اس کی جڑ مضبوط اور اس کی شاخیں بلند ہوں تو فقر محمدی کو اختیار کر کے اس کا اتباع کرو، کیونکہ سرچشمہ سے پانی حاصل کرنا زیادہ پاکیزہ اور صاف ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو نچلوں کی درویشی و فقر سے دور رکھو کہ سرچشمہ سے دور پانی کا رنگ دگرگوں ہو جاتا اور راہ راست سے ہٹ جاتا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ تم یہ رمز سمجھ گئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور اس رمز کی تشریح تمہارے روبرو بھی کر چکا ہوں۔ لہٰذا اگر تم فقر محمدی کے طریقہ پر گامزن رہے تو مجھے امید ہے کہ تم رہروان سابقین جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں ان کے ہمراہ ہو جاؤ گے، اور حشر کے دن آپؐ کے اور آپ کے اصحاب کے ساتھ آپ کے جھنڈے کے نیچے اٹھائے جاؤ گے، جب دوسرے درویش اپنے اپنے مشائخ کے جھنڈے کے نیچے اٹھائے جائیں گے تو تم اپنے پیغمبر کے جھنڈے کے نیچے اٹھائے جاؤ گے، اور تمہارے شیخ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، لہٰذا اسی طریق کو مضبوطی سے اس طرح پکڑ لو کہ اس سے ذرہ برابر باہر نہ جاؤ، اور اپنے دوستوں کو بھی اسی راہ پر چلنے کی نصیحت کرو تاکہ وہ بھی اس پر عمل کر کے اپنے شیخ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جائیں، اور بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں فقر محمدی کی تشریح نہیں سما سکتی، لیکن میں اس کے چند اصول و قواعد بیان کئے دیتا ہوں کہ اصول معلوم ہو جانے کے بعد فروع کا معلوم ہو جانا آسان ہے، وباللہ التوفیق۔

قاعدۂ اوّل:- اس راہ میں یہ بات ہے کہ تم اپنے اور اس پروردگار کے درمیان جس نے ایسا رحیم و کریم نبی بھیجا اور اپنی کتاب عزیز اس پر نازل فرمائی عہد کی تجدید کرو کہ تازہ وضو کر کے کسی ایسی خالی جگہ میں جہاں کوئی نظر نہ آتا ہو، آجاؤ اور کامل خشوع و خضوع کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھو، اور برہنہ بارگاہ مولیٰ میں اتنی دیر بیٹھے رہو کہ تمہارا دل نرم اور تمہارا اپتہ پانی ہو جائے، اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں، پھر تمام گناہوں سے باز آجاؤ، اور سید الاستغفار جو حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے پڑھو، اور طریقہ محمدی پر استقامت کی دعا مانگو، بس اس توبہ اور اس عہد پر جو تم نے اپنے پروردگار سے باندھا ہے سختی سے جم جاؤ،

اور اپنے سات اعضا یعنی آنکھ، کان، زبان، شکم، شرمگاہ، ہاتھ اور پاؤں کو جو تمہارے تابع ہیں اور قیامت کے دن ان سے بھی پرسش ہوگی، شریعت کی نافرمانیوں سے باز رکھو، اور اللہ تعالیٰ کا اور اس کو تمہارے تمام احوال کے علم کا مراقبہ کرو، تاکہ پورا دن اس طرح گزر جائے کہ تمہاری زبان غیبت، عیب جوئی، جھوٹ اور ہر بیہودہ بات سے دور رہے، اور تمہارے کان میں کوئی بری یا ناپسندیدہ بات نہ پڑے، اور تمہاری نظر کسی غیر عورت یا لونڈے پر نہ پڑے اور تمہارے دل کا میلان ان کی جانب نہ ہو کہ وہ عہد جو تم نے اللہ تعالیٰ سے باندھا ہے ٹوٹ نہ جائے کہ توبہ کے بعد چشم و دل کے زنا میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اور مقام تقویٰ میں جگہ حاصل کرو اور سفر آخرت کے لئے تیار ہو کر اصلاح احوال و اوقات میں مشغول ہو جاؤ کہ تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے سرخروئی کے ساتھ ملاقات کی امید ہو — یہ بھی سمجھ لو کہ اللہ کے سامنے سرخروئی منہیات سے بچنے، اوامر پر عمل کرنے اور اس کی شریعت کا اتباع کرنے سے حاصل ہوگی، اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرخروئی آپ کی سنت کا اتباع، آپ کی احادیث کے سننے اور ان پر عمل کرنے سے، اور تمہارے ذمہ لوگوں کے جتنے بھی حقوق یا ظلم ہیں ان سے بری الذمہ ہو جاؤ، کہ ان کے حقوق کا ایک ذرہ بھی تمہاری گردن پر نہ رہے۔ اور اپنے، مخلوق کے اور اللہ تعالیٰ کے تمام عام و خاص حقوق ادا کرنے میں لگ جاؤ، بالخصوص اس شخص کے جو تمہارا اس طریق میں ساتھی اور مصاحب ہو، اور اسکی صحبت تمہارے ساتھ تعاون، نیکی اور تقویٰ کے طور پر ہو، لہٰذا اگر اخوت و مساوات کے درجہ میں یہ صحبت ہے تو اس کے ساتھ نرمی، نصیحت، امداد اور زائد از حاجت چیزوں کے ایثار کا معاملہ کرو، اور اگر وہ ارادت و اصلاح کے درجہ میں ہے تو کبھی نرمی اور کبھی سختی سے اس کی تعلیم و تربیت کرنا چاہیئے، اور امر و نہی کی ترشی میں رفق و نرمی کی شیرینی کی آمیزش کرنا چاہیئے، اور اگر تمہارے ساتھ اس کا معاملہ بے ادبی اور گستاخی کا ہو جائے تو اگر غفلت و سہو کی وجہ سے ایسا ہوا ہے تو اس سے درگذر کرو اور اس کے عذر کو قبول کر کے اس کے رشتۂ محبت کو دل سے جدا نہ کرو اور اس کے ارشاد،

ہدایت میں مشغول رہو، اور اگر یہ بے ادبی قصداً حماقت، بدزبانی اور سامنے اور پیچھے عیوب کو بیان کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے، تو اگر وہ اس سے باز آجائے اور عذر کرے تو ظاہراً اس کا عذر قبول کر لینا چاہیئے اور اس سے ترک سلام و کلام نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہمارے لئے باہمدگر ترک سلام و کلام شرعاً ممنوع ہے، البتہ ایسے شخص کو صحبت خاص کے قابل سمجھا جائے، کیونکہ مرید کی سرکشی و نافرمانی کی توبہ بھی نہیں، کیونکہ جو لطیفۂ قلبیہ تمہیں اس کی تربیت پر آمادہ کرتا اور اس راہ سے فیض الٰہی کو اس تک پہنچاتا وہ ختم ہو گیا اور رابطہ منقطع ہو گیا، کیونکہ یہ نصیبہ شیخ کی انتہائی درجہ کی تعظیم و احترام اور اس کے ساتھ محبت کی پختگی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اور اگر یہ بے ادبی طبیعت کے مغلوب ہو جانے کی وجہ سے ہوئی لیکن شیخ کی قدر و منزلت اسکے دل میں ویسے ہی برقرار رہی تو اگر وہ توبہ و رجوع کرے تو معذور ہے، لیکن جب اس سے درشتی و سختی ظاہر ہوئی اور قصداً محبت و ادب کے خلاف چلا اور ربط و علاقہ منقطع ہو گیا تو اب اس کا واپس آنا مشکل ہے، حق اسلام تو باقی ہے لیکن نسبت ارادت کے مناسب نہیں۔ نیز اپنے ہر مصاحب سے طلب صدق بھی مت کرو الا یہ کہ وہ بطریق صدق ارادت چل رہا ہو، اور مخلوق کے ساتھ مدارات کا معاملہ کرو نہ کہ مداہنت کا، مدارات کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ نرمی) دفع شر اور طلب جمعیت وقت کے لئے ہو، اور مداہنت یہ ہے کہ طلب دنیا اور حظ نفس کے لئے ہو، اور اپنے طریق کی ضد پر چلنے والوں اور ایسے لوگوں کی جو تمہارے طریق پر نہ ہوں صحبت اختیار نہ کرو۔ اور فقرا کی عزت و حرمت تواضع و ایثار کے ساتھ خدمت کرو اور اغنیا کے ساتھ بے نیازی، قطع حرص و تمنا اور سکوت و سلامتی کا معاملہ کرو، یعنی تم مالداروں کے مطلوب بنو طالب نہ بنو، اور ان کے سوال کے مطابق ان سے کلام کرو اور انہیں اپنا مرید نہ سمجھو۔

قاعدۂ دوم:۔ فقر محمدی کے طریق میں پانچوں نمازوں کا وقت پر ارکان و آداب اور حضور قلب و معنئ احسان کی رعایت کرتے ہوئے ادا کرنے کا اہتمام کرنا ہے کہ اذان سننے کے وقت سے نماز سے فارغ ہونے تک سکون و وقار، خشوع و خضوع، فہم معانی قرآن اور ان میں غور و فکر، رکوع و سجود میں استحضار عظمت خداوندی اور

تشہد و تسبیح کے ساتھ رہنا اور حق تعالیٰ کے ساتھ جو بھی اس کا حال ہو نماز میں اس حال کا ظاہر ہوتا ہے، اور نماز میں خود سپردگی کا حال حالِ صحیح ہے، اور نماز بندہ اور خدا کے درمیان ایک رابطہ ہے جس شخص کو نماز میں حضور نصیب نہ ہو اس کا حال صحیح نہیں، کیونکہ جو اقرب مقام میں محجوب ہے وہ مقام بعید میں کیا ہوگا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب حالت سجدہ میں ہوتا ہے، اور آپ نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ فرماتے ہیں کہ افسوس کا مقام ہے کہ گانے بجانے کے وقت تو تمہیں حضور حاصل ہوتا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہوتے وقت حجاب، یہ تو فقر فاسد کی علامت ہے اور فقر محمدی میں سب سے عمدہ یہ مقام ہے کہ بارگاہ نبوت سے ارتباطِ قلب ہو جائے کہ اپنے دل کو آپ کی محبت میں سرشار رکھنا، آپ کو اپنا شیخ و امام گردانا، آپ کے رشتۂ محبت کو مضبوط و مستحکم کرنا، آپ پر بکثرت درود بھیجنا اور رشتۂ باطنی کا آپ کے ساتھ قوی جوڑ رکھنا چاہیئے، تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے دل میں ایسا گھر کر جائیں کہ فقر محمدی کے دل میں تم مشائخ اور ان کے مریدوں کو دیکھنے لگو، کیونکہ جب کسی کے پیر کا ذکر اس کے سامنے آجائے تو وہ شوق کے مارے کیسا مضطرب ہوتا اور کیسے جھومتا ہے، کیونکہ اس کے دل میں شیخ کی قدر و منزلت ہے، لہٰذا تم بھی اپنے پیغمبر اور اپنے شیخ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دل میں ایسا ہی جمالو تاکہ آپ کی محبت تمہیں گرفتار کرلے اور تمہارے دل کی مالک ہو جائے، اور آپ کی تصویر تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ رہے، اور جب آپ کا نام پاک آجائے تو تمہیں اس کی لذت دل میں محسوس اور آپ کی عظمت کا دل میں مشاہدہ ہو، اور جب آنحضرتؐ کے معاملہ میں تمہاری یہ صورت ہو جائے کہ تم آپ کی یاد اور استحضار میں مستغرق اور بکثرت درود بھیجنے والے ہو جاؤ تو اب آپ کے وعدوں کی پابندی اور آپ کے اوامر و نواہی کی بجاآوری اختیار کرو، اور آپ کے سنن و اخبار، سیر و معجزات، اوصاف و احوال اور محاسن و ماثر کا بار بار مطالعہ کرو، اور جب تم آپ کی کوئی حدیث سنو اور آپ کے اوصاف کا تصور کرو تو رشتۂ محبت زیادہ، آپ کی عظمت دل میں غالب اور اتباع سیرت کا داعیہ قوی ہو جانا چاہیئے، اور تمہارا تمام ذکر و فکر آپ سے

متعلق اور آپ کے بارے میں اور تمہارا اہتمام تر ذوق وشوق آپ کی یاد میں اور تمام تر جدوجہد آپ کی پیروی میں ہونا چاہیئے، تاکہ تم آپ کے متبع اور آپ کے آدمی کہلاؤ۔

رسالہ کے آخر میں فرماتے ہیں کہ لوگ فقر فقر پکارتے ہیں لیکن فقر کی حقیقت اور اس کی ابتداو انتہا سے ناواقف ہیں، میں ابتدائے فقر و درویشی سے متعلق ایک ایسا نکتہ بیان کئے دیتا ہوں کہ اس نکتہ کے معلوم ہوجانے کے بعد درویشی کی عزت و عظمت سے بھی واقفیت ہو جائے گی، اور انتہائے درویشی کو بھی اسی پر قیاس کرلینا لہٰذا سمجھو کہ جو شخص فقر و درویشی کے میدان میں آتا ہے، اور اس میدان میں امتثال اوامر اور اجتناب نواہی سے فارغ ہونے کے بعد ہی آیا جاسکتا ہے، تو اس طریق میں آنے کا ابتدائی حال یہ ہے کہ جس طرح ایک متقی اپنے اعضا کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح درویش کو اپنے خیالات حق کی حفاظت کرنا چاہیئے کہ جب بھی کوئی ناپسندیدہ خدا خطرہ دل میں گزرے فوراً اس سے توبہ کرے بعضوں کے قلوب تو راہ استقامت پر ہوتے ہیں اور خواطر صالحہ ہی دل میں گزرتے ہیں اور اس حال میں ہوتے ہیں کہ ان کے اکثر خیالات خواطر حق ہی ہوتے ہیں، ایسے لوگ اللہ کے محبوب ہیں کہ ان کے دل میں وہی خواطر آتے ہیں جن سے حق راضی ہو اور انہیں اس کے خلاف میں شرم آتی ہے کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے علیم و بصیر ہونے کا پختہ یقین ہوچکا ہے، اور جب ہم اس مرتبہ پر اگرچہ یہ درویشی کا ابتدائی مقام ہے نہیں پہنچے تو ہمیں درویشی و ارادت کے دعوے سے شرم آنا چاہیئے۔

اور ابتدائے درویشی سے متعلق دوسرا نکتہ یہ ہے کہ امتثال امر، اجتناب نہی اور حفظ خواطر کے بعد حق تعالےٰ کی طلب و ارادت اس طرح دل پر غالب آجائے اور اس کی محبت کی اس طرح شعلہ زن ہو کہ دنیا کے تمام مقاصد و مطالب جل کر خاک ہوجائیں اور دل اس کے غیر سے خالی و فارغ ہوجائے، اور جب ہم اس منزل پر بھی نہیں پہنچے تو کس طرح درویشی کا دعویٰ کرسکتے ہیں حالانکہ ہمیں اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ فقرائے واصلین کے احوال ذکر کرنے کی اس جگہ گنجائش نہیں ہے، اور مقصود تو قدر ضروری پر کفایت کرلینا ہے، اور جب قلوب ابتدا کے سننے کی تاب نہ لاسکے تو انتہا کی کیسے لاسکتے ہیں۔

اور فرمایا کہ ہمیں اپنے حال پر رونا چاہیئے کہ ہمارا سابقہ ایسے فرقہ سے پڑا ہے جن کا شیوہ اکل حرام اور جن کا طریقہ بطالت و تعطل ہے، ان کے نزدیک جو بھی ہاتھ آجائے حلال ہے، اور جو ہاتھ نہ آئے وہ حرام دن رات اسی فکر میں گھومتے ہیں کہ کوئی لقمۂ تر ہاتھ آجائے، یا کوئی خوبصورت (عورت یا لونڈا) نظر پڑ جائے یا کہیں سے نغمہ وسرود کی آواز کان میں پڑ جائے، اپنے لئے احوال ظاہر کرتے اور علوم و معارف بیان کرتے ہیں تاکہ عوام معتقد ہو جائیں اور اپنا الو سیدھا ہو جائے حالانکہ انہیں حقیقی اسلام کی نہ ہوا بھی لگی نہ ایمان حقیقی ان کے قلب میں آیا، تمام رات گانے سنتے اور ناچتے ہیں اور جب نماز میں پہنچتے ہیں تو کوے کی طرح ٹھونگے مار کر چل دیتے ہیں، اور بادشاہوں اور مالداروں کی خاک چھاننے اور ان کے عطیات کو وصول کرنے پر فخر کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ ہمیں ان سے بچائے کیونکہ یہ راہ حق کے ڈاکو ہیں اور دنیا کے چور اور ڈاکوؤں سے زیادہ خطرناک کہ وہ تو صرف مال پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور یہ دین و ایمان پر، ناواقف لوگ چونکہ ان کو لباس درویشی میں دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ درویشی یہی ہے، لہذا ان کا اتباع کرکے ہلاکت میں مبتلا ہوتے ہیں، اللہ تعالےٰ دنیا کو ان کی نجاستوں سے پاک فرمائے کہ انہوں نے دین کے چہرے کو بگاڑ دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان اہل خشیت وخوف سے راضی ہو جو تعظیم، مراقبہ اور معرفت و اتباعِ سنت میں اپنی زندگی گزارتے ہیں اور لوگوں کی نظروں سے ایسے چھپے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے علاوہ انہیں کوئی پہچانتا بھی نہیں، اللہ سے میری دعا ہے کہ اے یاران طریقت ہمیں اور تمہیں وہ اس بات کی توفیق عطا فرمائے جو اسے پسند ہو اور اس سے بچائے جو ناپسند ہو۔

یہ بھی فرمایا ہے کہ فقر محمدی کی علامت یہ ہے کہ قرآن کریم کو سنکر نشاط و طرب پیدا ہو اور دل کا میلان اس کی جانب ہو جائے اور اس حق تعالےٰ کی صفات مقدسہ کی تجلیات کا مشاہدہ کرنے لگے، بڑے تعجب کی بات ہے کہ کسی کی محبت کا دعویٰ تو کرے لیکن اس کے کلام کے وقت دل کو حاضر نہ کرے اسی طرح گانے بجانے کے وقت تو حاضر اور حق تعالےٰ کا کلام سنتے وقت غافل رہے، عاشقان

خدا کا تو یہ حال ہے کہ قرآن کریم ان کے دلوں کی شفا اور ان کے باطن کی راحت ہے، خود متکلم ان کے سامنے تلاوت کے وقت آجاتا ہے جس کا مشاہدہ وہ امر و نہی، وعد و وعید، قصص و اخبار اور حکمت و مواعظ میں کر لیتے ہیں، ان کے قلوب نرم، ان کی ارواح منجذب اور ان کے نفوس معدوم ہو جاتے ہیں، عظمت متکلم کی وجہ سے ان کی اپنی صفات مغلوب ہو جاتی ہیں، اور حق تعالےٰ ان کے قلوب کو اپنی محبت اور رحمت و الطاف کا مشاہدہ کرانے کے لئے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

یہ بھی فرمایا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ "چونکہ قرآن کریم طبع بشری کے مناسب نہیں اس لئے اس کے سماع سے وجد و حال طاری نہیں ہو سکتا اور گانا بجانا اس کے مناسب ہے اسی لئے اس سے دلوں میں نرمی اور رقت پیدا ہو جاتی ہے" تو اس کی بات نہ سنو، کیونکہ یہ کلام فاسد ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں، واقعہ دراصل یہ ہے کہ شعر اپنے اوزان کی وجہ سے طبیعت میں تحریک پیدا کرتا ہے بالخصوص جب کوئی خوش آواز موسیقی کے اصول کی رعایت کرتے ہوئے پڑھے پھر اس کے ساتھ ساز و رباب کا بھی اضافہ ہو جائے اور کچھ لوگ اس پر رقص بھی کرنے لگیں تو اس صورت میں بچے اور جانور بھی اپنی طبیعت و فطرت کی وجہ سے حرکت میں آجائیں گے، اور یہ حرکت ایمان و یقین کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی فطرت و جبلت کی وجہ سے ہے۔

اہل ایمان و یقین جو حضرات صحابہؓ اور تابعین ہیں انہیں قرآن کریم سے اس جذبۂ دل کی وجہ سے جو ان کے دلوں میں ہے وجد طاری ہو جاتا، ان کا یہ وجد و خشوع اور رقت قلب معرفت و یقین کی وجہ سے ہے نہ طبیعت و فطرت کی وجہ سے، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو اور اس آیت قرآنی کو پڑھو اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابها مثانی تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم وقلوبهم الی ذکر الله یعنی اللہ نے نازل فرمایا ہے اچھا کلام یعنی ایسی کتاب جو آپس میں متشابہ ہے بار بار پڑھی جاتی ہے کہ اس سے اللہ سے ڈرنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کے جسم اور قلوب اللہ کے ذکر کی طرف رقیق و نرم ہو جاتے ہیں۔ اور اے یاران طریقت اگر قرآن سنتے وقت تم اپنے

دلوں کو حاضر نہ پاؤ تو خود کو ہی متہم سمجھو، اور سمجھو کہ تم متکلم کی معرفت سے محروم ہو حق تعالیٰ کو سب سے زیادہ پہچاننے والا وہ ہے جس پر اس کا کلام سنتے وقت خشوع طاری ہو۔

یہ اس رسالہ کے تفصیلات و تطویلات کو حذف کرنے کے بعد مختصر سا ترجمہ ہے، اور منصفانہ غور و فکر کے بعد ظاہر ہو رہا ہے کہ تربیت و سلوک میں مشائخ کے طریقہ کی نفی اس کا مقصود نہیں بلکہ اتباع سنت اور رعایت تقویٰ کی ترغیب، حضرات صحابہ رضؓ و تابعین کے طریقہ کی ترجیح، مخالف سنت اور بدعت سے بچنے کی تاکید اور ایسے فرقہ کی مذمت کرنا مقصود ہے جو دین فروشی کرتا ہے خواہشات نفسانی کی پیروی اور دین کے معاملات میں نفاق اختیار کرتا ہے، اور یہ بات تمام حضرات صوفیا اور اہل اسلام کی متفق علیہ ہے اسی لئے بعض وہ سلسلے جو خلاف سنت اور مشابہ بدعت ہیں اس کے پیروکار اپنے طریق کو کھینچ تان کر سنت کے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہرگز اس پر راضی نہیں ہوتے کہ خلاف سنت ہوتے ہوئے اس کے صحیح ہونے کا دعویٰ کریں (بلکہ سنت کے مطابق بتاکر پھر دعوئے صحت کرتے ہیں)، اور چونکہ دین اسلام اسی طرح نقل در نقل (سنت) پر موقوف ہے اسی لئے مشہور ہے کہ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ باطل، کسی کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے، اگر ایسا کرے گا تو غلط ہوگا۔

اگر کسی مقام پر اشتباہ پیدا ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ وہ اہل صدق متقی اور ارباب کمال سے غلبۂ حال کی وجہ سے صادر ہوا ہے تو اسے تسلیم کرکے مناسب تاویل کرے اور توقف و خاموشی اختیار کرلے، اور اگر ایسے لوگوں سے نہیں ہے تو پھر اسکی تردید ہی کرنا چاہیئے۔ یقینیات میں توقف و تردد نہ کرنا چاہیئے۔

اس رسالہ کے مصنف خود حقوق و آداب صحبت کے قاعدہ کے بیان میں اس بات کے قائل ہیں کہ صحبت مشائخ سے استفادہ ہوتا ہے جیسا کہ گزر گیا، اور اس کے انکار و نفی کی کوئی گنجائش بھی تو نہیں کیونکہ صحابہ و تابعین اور سلف و خلف سب کا طریق استفادہ یہی صحبت تو ہے، بلکہ مصنف کا مقصود یہ ہے کہ اصل کو اختیار کرنا، منبع انوار سے براہ راست فیض حاصل کرنا، محبت

رسولؐ اور اتباع سنت کا اہتمام کرنا چاہیئے تاکہ فروع میں پڑکر اصل سے غافل نہ ہوجائے اور وسائل میں مشغول ہوکر مقصود کو ترک نہ کردے، اور قول و فعل کا معیار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین کے طریقہ کو بنائے اور اسی کی موافقت کرے، ان لوگوں کے طریقہ کو نہ اپنائے جنہیں اس کی نہ تو پروا ہے نہ علم اور نہ اس کے حصول کی کوشش و اہتمام ہے۔ بلکہ ان کے برعکس ان کا طریقہ ہے کہ اصل کو فرع کا تابع اور اس کا موافق بناتے ہیں، اور یہ طریقہ یا تو جہالت کی وجہ سے ہے یا الحاد کی۔

مصنف نے سماع کے باب میں جو کلام کیا ہے وہ بھی سنت کے مطابق ہے، اور سماع کا مسئلہ مشائخ کے نزدیک اختلافی ہے، بعض اس کے منکر ہیں، بعض توقف کرتے ہیں اور بعض اس پر شرائط و آداب کی رعایت کرنے کے بعد عمل کرتے ہیں، اس میں بڑی طویل بحث ہے، اگر شایان شان بیان کی جائے تو بہت طول ہوجائے جس کی اس مختصر مکتوب میں گنجائش نہیں، انشاء اللہ پھر کبھی انصاف و اعتدال کے ساتھ اسے بیان کروں گا۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

حضرت شیخ علی متقی رحؒ نے رسالہ کے ذیل میں مقصود سے متعلق کچھ فوائد تحریر کیئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ :-

فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عطاء اللہ سے اور انہوں نے شیخ ابوالعباس کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارا یہ طریق اہل مشرق و مغرب کی طرف منسوب نہیں، بلکہ یہ تو فلاں عن فلاں سے حسن بن علی رضی اللہ عنہم تک ہے اور حضرت علی اس امت کے سب سے پہلے قطب (ارشاد) ہیں، اور ان مشائخ کی تعیین جو اس باب میں معتمد ہیں اس پر ضروری ہے جس کا طریقہ دستار بندی اور خرقۂ خلافت کا ہو، کیونکہ یہ روایت (کے مثل) ہے اور روایت میں رجال کی تعیین ضروری ہوتی ہے، جو اس کی سند ہے، اور کبھی وہ بندہ کو خود ہی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور استاد و شیخ کے احسان سے اسے سبکدوش فرمادیتا ہے لہذا اسے وہ فیض وہاں سے حاصل ہوتا ہے، مجھ سے شیخ مکین الدین نے فرمایا

کہ میری تربیت تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اور شیخ عبدالرحیم کا واقعہ نقل کیا وہ فرماتے ہیں کہ میرے اوپر علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کا احسان نہیں ہے، اور جب اللہ تعالٰی اپنے کسی بندہ کو نوازنا چاہتا ہے تو اسے مشائخ سے بے نیاز فرما دیتا ہے، اور آپ نے اپنے ایک ہمنشیں سے فرمایا کہ میں تمہیں اپنا وزیر بنانا چاہتا ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ میرا اس میں کوئی مقتدا نہیں، آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں بعد والوں کے لئے مقتدا بنانا چاہتا ہوں۔

شیخ ابوالعباس حضرمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم ہمیشہ ذکر میں مشغول رہو اور درود شریف کی کثرت رکھو کیونکہ جب کسی کو شیخ مرشد نہ مل سکے تو یہ درود شریف اللہ تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے وباللہ التوفیق ومنہ الهدایة لسواء الطریق ؛

مکتوب نمبر ۶

بنام خواجہ محمد باقی قدس اللہ سرہ

فرع الاسماع ــــ باختلاف اقوال المشائخ واحوالھم فی السماع

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللھم باسمک ابتدیٔ وبک اعتصم

حضرات مشائخ طریقتؒ اور صوفیائے کرامؒ میں ان کے منقول شدہ اقوال وافعال کی روشنی میں "مسئلہ سماع" میں اختلاف ہے، ایک جماعت اس کے جواز کی منکر، دوسری اس پر عمل کرنے والی ہے اور تیسری جماعت نے توقف کیا ہے، ہر ایک کے پاس اپنے نظریات کی دلیلیں ہیں تم تو بھلی بات کی طرف دوڑو۔ صوفیائے متقدمین جو اس طریق کے امام ہیں وہ سماع کے منکر ہیں، اور متاخرین جو والہانہ اور مستانہ انداز رکھتے ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ ابتدائے حال میں سماع سے شغل فرماتے اور اہل سماع کے ساتھ بیٹھتے تھے لیکن آخر میں اسے ترک فرمادیا تھا، کسی نے پوچھا کہ آپ نے سماع کو کیوں ترک کردیا، فرمایا کہ کس سے سنو اور کس کے ساتھ بیٹھ کر سنوں، گویا آپ نے اُن یاران طریقت کے فوت ہوجانے کا اشارہ فرمایا جو اہل تھے اور اہل کے ساتھ بیٹھ کر سماع کا شغل کرتے تھے، کیونکہ مشائخؒ نے جہاں بھی سماع کو اختیار کیا ہے تو اس کے وہ شرائط وآداب جو کتابوں میں موجود ہیں ان کی رعایت کرتے ہوئے اختیار فرمایا ہے، اور وہ بھی کبھی کبھی، ہمیشہ اور عادت کے طور پر نہیں، اور جب حضرت جنیدؒ نے اپنے زمانہ میں شرائط وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اسے ترک فرمادیا تھا تو دوسرا کیا کہہ سکتا ہے۔

بعض لوگ حضرت جنیدؒ کی اس حکایت کو اس طرح نقل کرتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ پہلے سماع کا شغل کیا کرتے تھے بعد میں اس سے توبہ کرلی، اس سے دوسری جانب معلوم ہوتی ہے (کہ ان کے نزدیک یہ فعل ناجائز تھا، اور پہلی حکایت سے

معلوم ہوتا ہے کہ شرائط و آداب کے ساتھ جائز ہے)۔

حضرت جنیدؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا، حضرات صوفیائے کرام پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تین جگہ نازل ہوتی ہے ۱۔ کھانے کے وقت کیونکہ یہ حضرات فاقہ و حاجت کے وقت ہی کھایا کرتے تھے ۲۔ مذاکرۂ کلام کے وقت کیونکہ ان حضرات کی گفتگو انبیا و صدیقین کے مقامات کے بارے میں ہوتی تھی ۳۔ سماع کے وقت کیونکہ ان حضرات کا سماع مشاہدۂ حق کے وقت ہوتا تھا، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ کا یہ کلام پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا، یا سماع سے مراد وہ سماع ہے جو اس آیت میں مذکور ہے الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ یعنی جو لوگ بات سنتے ہیں اور اچھے قول کی پیروی کرتے ہیں، یا اس آیت میں مذکور ہے واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یعنی جب وہ اس کلام کو جو رسول پر نازل ہوا ہے سنتے ہیں تو تم ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے دیکھو گے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ عوارف میں لکھا ہے کہ جس سماع کا ذکر ان آیتوں میں ہے اس کی حقانیت پر تو سب کا اتفاق ہے دو شخص بھی اس میں مختلف نہیں، اور یہ سماع باعث نزول رحمت پروردگار ہے، اختلاف تو مستانہ آواز اور موسیقی کی رعایت کرتے ہوئے خوش نغمگی سے اشعار و قصائد کے سماع میں ہے، سو اس باب میں اقوال کثیرہ اور احوال مختلفہ ملتے ہیں بعضے اس کے منکر اور اس پر عمل کرنے والوں کو فاسق شمار کرتے ہیں۔ بعضے اس کے بڑے شیدائی اور دلدادہ ہیں، لیکن حق بات یہ ہے کہ دونوں فرقے افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ حضرت جنیدؒ سے کسی نے پوچھا کہ سماع کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا جو چیز تمہاری توجہ کو اللہ سے ملا دے وہ مباح ہے حضرت جنیدؒ کا یہ کلام صوفیانہ رنگ کا ہے جس سے عوام اور جہلا کی لغزش کا اندیشہ ہے، اور ان کا یہ فرمان صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ جب تم کسی مرید کو طلبگار سماع پاؤ تو سمجھ لو کہ اس کے اندر بطالت و تعطل کے جراثیم موجود ہیں، اور پہلے قول سے یہ مراد لینا ضروری ہے کہ ایسی چیزیں جو شریعت میں اتفاقاً حرام اور مکروہ نہیں باعث جمعیت خاطر و حضور قلب ہوں تو ان کے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور

جب حضرت جنیدؒ نے سماع کے بارے میں بھی یہی کہا ہے تو معلوم ہوا کہ انکے نزدیک مطلقاً سماع حرام نہیں، اور حق بات بھی یہی ہے، کیونکہ مطلقاً سماع کی حرمت اور اس پر ایسی کوئی دلیل قطعی جیسی زنا اور شراب نوشی اور دوسرے معاصی پر ہے موجود نہیں، حق بات یہ ہے واللہ اعلم کہ جس طرح شریعت میں سماع کی اباحت کی کوئی دلیل قطعی نہیں اسی طرح اس کی حرمت لذاتہ کی بھی نہیں، قوت القلوب میں تحریر ہے کہ اگر ہم احوال سامعین کی تفصیل اور بعض اقسام سماع کی تقلید کے بغیر مطلقاً سماع کی حرمت کا قول کرلیں تو اس سے بہت سے صدیقین کا انکار لازم آئیگا۔

امام غزالیؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے، چنانچہ احیاء العلوم میں اس مسئلہ میں عمل مشائخ کا اختلاف نقل کرنے کے بعد دلیل عقلی سے اس کی اباحت ثابت کی ہے، فرمایا کہ گانا سننا اصل کے اعتبار سے تو مباح ہے کیونکہ اس کی حقیقت صرف اچھی آواز کا سننا ہے، اور اچھی آواز کا کان میں جانا مباح ہے جس طرح آنکھ کے لئے خوبصورت الوان واشکال اور باغ وگلشن کی سیر مباح ہے، البتہ عوارض سے کبھی اس میں حرمت و کراہت پیدا ہوگی اور کبھی استحسان و استحباب، اور ایسا ہوتا ہے کہ ایک امر مباح عوارض خارجیہ کی وجہ سے واجب، مستحب، مکروہ اور حرام ہوجائے۔

آگے فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص حج فرض یا نفل کے ارادہ سے سفر کرنے لگا، اور راستہ میں تھک گیا کہ حرکت بھی نہیں کرسکتا، اچانک پسندیدہ اور شوق افزا اشعار دلکش آواز سے سنے اور دو دن کی راہ ایک دن میں طے کرنے لگا، یہ کیونکر حرام ہوگا، حالانکہ وسائل کو مقاصد کا حکم حاصل ہوجاتا ہے۔

امام غزالیؒ کی اس بات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سماع غنا اصل کے اعتبار سے مباح ہے اور اس کی حرمت پر کوئی دلیل موجود نہیں، ورنہ تازگی ونشاط اور شوق کے پیدا ہوجانے سے (ایک فعل حرام سے) کیا فائدہ دے سکتا ہے، اگر کوئی شخص درماندگی و افسردگی دور کرنے یا راہ حج کو شوق وطاقت سے طے کرنے یا نماز میں قوت ورغبت حاصل کرنے کے لئے ایک جام شراب پی لے تو کیا یہ درست ہوگا، ہرگز نہیں پہلے اباحت ثابت ہونا چاہیئے اس کے بعد یہ کلام درست ہوگا، امام غزالیؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور ان کے نزدیک مختار یہ ہے کہ سماع غنا مباح ہے اور اس میں

حرمت وکراہت عوارض کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ ھو شبھۃ تتقی یعنی گانا سننے میں شبہ حرمت موجود ہے. تقویٰ کا تقاضہ یہ ہے کہ نہ سنے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ سب سے پہلے نوحہ اور سب سے پہلے گانا ابلیس نے کیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ گانا قلب میں نفاق کو بڑھاتا ہے (بیہقی) حضرت جابرؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ نے قسم کھا کر فرمایا کہ آیت ومن الناس من یشتری لھو الحدیث الخ "یعنی بعض لوگ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے" تاکہ اللہ کے راستہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کریں" میں لھو الحدیث سے مراد گانا سننا ہے، اور مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ آیت واستفزز من استطعت منھم بصوتک "یعنی اور گھبرالے ان میں سے جس کو تو گھبرا سکے اپنی آواز سے" میں بصوتک سے مراد ساز و مزامیر ہیں، فضیل ابن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ، گانا زنا کا منتر ہے۔ مسند احمد و ابوداؤد میں ایک روایت آتی ہے، حضرت نافعؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ راستہ میں تھے کہ آپ کے کان میں ایک نے کی آواز آئی، آپ نے فوراً کان میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں اور اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار فرمایا اور مجھ سے پوچھا کہ اے نافع کیا اب بھی وہ آواز سنائی دے رہی ہے میں نے عرض کیا نہیں، تب آپ نے انگلیاں کانوں سے نکال لیں اور فرمایا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آوازِ نے سننے کے وقت اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا تھا، نافعؓ کہتے ہیں کہ میں اس زمانہ میں چھوٹا بچہ تھا۔ یعنی ابن عمرؓ نے مجھے اسی وجہ سے اس آواز کے سننے سے منع نہیں فرمایا۔

امام شافعیؒ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ گانا ایک مکروہ کھیل ہے جو باطل کے مشابہ ہے، اور فرمایا کہ جو بکثرت اس میں مشغول ہو وہ بے وقوف اور بے خبر ہے اس کی شہادت بھی مقبول نہیں، اور فرمایا کہ کسی نامحرم عورت کا گانا سننا اگرچہ وہ عورت پردہ میں ہو کسی طرح جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ گانا سننا گناہ ہے اور امام صاحب کی مشہور روایت کراہت کی ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے باندی خریدی لیکن وہ گانے والی نکلی تو

اس کے اندر عیب ہے جس کی وجہ سے وہ اس بیع کو فسخ کر سکتا ہے۔
امام احمدؒ سے بھی اسی طرح منقول ہے. علما نے فرمایا ہے کہ اہل مدینہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

یہ کلام روایات فقہیہ اور اقوال فقہا کی طرف چلا گیا جو بہت وسیع میدان ہے۔ اگرچہ (احکام میں) اصل یہی ہے، لیکن اس غنا سے یہاں وہ غنا مراد ہوگا کہ جس کا کرنا اور سننا لہو ولعب، جذبۂ نفسانی اور داعیۂ شہوت حرام کی وجہ سے ہو، تاکہ تمام دلائل میں تطبیق ہو جائے۔ محدثین کو احادیث مذکورہ میں کلام ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کوئی صحیح حدیث اس باب میں وارد نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم۔

ہمارا مقصود تو اس مسئلہ میں مشائخ طریقت کے اقوال وافعال کو دیکھنا ہے۔ سو متقدمین ومتاخرین مشائخ کی حکایات ہمیں اس باب میں غالب ومغلوب سے قطع نظر کر کے مختلف نظر آتی ہیں۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے ایک شیخ جنکا نام شیخ حماد دباس ہے جو اپنے زمانہ کے اونچے درجہ کے مشائخ طریقت میں سے تھے اور حضرت محبوب سبحانیؒ نے ان سے استفادہ بھی کیا ہے، ایک مرتبہ نماز جمعہ کے لئے روانہ ہوئے، اثنائے راہ میں گانے کی آواز آپ کے کان میں آئی، کھڑے ہو گئے اور سوچنے لگے کہ آج مجھ سے کونسی معصیت سرزد ہوئی ہے جس کی پاداش میں اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا، بہت غور وخوض کیا کچھ معلوم نہ ہوا۔ اپنے گھر واپس آئے اور وہاں تحقیق حال فرمائی، گھر والوں سے بھی ایسی کوئی چیز صادر نہ ہوئی تھی، حیران رہے پھر معلوم ہوا کہ جو پیالہ خریدا تھا اس پر تصویریں تھیں، فرمایا کہ اسی کی نحوست میں ہم مبتلا ہوئے تھے (بہجۃ الاسرار)

بہجۃ الاسرار کی دوسری حکایت جو اس کے خلاف ہے وہ بھی سنو، شیخ ابو یعقوب یوسف ہمدانیؒ ایک مرتبہ مجلس سماع میں تھے کہ علمائے کرام آ گئے اور آپ کو سماع سے منع فرمایا، آپ کو غصہ آ گیا اور زبان سے کہہ دیا کہ اللہ تمہیں موت دے وہ علمائے کرام اسی وقت مر گئے۔ یہ شیخ ابو یعقوبؒ اور شیخ حماد دباسؒ دونوں کامل درجہ کے اولیا میں سے ہیں، شیخ ابو یعقوبؒ شیخ عبد الخالقؒ کے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے سرتاج ہیں پیر ہیں، حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبندؒ اس کے باوجود ترک سماع کرتے

تھے اور فرماتے تھے کہ نہ تو میں یہ کام کرتا ہوں نہ انکار کرتا ہوں حضرت شیخ عبید اللہ احرارؒ بھی سماع سے گریز کیا کرتے تھے لیکن آپ کے بعد آپ کے بعض مریدوں نے طریقۂ سماع کو اختیار کیا، اور دعویٰ کیا کہ شیخ عبید اللہؒ نے اس مسئلہ میں اجازت دی ہے، ہم سے فرمایا تھا کہ اگر ہمارے بعد مصلحت وقت اور بعض سالکوں کی رعایت کی وجہ سے یہ کام کرنے کی نوبت آئے تو اختیار ہے۔ واللہ اعلم

سلسلۂ کبرویہ میں سماع ہے۔ شیخ نجم الدین کبریٰؒ، شیخ مجد الدین بغدادیؒ اور دوسرے یاران سلسلہ سماع پر عمل کرتے تھے۔ شیخ نجم الدینؒ، شیخ عمار یاسرؒ کے مرید اور شیخ عمار شیخ ابوالنجیبؒ سہروردی کے مرید ہیں، اور انہیں سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کہ آپکے خلیفہ بھی تھے مرید ہیں، اور وہ سماع پر عمل نہیں کرتے تھے، اور اس کے رد و قبول میں تفصیل فرماتے تھے۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سماع کے باب میں جو اختلاف ہے وہ سلسلہ سہروردیہ اور چشتیہ کا نہیں بلکہ یہ تو ایک حال ہے کہ بعض کو پیش آجاتا ہے اور بعض کو نہیں اور بعض میں اگرچہ وہ حال موجود ہے لیکن پھر بھی توقف کرتے ہیں اور راہ اتباع اختیار کرتے ہیں۔ در اصل سماع غنا نہ تو کوئی مذہب ہے اور نہ ارکان طریقت میں سے کوئی رکن کہ اس کو اختیار کریں۔

سلسلۂ شاذلیہ کے سرتاج شیخ ابوالحسن شاذلیؒ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ سماع کا شغل رکھتے اور ظالموں کی دعوتیں اڑاتے ہیں انہیں سمجھو کہ وہ یہودیت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں یہودیوں کا یہ وصف آیا ہے سماعون للکذب اکلون للسحت "یعنی جھوٹی باتوں کے سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں" اور جب آپ سے سماع کا شغل رکھنے والوں کی حالت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا انھم الفوا اباءھم ضالین فھم علی اثارھم یھرعون یعنی انہوں نے اپنے آباو اجداد کو گمراہ پایا سو ان کے نقش قدم پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔" سلسلۂ شاذلیہ کے ایک شیخ فرماتے ہیں کہ سماع جب اہل سے آداب و شرائط کی رعایت کرتے ہوئے صادر ہو تو یہ مرتبۂ حق میں پستی ہے۔ چہ جائیکہ جب نا اہل سے شرائط و آداب کے بغیر صادر ہو یعنی مرتبۂ سماع سے بالاتر درجۂ حق ہے۔ میں نہیں سمجھا کہ

انہوں نے کس طرف اشارہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ حق سے طریقۂ سنت مراد لیا ہو۔ تو بیشک اس صورت میں سماع خلاف طریقۂ سنت ہے یا اس سے شہود ذات وتجلی ذاتی کا مقام مراد ہو کہ حضرات صوفیا فرماتے ہیں کہ اہل قلوب کا سماع تجلی صفات ہے کہ اس مقام میں تغیر و اضطراب پیدا ہوتا ہے بخلاف تجلی ذات کے کہ اس میں سکون، تمکین اور اضمحلال حاصل ہوتا ہے، یہ بھی فرماتے ہیں کہ سماع، پیام محبوب سننے کا نام ہے اور پیام کا سننا غیبوبیت میں ہوتا ہے نہ کہ حضور میں۔ بعض مشائخ کے لئے ممکن ہے کہ حالت حضور میں زبان محبوب سے کلام سنیں تو یہاں سماع کلام محبوب ہے نہ کہ پیام۔ الّا یہ کہ حالتِ استغراق ہو۔ اور سماع حالت فنا و استغراق نہیں، کیوں کہ استغراق میں شعور نہیں رہتا اور سماع میں ایک قسم کا شعور رہتا ہے، اور جب استغراق آجائے تو سماع باقی نہیں رہتا۔ اور سماع میں پسندیدہ حالت یہ ہے کہ اختیار تو ختم ہو جائے شعور باقی رہے۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ سماع اصحاب وجد کے لئے ہے اور وجد اپنے فقد اور فنا سے پیدا ہوتا ہے، اور مرتبۂ وجود، وجد سے بالاتر ہے کہ یہ منتہی کا مقام ہے۔ چنانچہ عوارف میں شیخ حمادؒ کا یہ قول منقول ہے کہ" رونا وجوش کے بقایا اس سے ہے" حضرت سہل تستریؒ کا واقعہ ہے کہ ذکر اور قرآن کریم کے سماع سے ان میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا تھا، ان کی آخری عمر میں ایک روز ان کے پاس قرآن کریم پڑھا گیا تو اتنا لرزہ طاری ہوا کہ گرنے کے قریب ہو گئے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی یہ حالت ہم نے کبھی نہیں دیکھی تھی آج کیا ہو گیا، فرمایا ضعف حال، پوچھا گیا اگر یہ ضعف ہے تو قوت کسے کہتے ہیں۔ فرمایا قوت یہ ہے کہ جو وارد بھی آئے اس کو دبا دے اور متغیر نہ ہو، چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ سے منقول ہے انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ قرآن کریم سنا اور زار زار رونے، آہیں کھینچنے اور بیخودی ظاہر کرنے لگا، آپ نے فرمایا کہ ہم بھی پہلے ایسے ہی تھے لیکن اب ہمارے دل سخت ہو گئے۔ اس سختی سے قوت یقین اور ثبات قلب مراد ہے کہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف نہ منتقل ہوتا ہے نہ کوئی تغیر پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ حضرت جنیدؒ کا آخری عمر میں سماع کو ترک کر دینا اسی وجہ سے ہو۔

اسی وجہ سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ منتہی سماع سے بے نیاز

ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں میر سیّد محمد گیسو دراز ؒ فرماتے ہیں کہ یہ منتہی ہے کہ انتہا کی مصیبت میں گرفتار ہوگیا، فرماتے ہیں کہ عشق میں دو آفتیں ہیں، ایک شروع میں دوسری آخر میں، ابتدائی آفت یہ ہے کہ درد عشق اور طلب یار کا غم اس پر ایسا طاری ہو کہ اس کے چاروں طرف محیط ہو جائے اور اس حالت میں ایک مدت گزر جائے تاکہ لذت کامل حاصل ہو اور وصل محبوب کی کوئی سبیل نظر نہ آئے، اور سمجھے کہ درد و غم سے بہتر کوئی سرمایہ نہیں، اسی حال پر رہے۔ ایک مدت گزرنے کے بعد درد و غم اس کی طبیعت اور عادت ہو جائیگی کہ نہ احساس درد باقی رہے گا نہ لذت وصل، اور سوز دروں اسی طرح ضائع ہوکر سرد ہو جاتا ہے اور اپنی جگہ ٹھیر جاتا ہے جس کا انجام بد نصیبی و خسران ہے، معاذ اللہ۔

انتہائی آفت یہ ہے کہ جب وصل محبوب حاصل ہو جائے تو لذت وصال میں مشغول ہوکر آتش فراق و حرقت الم ختم ہو جائے کچھ مدت گزرنے کے بعد جب وصال اس کی عادت و طبیعت بن جائے تو ذوقِ وصال بھی رخصت ہو جائے، اور دونوں حالتوں سے مقصود صرف محبوب کے ذریعہ ذوق و خوشی اور راحت حاصل کرنا ہے اگرچہ وصل برقرار رہو، لیکن جب ذوق ہی جاتا رہا تو کس طرح محبوب سے راحت حاصل ہو، خالی وصال کس کام کا؟ عشق نافع یہ ہے کہ ابتدا میں لذت فراق اور سوز ہجر میں مشغول ہو اور انتہا میں جتنا بھی وصال ملے شوق و طلب اور درد زیادہ ہوتا جائے، اس کے بعد فرمایا کہ میری گفتگو کمال و نقصان سے قطع نظر کرکے صرف ذوق میں ہے سیّد صاحب ؒ نے اچھی بات فرمائی ہے مگر ذوق تو دوسری چیز ہے اس میں تو گفتگو مشکل ہے، یہ تو ایک مستی ہے کوئی اس میں کیا کہہ سکتا ہے ؎

مستِ عشقم و گر نمی دانم   نہ انا الحق نہ نیہ ما فیہ

یعنی میں تو عشق کا مست ہوں دوسری بات نہیں جانتا، نہ انا الحق معلوم ہے نہ اس کے اندرونی راز۔ یہاں تو گفتگو ان قواعد و احکام میں ہے جو درویش حضرات نے مقرر فرمائے ہیں، واللہ اعلم۔

سیّد صاحب ؒ کا وہ کلام جو عوارف میں ہے وہ بھی غرابت سے خالی نہیں عوارف کے باب ردو انکار سماع میں ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ سماع مست و بیخود بنانے

ہیں شراب کا قائم مقام ہے۔" یہ بزرگ سماع تنقیص اور اس سے بچنے کو فرما رہے ہیں۔
چنانچہ انہیں بزرگ کا ایک اور مقولہ بھی ہے کہ سماع سے گریز کرو کیونکہ اس سے
شہوت میں زیادتی اور مروت میں مردنی پیدا ہوتی ہے، اسی وجہ سے انہوں نے
شراب کے قائم مقام اس کو قرار دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ شئی حرام کے ساتھ تشبیہ
دینے اور اس کے قائم مقام بنانے میں اس کی تنقیص مقصود ہے سید صاحب ؒ نے
اس پر فرمایا کہ ان بزرگ کا یہ کلام حضرات صوفیا کے مدعا کے مطابق ہے کہ سماع سے
ذوق و مستی مقصود ہے اور جب اِن بزرگ نے اسے شراب کی جگہ کہدیا تو معلوم ہوگیا
کہ اس سے ذوق و مستی حاصل ہوگی، اور یہی مقصود بھی ہے۔

یہ بات بھی خوش طبعی سے خالی نہیں کہ سماع کے ذوق اور مستی پیدا کرنے میں
کسی کو کلام نہیں، کلام تو اس کی حلت و حرمت اور کمال و نقصان میں ہے، اس جگہ
بڑی لغزش ہوتی ہے کہ کہا جاتا ہے جو چیز بھی مستی پیدا کردے وہ مبارک ہے، یہ
شخص کیوں جام شراب نہیں چڑھاتا جو ذوق مستی میں سماع سے زیادہ موثر ہے۔

کشف المحجوب میں ایک حکایت منقول ہے کہ ایک صاحب کشف بزرگ نے
ابلیس ملعون کو دیکھا کہ اس کے گرد اگرد ایک جماعت گا بجا رہی ہے، اور وہ ملعون
ناچ رہا ہے اور سوز و گداز ظاہر کر رہا ہے، بزرگ نے دریافت کیا کہ یہ کیا حالت
ہے، ابلیس نے کہا کہ جب سے مجھے راندۂ درگاہ کیا گیا اور داغ لعنت پیشانی پر لگایا
گیا اس وقت سے میرا یہی کام ہے کہ روتا ہوں، جلتا ہوں اور اپنی حالت کی
مصیبت میں رہتا ہوں، اس حکایت کو ایک صوفی صاحب نے سنکر کہا کہ یہ تو ہمارا
مدعا ہے معلوم ہوا کہ سماع ذوق و مستی، سوز و نالہ اور گریہ و بکا پیدا کرتا ہے،
دوسری کیا بات چاہیئے، لوگوں نے کہا کہ آپ نے یہ نہ دیکھا کہ یہ ابلیس کا کام ہے"
بس یہیں سے ابلیس کی مدح بھی ہوسکتی ہے کہ وہ تو ذات الٰہی کا عاشق ہے اور
ایسی ایسی اس کی ثنا کرتا ہے، ایسے لوگوں سے کیا کہا جاسکتا ہے، نعوذ باللہ۔

موحدین میں سے شیخ محی الدین بن عربی ؒ سماع پر شدید نکیر فرماتے ہیں، فرماتے
ہیں کہ نغمہ اور ترنم کا اثر براہ راست روح حیوانی پر ہوتا ہے کیونکہ حرکت بدن اور
رقص بغیر اس کے ممکن نہیں، اور روح انسانی نغمہ کے اثر سے مبرا ہے، اور فرماتے

ہیں کہ سماع نغمہ اور اس کی تاثیر دین خالص نہیں ہے جو اس آیت میں ہے الا للہ الدین الخالص یعنی صرف اللہ کیلئے دین خالص۔ اور نغمہ کے سننے سے جو وجد و مستی پیدا ہوتی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں، اور فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا اصلی ذوق اور اس کے سننے کی اصلی لذت یہ ہے کہ اچھی اور بری آواز سے یکساں ہو، اگر اچھی آواز سے ذوق پیدا ہوتا ہو تو وہ اس آواز کا کرشمہ اور اس کی لذت ہے خالص قرآن کریم کی لذت نہیں۔ شیخ کے کلام میں ردِ سماع میں مبالغہ اور شرح بہت زیادہ ہے۔

منقول ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے شیخ اوحدالدین کرمانی سے جو سماع سے شغل رکھتے، امردوں کو دیکھتے اور صاحب حال تھے، نہ کبھی ملاقات کی نہ انہیں اپنی مجلس میں جگہ دی، اگر کبھی مجلس میں ان کا ذکر آجاتا تو فرماتے میرے سامنے اس بدعتی کا ذکر نہ کرو۔ شیخ علاؤالدولہؒ نے اس حکایت کو صحیح کہا ہے اور کہا ہے کہ میں نے یہ حکایت اس شخص سے سنی ہے جو اُس مجلس میں موجود تھا، نقل ہے کہ شیخ اوحدالدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ شیخ سہروردی نے ان کے بارے میں ایسا کہا ہے تو فرمایا کہ میں اسی پر خوش ہوں کہ میرا نام تو شیخ کی زبان پر آگیا۔ سبحان اللہ! ان کی دیانت وصدق کا کیا ٹھکانا؟

مشائخ چشتیہ کے بعض ملفوظات میں تحریر ہے کہ شیخ اوحدالدین شیخ سہروردی کی خدمت میں آئے، اور سماع کی اجازت طلب کی، شیخ نے انہیں اجازت دیدی اور خود نماز میں مشغول ہو گئے اور خادم سے درویشوں کے لئے کھانا تیار کرنے کو فرمایا۔

یہ بھی تحریر ہے کہ ایک دن ایک قوال شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں نے شیخ شہاب الدین کی خدمت میں ایک غزل پڑھی تو آپ نے اس سے ذوق حاصل فرمایا حتیٰ کہ حال آگیا، یہ سنکر شیخ بہاؤالدینؒ اپنے حجرہ میں آئے۔ چراغ بجھایا اور قوال سے وہی غزل پڑھنے کو فرمایا، آپ نے ذوق حاصل کیا اور وجد آگیا، بعض لوگوں کو اس حکایت پر یقین نہیں آیا، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ اگر اس غزل میں واردات محبت اور ذکر مقامات عاشقاں ہو جس سے شوق و طلب میں زیادتی اور حضور دل حاصل ہوتا ہے تو ذوق و وجد حاصل ہونے میں کیا نقصان ہے،

یہ بھی ظاہر ہے کہ حسن صوت علی الاطلاق حرام یا مکروہ نہیں، یہ تو زمانۂ سلف میں خود ان حضرات سے ظاہر ہوا ہے تکملہ میں ایک حکایت آتی ہے کہ حضرات صوفیہ کی ایک جماعت حضرت غوث الثقلینؒ کی خدمت میں حاضر تھی کہ کسی قوال نے شعر پڑھا حضرت غوث پاک کو وجد آگیا اور پرواز شروع کردی وہاں سے اسی پرواز کے ساتھ اپنی خانقاہ میں تشریف لے آئے، یہ بھی منقول ہے کہ شیخ عزالدین عبدالسلام جو مذہب شافعی کے بڑے امام اور اکابر صوفیہ میں سے ہیں، اول اول مشرب درویشاں کا انکار فرماتے تھے، اور جب حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے واپس آئے تو شیخ عزالدین کی خدمت میں جاکر فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو سلام کہا ہے، شیخ عزالدین اتنی بات سنکر ایسے وجد میں آئے کہ خود سے بےخبر ہو گئے، اس کے بعد سے شیخ عزالدین کو حضرات صوفیہ سے ایسی عقیدت ہوئی کہ ان کی مجلس سماع میں خود حاضر ہونے لگے، یہ حکایت صحیح ہے، ثقات نے اس کو روایت کیا ہے، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ شیخ خود اس مجلس سماع کا انتظام فرماتے تھے یا ایسے دوسرے مشائخ کی مجلس میں تشریف لے جاتے تھے، جو اس زمانہ میں اہل سماع اور اہل صدق تھے، واللہ اعلم۔

شیخ الاسلام عبداللہ انصاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ذوالنون مصریؒ، شیخ شبلیؒ شیخ خزازؒ، شیخ نوریؒ اور شیخ دراجؒ سماع میں شریک ہوتے، ان کے علاوہ دوسرے مشائخ بھی شریک ہوتے تھے، کہ قرآن وغیر قرآن کا سماع ان کے یہاں برابر ہے۔

کتاب نفحات الانس میں درجۂ یقین کے ساتھ منقول ہے کہ بڑے بڑے مشائخ چشتیہؒ سماع کرتے تھے لیکن احتیاط کے ساتھ، تمام شرائط و آداب کا لحاظ رکھ کر، بلکہ بسا اوقات خلوت میں کہ نااہلوں اور غیروں سے اس کو بچاکر، منقول ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین اوشیؒ کے زمانہ میں درویش روزہ پر روزہ رکھتے اور ریاضت کرتے تھے اور مشائخ وغیرہ کے عرس کے موقعہ پر سماع سے شغل رکھتے مشہور رہے کہ خود حضرت خواجہ کی وفات اس ضعف و بیماری کی وجہ سے ہوئی جو مجلس سماع کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ امیر حسن دہلوی نے اسی قصہ کی طرف اپنی غزل میں اشارہ کیا ہے ؎

جاں بریں یک بیت دادست آں بزرگ | آرے ایں جوہر زکان دیگرست
کشتگانِ خنجرِ تسلیم را | ہر زماں از غیب جان دیگرست

یعنی اس بزرگ نے اسی ایک شعر پر جان دیدی، یقیناً یہ جوہر تو دوسری کان کا ہے، خنجر تسلیم کے شہیدوں کو غیب سے ہر وقت دوسری روح عطا ہوتی ہے۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ کہ اپنے وقت مشہور علما و عرفا میں سے تھے اور مشرب عشق و محبت و توحید رکھتے تھے اور سماع میں بھی کامل غلو تھا اس وقت کے علما نے ایک محضر نامہ تیار کر کے سلطان شمس الدین کے حکم سے تمام درویشوں کو سماع سے روک دیا تھا البتہ خلوت میں پوشیدہ طریقہ سے وہ یہ کام کرتے تھے، اس باب میں صوفیہ کے ملفوظات کی بے شمار حکایتیں موجود ہیں۔

مولانا برہان الدین بلخیؒ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالی سے امید ہے کہ روز محشر میں مجھ سے کسی گناہ کبیرہ کے بارے میں دریافت نہ فرمائے گا، کیونکہ میں نے کوئی کبیرہ گناہ نہیں کیا مگر صرف ایک گناہ ہے اور وہ چنگ و رباب کا سننا، کہ یہ میں نے بہت کیا ہے، اور اگر اب بھی مجھے میسر ہو جائے تو پھر بھی یہ کام کروں اس سے مولانا نے سماع پر اپنی فریفتگی اور اعتراف تقصیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ نے باب سماع اور اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ سبحان اللہ ایک تو جلا اور جل کر خاک ہو گیا اور دوسرا ابھی تک اختلاف کر رہا ہے۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے زمانہ میں اس کام نے دوسرے طریقہ سے رواج پایا، اور تغلق شاہ کے زمانہ میں بھی ان حضرات کے خلاف محضر نامے تیار کئے گئے، اور سابقہ محضر نامے جو قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے زمانہ میں تھے وہ بھی پیش کئے گئے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس کام میں تفصیل و تفریق سے کام لیا گیا، اور انکی مجالس میں باجے اور تالیاں بند ہو گئیں اور انہوں نے اپنے عقیدت مندوں کو اس سے منع کر دیا اور فرمایا کہ اگر کوئی اس میں مبتلا ہو تو اسے دائرۂ شریعت سے نہ نکلنا چاہئے، یہ کلام اس پر مبنی ہے کہ فقہی مسائل میں مذکور ہے کہ گانا سننے میں تو اختلاف ہے لیکن باجے تاشے بالاتفاق حرام ہیں۔

ایک مرتبہ امیر حسنؒ نے ان سے عرض کیا کہ یہ کمترین جب سماع کی آواز سنتا ہے تو اسی وقت دنیا و مافیہا سے غافل اور دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے، اور بجز یاد حق کچھ بھی نہیں رہتا، لیکن نماز میں یہ کیفیت حاصل نہیں ہوتی، کیا کیا جائے؟ انہوں نے فرمایا کہ نماز میں بھی یہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے، جب یہ مجلس سماع

میں جاتے تو آہ و بکا ان پر غالب آجاتی، لیکن ان کے رقص و وجد کی کوئی روایت نہیں ملی۔

حضرت شیخ نصیر الدین محمود رح جو بے انتہا متقی، محتاط اور حدود ظاہرہ کی رعایت کرنے والے بزرگ ہیں کہ تمام عمر علوم دینی کے درس و تدریس میں گزری ہے کبھی کبھی اگر سماع سنتے تو قوال وہ طالب علم و صوفیہ ہی ہوتے جو آپ کی خدمت میں لگے رہتے تھے، منقول ہے کہ ایک مرتبہ شیخ برہان الدین رح کے مکان پر مجلس سماع تھی جس میں مزامیر بھی تھے، شیخ نصیر الدین رح اس سے بچکر مجلس سے اٹھ آئے اور اپنے گھر چلے گئے، کسی نے کہا کہ آپ اپنے پیر کے طریقہ سے پھر گئے، فرمایا کہ پیر کا طریقہ حجت نہیں ہوتا۔ یہ بات سلطان المشائخ کو معلوم ہوئی تو فرمایا کہ انہوں نے بہت اچھا کیا، اور حق بھی وہی ہے جو وہ کر رہے ہیں، شیخ نصیر الدین رح کے سلسلہ سے منسلک حضرات سماع سے بے انتہا گریز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے فرمایا ہے کہ جو شخص بھی سماع کرے گا وہ میرے حلقہ بیعت سے خارج ہو جائیگا۔ واللہ اعلم بالصواب

تنبیہ :- یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ باب سماع میں مشائخ کے اقوال و افعال مختلف اور متعارض وارد ہوئے ہیں، اور تعارض و اختلاف کا تقاضا تردد اور شک ہے، اور کسی ایک جانب کو راجح کرنے کے لئے کوئی وجہ اور سبب ہونا چاہئے یہاں (ترک سماع کے) رجحان کے چند اسباب موجود ہیں، اول وقت کی بربادی و بیکاری نفس و شہوت کا استحکام، احکام شرع سے غفلت، نیت و عزیمت کا فقدان اور احسن و افضل کا اتباع اچھا اور بہتر ہے، اور یہ تو خارج از بحث بھی ہے کیونکہ جو کیفیت و حال ان پر طاری ہوتا ہے وہ بہائم کے حکم میں ہے کہ جس طرح جانوروں کے افعال و اعمال بے ضابطہ ہوتے ہیں اسی طرح ان کے بھی بلکہ اس سے بھی زیادہ گئے گزرے، دوسرے نفس پرست فرقہ ہے جو طاعت و عبادت کے ذوق، ذکر و تلاوت اور خلوت و مناجات کی لذت سے یکسر محروم ہے، بعض اپنی فطرت کی وجہ سے اور بعض اہل بطالت و راحت کی صحبت کی وجہ سے، چونکہ نغمہ سننے سے جو تحریک باطن اور جمعیت خاطر کا سبب ہے انہیں لذت و سرور حاصل ہوا تو یہیں سے دھوکہ کھا گئے اور اس حالت کو غنیمت سمجھ کر تسویل شیطانی کی وجہ سے عبادت و ریاضت کو اس پر ترجیح دینے لگے، اور اہل عبادت کے منکر ہو کر عشق کی لذت سے محروم ہو گئے، جس

کا یہ نتیجہ ہوا کہ روز بروز دین و دیانت کے طریقہ سے بیگانہ اور دور ہوتے گئے، اور جس حالت میں تھے اسی میں منہمک ہو گئے، ان کی نماز نشست و برخاست کے سوا کچھ بھی نہ رہی اور وہ ریا و تکلف کے طریقہ پر کہ مخلوق کا خوف اور ان کے طعن و تشنیع کا اندیشہ تھا، حتیٰ کہ یہاں تک معاملہ پہنچا کہ وہ بھی رفتہ رفتہ ہاتھ سے جاتی رہی، اگر ان کے نزدیک اچھی آواز کے ساتھ اچھی صورت بھی آجائے خصوصاً گانے والی عورتوں کی تو ان کی ماہیت علت صوری و مادی کی وجہ سے مکمل ہو جائے کہ اس سے بڑھ کر ذوق ہی حاصل نہ ہو، اور اگر کچھ مسکرات جن سے قوائے حیوانی میں تہیج پیدا ہوتا ہے ہاتھ لگ جائیں تو ایک قیامت برپا ہو جائے، پھر ایک وہ جماعت ہے جو اپنی خوش طبعی، سخن رسی، ذوق حکایات واشعار اور فرقۂ باطنیہ کے اسرار و رموز کے ساتھ متصف ہے، خود کو دنیا کا بڑا کامل و عارف اور مقتدا سمجھے ہوئے ہے، اور ان کا خیال ہے کہ ان کی حالت علماء وزہاد وغیرہ کی فہم سے بالاتر ہے، معاذ اللہ۔ کاش ان کا یہ حال معرفت ہرگز نہ ہوتا، اور اسی طرح خشک نماز روزہ ادا کرتے، اور اس عالم سے صورت ایمانی تو ساتھ لے جاتے، درحقیقت یہ جماعت بھی خارج از بحث اور ناقابل اعتبار ہے۔

اس مقام پر سب سے زیادہ قوی شبہ بزرگوں کی پیروی کا ہوتا ہے یعنی ہمارے بزرگوں نے جو کچھ کیا ہے ہم اسی کا اتباع کرتے ہیں، ان میں ایک ایسی جماعت ہے جو نہ احکام شریعت کو جانتی ہے اور نہ اقوال علما سے واقف ہے یہ تو جاہل ہے، اس کی تعلیم کا اہتمام کرنا چاہیئے، تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے، لیکن ایک فرقہ ہے وہ کہتا ہے کہ ہم کو شریعت سے کیا مطلب، ہم انہیں بزرگوں کے خوشہ چیں اور دامن پکڑنے والے ہیں، دوسری کیا چیز چاہیئے، یہ لوگ کافر ہیں، ان کو سزا دینی چاہیئے اور مرتد کا قانون نافذ کر کے قتل کر دینا چاہیئے۔

ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ ظاہراً سنت سے یونہی معلوم ہوتا ہے، لیکن بزرگوں کا اس کے خلاف عمل بے سند یا بے دلیل نہیں ہوگا اگر ہمیں اس کا علم نہیں، یہ تقلید کی بات ہے، ان سے یہ کہنا چاہیئے کہ بزرگوں نے غلبۂ حال اور مستی و بیخودی میں کیا ہے اور کلمہ گا ہے مصلحت وقت و تقاضائے حال کے مطابق تمام آداب و شرائط کا لحاظ رکھ کر کیا، اور اس فعل کو انہوں نے نہ اپنا طریق بنایا نہ دوسروں کو اس کا حکم دیا

اور ان بزرگوں جیسا ذوق وحال اور نیت ومصلحت اب کہاں ؟ ہاں اگر ان جیسے احوال وصفات تمہارے بھی ہوں اور تمہارے اور ان لوگوں کے اندر جو ان مجالس میں آئیں گے یہ تمام صفات مل جائیں تو مبارک ہو کہ اب تم واقعی بزرگوں کے متبع ہونے، واللہ خبیر بما تعملون۔

ایک جماعت اس کام کو احادیث واخبار سے ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ روش تکلف ہی تکلف ہے "تسعت الحیتہ" والی حدیث تو محدثین کے نزدیک غیر معتبر وموضوع ہے۔ اور وہ حدیث کہ دو لڑکیاں عید کے روز حضورؐ کے سامنے گا رہی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنے سابقۂ علمی سے یا اپنے اجتہاد و قیاس سے کہ لہو ولعب کی صورت ہے اس کی کراہت یا حرمت سمجھ کر منع فرمایا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بستر سے سر اٹھاکر فرمایا کہ اے ابوبکر چھوڑ دو آج عید کا دن ہے، یعنی اتنی مسرت عید وغیرہ کے موقعہ پر ظاہر کرنا جائز ہے، لہذا چھوڑ دو۔ گانا اور دف بجانا شادی بیاہ یا عید وغیرہ کے موقعہ پر دوسری بات ہے اور اس کا جواز ہے، لیکن اے اہل دنیا تمہارا کیا فائدہ، رہا ان دونوں لڑکیوں کے گانے کا قصہ تو وہ دو چھوٹی بچیاں اہل خانہ میں تھیں، جو ان واقعات کو جو اوس و خزرج کے درمیان پیش آئے تھے جیسی بھی انکی آواز تھی گا رہی تھیں، اور گانے والی تھیں نہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ وہ دونوں گا رہی تھیں اور گانے والی نہیں تھیں، زیادہ سے زیادہ اس حدیث سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ گانا علی الاطلاق حرام نہیں ہے تو یہ تو تسلیم ہے، لیکن یہ اجتماعات خاص، کیفیت مخصوص کے ساتھ کیسے ہیں۔

ایک فرقہ وہ ہے جس نے پیروں کے عمل کو محض بہانہ اور حیلہ بنا رکھا ہے، اگر وہ درحقیقت پیروں کے مرید ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان کی سماع وغیرہ کی روش پر عمل کرتے ہیں اور باقی تمام باتیں ترک کر دیتے ہیں۔ ع بدنام کنندہ نکو نامے چند۔ حاشا للہ۔ ان کو پیروں سے کیا نسبت اور پیروں کی ان کی طرف کیا توجہ وعنایت، پیر تو اہل حق وصادق ہیں۔ باطل پرستوں اور جھوٹوں سے کب راضی ہو سکتے ہیں۔ انکے فعل کا دار ومدار صرف نفسیات وتعصب پر ہے، حتیٰ کہ اگر کسی متشرع عالم کو دیکھ لیتے ہیں تو اسے چڑانے کے لئے اور زیادہ کرتے ہیں گویا وہ اس جماعت سے دشمنی اور دوسرا مذہب رکھتے ہیں۔

ہاں ایک اور جماعت مریداں ہے جس نے راہ سلوک میں قدم رکھ کر حضرات صوفیہ کے ساتھ تشبہ اختیار کی، اور لباس درویشی حسن نیت کے ساتھ پہنا، مشائخ کے معتقد اور ان جیسے احوال کے خواہاں ہوئے یہ بالکل انکار کرنے سے بھی ڈرتے ہیں کہ مبادا کوئی گستاخی ان بزرگوں کی شان میں نہ ہو جائے، اور اگر انکار نہیں کرتے بلکہ اجتناب کرتے ہیں تو اس سے بھی ڈرتے ہیں مبادا جو کچھ انہیں ان بزرگوں سے حاصل ہوا ہے اس سے بھی محروم نہ ہو جائیں، اور جس طرح اس باب میں موافقت نہیں کرتے دوسری باتوں میں موافقت کرتے ہیں ریاضت کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں اگر وجد نہ ہو تو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر حقیقت نہ ہو تو بہت مشابہت ہی اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ اگر عادت نہ کریں، غلو نہ کریں، احتیاط سے کام لیں اور تقویٰ نہ چھوڑیں تو بے شک درویش و ولی ہیں۔ جب کہ نفسانیت کی آمیزش سے پاک ہوں۔

لیکن اصحاب حال و ارباب معارف جو تکلف، تصنع اور نفسانیت سے بالکل پاک، دریائے وجد میں غوطہ زن اور مشرب سکر میں مستغرق ہیں وہ دوسرے ہی لوگ ہیں۔

ایک اور طبقہ ہے جو شائبۂ نفسانیت اور تقلب قلب سے پاک و صاف ہے اور صرف مقام صحو و تمکین میں مقیم ہے یہ تمام طبقوں اور جماعتوں سے بالاتر ہے، اور یہی سچی ہدایت اور راہ کامیابی پر ہیں۔ اللھم ارزقنا اتباعھم واسقنا من مشاربھم الماء المعین۔ وصلے اللہ تعالےٰ علےٰ سیدنا محمد وعلےٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

مکتوب نمبر ۷

بنام حضرت خواجہ محمد باقی رحمۃ اللہ علیہ

ورود الامداد —— بالاستقامۃ علی الاوراد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ. حکم بن عطاؒ سے منقول ہے فرمایا کہ جب تم کسی بندہ کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اوراد پڑھنے اور ان پر دوام کی توفیق عطا فرمائی ہے تو اللہ نے اس کو جو دیا ہوا ہے اسے حقیر نہ سمجھو اللہ تعالیٰ کے بندگان خاص دو قسم کے ہیں ۱ مقرب ۲ ابرار. مقرب وہ ہیں جو اپنے حظ وارادہ سے بھی نکل چکے ہوں، اور اللہ کے ارادہ و اختیار پر قائم ہوں، اور ابرار وہ ہیں جن میں تھوڑا بہت حظ وارادہ باقی ہو، اور بالکلیہ فنا وارد نہ ہوئی ہو. اللہ تعالےٰ نے ان کو عبادت و طاعت میں لگا دیا اور دنیا و آخرت میں بلند مراتب کے ساتھ مخصوص فرمایا یقیناً امداد نورانی و یقین ایمانی ان کے شامل حال ہے جو اس مقام کا تقاضا ہے، لہذا اے انسان جب تو کسی بندہ کو اس حال میں دیکھے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کو اعمال و اوراد میں لگا رکھا اور توفیق استقامت و دوام عطا فرما رکھی ہے تو اس کو نظر حقارت سے نہ دیکھ، اگرچہ عارفوں اور عاشقوں کی علامت اس کے چہرے پر نظر نہ آرہی ہو، اور یقین رکھ کہ اسکے باطن میں انجذاب کی آواز پیدا ہوئی ہے جو اس کے عبادت میں لگنے اور اس پر استقامت کا سبب بنی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی اور نور توفیق اس کا رہنما نہ ہوتا تو استقامت و دوام کی یہ صورت بھی ظاہر نہ ہوتی، اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو نہ ہم کو ہدایت ہوتی نہ روزہ و نماز کی توفیق، بلکہ جو شخص بھی حق تعالیٰ کے ساتھ کیسی ہی نسبت رکھے تو وہ تعلق و اختصاص کے کسی بھی درجہ کا مستحق ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر محبت و تعظیم کا یہ داعیہ اس کے دل میں پیدا نہ ہوتا تو وہ ہرگز دشمنوں پر ایثار نہ کرتا، لہذا وہ جتنی تعظیم و محبت باری تعالیٰ کی کرتا ہے

اتنی ہی اس کی تعظیم و محبت ہمارے اوپر لازم ہے۔ لا الہ الا اللہ کے اہل سب حق تعالیٰ سے نسبت رکھنے والے ہیں۔ ان کے ایمان کا ہتک حرمت اگرچہ وہ فاسق و بدکار ہوں جائز نہ ہوگا، حدیث لاتلعنوہ فانہ یحب اللہ ورسولہ (یعنی اسے برا نہ کہو کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے) اس کی دلیل ہے ہاں اگر وہ شریعت کی مقرر کردہ حدود کا ارتکاب کرتا ہے تو نیابۃً عن اللہ ورسولہ اس پر وہ حد جاری کر دی جائے کیونکہ اس نے خود اپنی نسبت کی عظمت و حرمت کو برقرار نہیں رکھا اور اپنی ذلت و ہلاکت پر خود اعانت کی، اور اہل خصوص پر بھی اقامت حد اس طرح ہونا چاہیئے کہ اس میں ہوائے نفسانی کو دخل یا حدود سے تجاوز نہ ہو، اور زبان کو ان پر لعن طعن اور گالی گلوچ سے محفوظ رکھنا چاہیئے تاکہ اپنے اوپر کسی ضرر کا اندیشہ نہ رہے، یہیں سے معلوم ہو گیا کہ بعض لوگوں کو بزرگوں پر اقامت حدود شرعیہ کی وجہ سے جو ضرر پہنچا ہے اس کا سبب اقامت حق نہیں ہے بلکہ تجاوز از حق ہے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھو اگرچہ وہ گناہگار اور نافرمان ہوں، اور ان پر حدود شرعیہ جاری کرو۔ اور ان سے ترک تعلق بھی کر سکتے ہو لیکن اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھ کر نہیں۔

عارفوں کی علامت اور عاشقوں کے چہروں کی رونق سے جس کا ذکر پہلے گزرا کیا مراد ہے تو یاد رکھو کہ عارفوں کی تین علامتیں ہیں، ۱۔ اپنی تمام توجہات صرف باری تعالیٰ پر منحصر کر دینا اس کی طلب میں بھی اور اس سے طلب کرنے میں بھی کسی حال میں بھی ان کی توجہ مخلوق پر نہیں ہوتی اور دوسروں پر نظر نہیں پڑتی نہ رد کرنے میں نہ قبول کرنے میں، ۲۔ اپنے مولیٰ کے سامنے ہمیشہ قلیل و کثیر میں اضطرار ظاہر کرنا چونکہ عارف کو اللہ کے سوا اپنے اور دوسروں کے عاجز ہونے کا ہر چیز میں یقین ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ اللہ کے سامنے ہی اضطرار ظاہر کرتا ہے۔ ۳۔ اسباب موجود نہ ہونے کے وقت پریشان نہ ہونا، عارف ہمیشہ سکون و راحت میں رہتا ہے، چونکہ اس نے خود کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے تو اللہ بھی اس کو دوسروں سے بے نیاز کر کے اس کے تمام امور کا خود ہی کفیل ہو گیا ہے، یہیں سے اس ولایت

کے معنی بھی معلوم ہو گئے جو قرآن کریم میں ہے ان ولیی اللہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین یعنی میرا ولی تو وہ اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی اور وہی تمام نیک بندوں کا متولی ہے۔

محبت عاشقاں کی بھی تین علامتیں ہیں ۱۔ دوام ذکر بوصف ایثار ۲۔ وجود شوق وتشنگی آہ وزاری کے ساتھ ۳۔ سب کچھ رضامندی محبوب وطلب قربت میں نثار کرنے کی ہمت، یہ تو باطنی احوال ہیں لیکن ان کے آثار وانوار حسن اخلاق وحسن اعمال کی صورت میں ظاہر میں بھی نظر آتے ہیں۔

دلائل الحب لایخفی علے احد   کحامل المسك لایخفی اذا عبقا

یعنی آثار محبت کسی سے چھپے نہیں رہ سکتے، جس طرح نافۂ مشک جب مہکنے لگے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتا

ابرار ومقربین میں سے ہر جماعت اللہ تعالیٰ کی خاص مدد وتوفیق کی مستحق ہے، لیکن ورود امداد استعداد وصلاحیت کے مطابق ہوتا ہے، بندہ کی تمام فتوحات، معرفت اور تجلی ربانی حتیٰ کہ دین ودنیا کے تمام فوائد صلاحیت و قابلیت کے مطابق ہیں۔

اس مقام پر جن چیزوں سے اپنے مقصود کا تعلق بیان کیا جاسکتا ہے وہ تین ہیں ۱۔ ماسوی اللہ کے اشتغال سے دل کا خالی ہونا اور یہ چیز طاعات وعبادات سے حاصل ہوتی ہے، کیونکہ تم اگر اپنے نفس کو اللہ کے کام میں مشغول نہ رکھو گے تو وہ تمہیں اپنے کام میں مشغول رکھے گا ۲۔ حق تعالیٰ کی محبت ومعرفت سے دل کو آباد کرنا، ذکر وفکر کے دوام اور نفس کو اس پر جمائے رکھنے سے یہ حاصل ہوجاتا ہے ۳۔ ان پر ثابت قدم اور دائم رہنا، حال غیر منفک کے ضبط اور بارگاہ قرب میں دوام حضور سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے۔

شیخ ابو محمد عبدالسلامؒ نے شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کو وصیت فرمائی کہ ایک بات اپنے اوپر لازم کرلو خواہشات کا چھوڑنا اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا دل میں جمانا محبت عاشق کو معشوق کے سوا کسی اور چیز میں مشغول ہونے کی اجازت نہیں دیتی اور مقصود یہ ہے کہ یہ محبت ہر کام کا سہارا اور ہر حال کا خلاصہ بن جائے۔ تاکہ اس کے تمام اعمال اس حقیقت سے جو اس کے دل سے پیدا ہوتی ہے صادر ہوں اور

کبھی انقطاع نہ ہوسکے، واللہ اعلم۔
صاحب حکم فرماتے ہیں کہ وارد تو آخرت میں پہنچے گا اور ورد اس دنیا کے ختم ہونے پر ختم ہو جائے گا۔ اور جس چیز کا وجود بدلتا نہ ہو اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ اچھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جزا اور ترتب ثواب کا محل آخرت ہے اور دنیا عمل وسعی کی جگہ ہے تجھے دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تو عمل کرے حق خدمت بجالائے اور مجاہدہ و ریاضت میں کوشش کرے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ یعنی ہم نے جنات اور انسانوں کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ عمل کے ثمرات و نتائج کے مشاہدہ کرنے کی جگہ وہاں ہے، دنیا میں اگر کچھ ظاہر ہو جائے تو وہ اس کا نمونہ ہے، اور عقلمند کو چاہیئے کہ وہ ایسی چیز کا اہتمام کرے جس کا وجود متخلف نہ ہوتا ہو، اور وہ ورود عمل ہے کہ اس دنیا کے فنا ہونے سے منقطع ہو جائے گا، کل کو قیامت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی حسرت نہیں ہوگی کہ کیوں دنیا میں عمل نہیں کیا، اور اگر کیا تو اس سے زیادہ کیوں نہیں کیا، حدیث میں ہے کہ جو وقت اللہ کی یاد کے بغیر گزرے گا تو وہ قیامت کے دن حسرت کا باعث ہوگا۔ حسن بصری ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسے حضرات دیکھے ہیں جو اپنے اوقات کی حفاظت و نگرانی اس سے بھی زیادہ کرتے تھے جتنی تم لوگ روپیہ پیسہ کی کرتے ہو یعنی جس طرح تم روپیہ پیسہ صرف اسی جگہ خرچ کرتے ہو جہاں تمہیں اس کا نفع ملے اسی طرح وہ حضرات اپنے اوقات کو صرف اسی عمل میں خرچ کرتے تھے جو ان کے لئے نافع ہو، اور ایک صادق آدمی جس بہترین جزا کا دنیا میں طالب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے مزید عمل کی توفیق اور اس کی تشنگی زیادہ۔ مشائخ نے فرمایا ہے کہ استقامت کے طلب گار ہو، کرامت کے طلب گار نہ ہو۔ کیونکہ حق تعالےٰ استقامت کا مطالبہ فرماتا ہے اور نفس کرامت کو تلاش کرتا ہے۔ اور پروردگار کے حق میں مشغول رہنا نفس کے حظ حاصل ہونے سے بہتر ہے، سلیمان دارانی ؒ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اس کا اختیار دیا جائے کہ جنت الفردوس میں داخل ہو جاؤ یا دو رکعت نماز ادا کرلو تو میں دو رکعت نماز پڑھنے کو اختیار کر دوں، کیوں کہ جنت میں تو حظ نفس ہوگا لیکن دو رکعت پڑھنے میں حق پروردگار ہیں سے معلوم ہوگیا کہ طالب کو چاہیئے کہ نماز پڑھنے میں

ذوق خدمت اور تعمیل حکم کی نیت کے علاوہ اور کسی چیز پر نظر نہ کرے اور نہ اجر و ثواب پر نظر کرے تاکہ حظ نفس اس کا مآل نہ ہو جائے۔ حدیث میں ہے کہ ایک قوم نہ جنت کی خواہاں ہوگی نہ جائے گی، صرف خدمت کو چاہے گی، تو ان کی گردن میں سونے کی زنجیر ڈال کر جنت کی طرف کھینچ لیا جائے گا۔

شیخ ابن عطاء اللہؒ صاحب الحکم، لطائف المنن میں شیخ ابوالعباسؒ اور شیخ ابوالحسنؒ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ہر قسم کی عبادتوں اور طاعتوں میں انوار ملکوت ودیعت فرمائے ہیں، اور جس شخص سے کسی قسم کی طاعت فوت ہو جاتی ہے تو اسی کے مطابق اس کا نور بھی جاتا رہتا ہے، لہذا جو بھی ہو سکے اس کے عمل میں غفلت نہ کرنا چاہیئے اور واردات کی وجہ سے اوراد سے مستغنی نہ ہونا چاہیئے، اور جس پر اس راہ کے دعویدار راضی ہو گئے ہیں تم کو اس پر اپنے لئے راضی نہ ہونا چاہیئے، کیونکہ اگرچہ ان کی زبان سے حقائق و معارف جاری ہیں لیکن دل اطاعت و عبادت کے انوار سے کورے ہیں، اور یاد رکھو کہ کسی بندہ سے طاعت و عبادت کا ادا ہو جانا اس کی کامرانی کا سبب ہے، اور جو شخص عبادات و معاملات میں شرائط و آداب پر قائم ہو گا تو اس پر ابواب غیوب کھل جائیں گے۔ انتہی

بندۂ حقیر عرض کرتا ہے کہ شیخ کی مراد غیوب سے وہ ہے جس پر غیب میں ایمان لایا جاتا ہے، ایسا فتح و کشف مبارک، باعث سعادت اور مطلوب سالکان ہے، ورنہ کشف کائنات جس سے یہ بات حاصل نہ ہو مقصود نہیں اور ایسا کشف تو آخر میں سالک کیلئے وبال بن سکتا ہے۔ نسال اللہ العافیۃ۔

شیخ ؒ نے فرمایا ہے کہ ہر افضل عمل جو سامنے آئے اور درجۂ صحت تک پہنچ چکا ہو اس پر کم از کم ایک بار عمل کر لو تاکہ تم بھی اس پر عمل کرنے والے بن جاؤ، بس اتنا ہی کافی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مکتوب نمبر ۸

بنام شیخ عبداللہ نیازی رحمۃ اللہ تعالیٰ

رعایۃ الانصاف والاعتدال فی اعتقاد الصوفیۃ من ارباب الاحوال

لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، (حمد و ثنا کے بعد) آپ کا مکتوب نصیحت اسلوب وصول ہوا، اور اس مکتوب کے ہمراہ جو مرآۃ الصفا کتاب آپ نے بھیجی ہے احقر اس سے بھی بہرہ مند ہوا، اور اس بات پر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا کہ اس زمانہ میں اب بھی ایسی جماعتیں ہیں جو سنت رسول کی اتباع کی ترغیب دے کر خود کو بھی اور دوسروں کو بھی بدعات و سئیات سے بچا رہی ہیں، لیکن اس مکتوب میں حضرات مشائخ صوفیہ کے باب میں رد و انکار میں غلو و افراط بھی نظر سے گزرا، بطور نصیحت و محبت راہ اعتدال کی طرف کہ وہی اصل کمال ہے تنبیہ کرتا ہوں،

یہ بات بالکل واضح ہے کہ صراط مستقیم اعتقاداً و عملاً سلف صالح کا راستہ ہے جو کتاب و سنت کے مطابق ہے، اور جو چیز کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو وہ باطل اور رد کر دینے کے لائق ہے، اور بعض صاحب حال بزرگوں کے وہ اقوال جو ان سے غلبۂ حال و بیخودی میں صادر ہوئے اور کتاب و سنت کے موافق نہیں وہ قابل اقتدا نہیں ہیں، فالحق احق ان یتبع یعنی حق کا اتباع کرنا ہی ضروری ہے اور فقراء و صوفیہ کے اس باب میں جو شطحیات پائے جاتے ہیں ان کے رد و انکار اور تشنیع و تقبیح میں توقف و سکوت کا طریقہ اختیار کرنا۔ اور انہیں ایسی باتوں کے صدور میں مغلوب و معذور سمجھنا چاہیئے۔

حدیث الدین النصیحۃ الخ "یعنی دین خیر خواہی کا نام ہے" کے ماتحت بعض علماء نے فرمایا ہے کہ عامۂ مسلمین کی خیر خواہی اس طرح ہے ان کی عزت و آبرو کی طرف سے مدافعت کرنا اور نفع و رفع کے تمام حالات میں ان کی مدد کرنا

خاصۂ مسلمین کی خیر خواہی یہ ہے کہ جائز امور میں ان کی اطاعت کرنا اور جن باتوں کا تعلق علم سے نہیں ہے ان میں علما کی تصدیق کرنا، اور جن باتوں کا انکار ضروری ہے ان کے علاوہ میں فقرا کی بات تسلیم کرنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ محل اشتباہ میں توقف ضروری ہے جس طرح محل وضوح میں جزم و یقین لازم ہے، کتاب فصوص الحکم کو اسی درجہ میں شمار کیا گیا ہے اور اس کے رد و قبول میں توقف کیا گیا اور اس کے مصنف پر طعن و تشنیع میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا جس طرح اس کے مبہمات و مشتبہات میں توقف کے بغیر اور کچھ نہیں کرتے، شیخ احمد زروق رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ میں رقمطراز ہیں کہ "شیخ ابو عبداللہ غوری" سے میری موجودگی میں دریافت کیا گیا کہ ابن عربی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ وہ ہر فن کو ہر اہل فن سے زیادہ جاننے والے ہیں، کہا گیا کہ ہمارے سوال کا یہ مقصود نہیں، فرمایا کہ ان کے بارے میں کفر سے لیکر قطبیت تک اختلاف علما ہے، پوچھا آپ کے نزدیک راجح کیا ہے۔ فرمایا کہ توقف و تسلیم"۔ میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ کفر کا معاملہ بڑا اخطرناک اور عظیم ہے اور بسا اوقات کہنے والے کی طرف راجع ہو جاتا ہے اس لئے توقف کیا۔ واللہ اعلم۔

اسی کتاب میں یہ بھی تحریر ہے کہ "علم کا دار و مدار تحقیق و بحث پر ہے اور حال کا دار و مدار توقف و تسلیم اور تصدیق پر۔ جب عارف علمی حیثیت سے کلام کرتا ہے تو اس کی نظر اس کے ماخذ یعنی کتاب و سنت اور آثار سلف کی طرف ہوتی ہے کیونکہ علم کا اعتبار اس کی اصل سے ہوتا ہے، اور جب حال کے اعتبار سے کلام کرتا ہے تو اس کے ذوق میں تسلیم و انقیاد آجاتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی، لہذا اس کا دار و مدار ذوق عرفان صاحب حال پر اور اس کی امانت کے اعتقاد پر ہوتا ہے۔ پھر یہ حال قابل اقتدا بھی نہیں ہوتا مگر اسی جیسے کے حق میں کیونکہ اس کا حکم عام نہیں ہے۔

اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ فرع کا دار و مدار اس کی اصل اور ضابطہ پر ہوتا ہے اگر اس کے موافق ہو تو مقبول ورنہ اس کے مدعی پر رد ہے اگر وہ اہل ہے، ورنہ

قابل تاویل ہے یا قابل سکوت۔ اگر وہ علم و دیانت میں عظیم القدر رہے، پھر اصل وضابطہ میں اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ فاسد کا فساد خود اسی کی طرف راجع ہوتا ہے اور اچھی چیز کی اچھائی میں اثر انداز نہیں ہوتا۔ لہذا حد سے گزر جانے والے صوفیہ جیسے اہل اصول میں اصحاب ہوی اور بعض فقیہ نما جاہلوں کا قول انہیں پر رد کر دیا جائے گا اور ان کا عمل اختیار نہ کیا جائے گا اور ان کی نسبت کی وجہ سے مذہب حق کو نہ چھوڑا جائے گا واللہ اعلم۔

یہ بھی فرمایا ہے کہ جو کلام ان کے دلوں میں ڈالا گیا اس کا انکار کرنے والا اور نہ سمجھنے والا معذور رہے اور ضعف و تقصیر و سلامتی کی وجہ سے اس نے اپنی حالت کو بچا لیا۔ اس کا ایمان خائفین کا سا ہے، اور جس نے کچھ سمجھ لیا تو یہ اس کی قوت ایمانی اور دائرۂ علمی کی وسعت کا اثر ہے۔

اور فرمایا کہ محل اشتباہ میں توقف مطلوب ہے جس طرح ایسی جگہ میں جہاں خیر یا شر واضح ہو چکا ہو توقف مذموم ہے، اور طریق سلوک کا دارومدار دلیل کے وقت حسن ظن کو ترجیح دینے پر ہے اگرچہ کوئی معارض موجود ہو، اور فرمایا کہ بعض لوگوں کا اجتہاد جس بات کو بتا دے وہ اس پر جزم کر لیتے ہیں، اور باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کی ایک جماعت میں شدید اختلاف ہے جیسے ابن الفارضؒ، ابن جلاد العفیفؒ، ابن دوامسکینؒ، ابن اسحٰقؒ تستریؒ، ابن سبعینؒ اور حاتمیؒ یعنی شیخ ابن عربی۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ شیخ ابن عربیؒ کی شان میں یہ اچھا سمجھتے ہیں کہ انکی ولایت کا اعتقاد رکھا جائے لیکن ان کی کتابیں دیکھنا حرام ہیں، ان کی کتابیں دیکھنے کی حرمت خود ان کا بھی مسلک ہے، فرماتے ہیں کہ ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہیں مگر ایسے ایسے شخص کو۔

فرماتے ہیں کہ علامہ مجدالدین فیروزآبادیؒ صاحب قاموس وغیرہ نے شیخ ابن عربیؒ کی مدح و تعظیم میں مبالغہ سے کام لیا ہے، اور ان سے اعتراضات وغیرہ دور کرنے کے لئے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی ہے اور ان کے مقامات و مناقب بیان کئے ہیں، لیکن شیخ احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس، اور اس جیسی کتابوں کے اندر

شکر لپیٹا ہوا زہر ہے، ان کتابوں کی واضح باتوں سے محظوظ ہونا اور مبہم باتوں میں غور و خوض نہ کرنا چاہیئے، اور ان کے فوائد سے بالکل محروم بھی نہ ہونا چاہیئے اور نہ محفل اغیار میں نقل کرنا چاہیئے، اور لوگوں نے اس کتاب کی تردید و اثبات میں جو رسالے لکھے ہیں وہ بھی دیکھنے چاہئیں کہ کیا طرز رکھا گیا ہے اور کونسی جانب کو غالب کیا گیا ہے، انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس کتاب کے بعض مواقع سے جو ظاہراً سمجھ میں آرہا ہے وہ بھی محل تردد ہے اور جس کو اپنے ایمان و اسلام کا فکر ہے وہ ان مقامات کی تقلید و اعتقاد سے دور بھاگتا ہے، اور ان کی مراد کو تو اللہ ہی جان سکتا ہے، لہٰذا فی الحال جو انکار ہے وہ اس کا ہے جو ظاہراً عبارت سے مفہوم ہوا اور ہماری سمجھ میں آیا ہے نہ ان کے قصد و ارادہ کا اور جو ان کی مراد ہے وہ یقیناً فاسد و منکر نہ ہوگی، درحقیقت اس پر فقہا کا انکار دوسرے طریقہ پر ہے اور فقرا کا دوسرے۔

اور فصوص الحکم کا طریق تو ایک خاص طریق ہے حضرات صوفیا کے تصوف و مذہب کا دارو مدار اسی پر نہیں ہے، صوفیا کا متفقہ طریق کتاب قوت القلوب رسالہ قشیریہ، منازل السائرین، تعرف اور عوارف وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے، اور اس بزرگ جماعت کے اعتقاد و محبت اور ان کے طریق قویم کی ترغیب دی گئی ہے، اور اسی کو مراتب ولایت میں داخل اور باعث سعادت شمار کیا گیا ہے، حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ ہمارے اس طریق پر یقین رکھنا ہی ولایت ہے، اب اگر بعض طریق جو مخالفِ کتاب و سنت نہ ہوں بلکہ ان کا ماخذ قواعد دین اور اصول شریعت ہوں اور حضرات مشائخ کی طرف منسوب ہوں تو ان کے بطلان کا یقین اور رد و انکار پر اصرار کرنا انصاف اور علم کے خلاف ہے اور جو توجیہات دستار خلافت، تعمیر خانقاہ یا مشائخ کی دیگر مستحسن چیزوں کے بارے میں کرتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عوام کا فعل تو ہر جگہ ناقص و منکر ہوتا ہے خصوصاً ایسے مواقع میں جن کی اصل سند میں ضعف ہو، البتہ جو فعل محققین و خواص کا ہے وہ ان منکرات سے بالاتر ہے، ان تمام باتوں کے باوجود جس جانب تقویٰ کی رعایت ہو اس کا اختیار کرنا وقت کی ضرورت اور اسکے خلاف سے گریز کرنا لازم ہے۔ فرقہ اباحیہ کے ناپسندیدہ طریقہ کے مطابق نہیں کہ

دعویٰ تو تصوف کا کرتے ہیں لیکن اعتقاد وعمل میں تقویٰ کی راہ بالکل اختیار نہیں کرتے نہ کتاب وسنت سے تمسک کرتے ہیں نہ احکام و دیانات اسلام کی طرف نظر اٹھاتے ہیں، ممکن ہے کہ آپ نے اپنے مکتوب میں جو صوفیہ فصوصیہ تحریر فرمایا ہے اس سے یہی جماعت مراد ہو، ورنہ صوفیا کا تو مرتبہ عظیم اور مسلک مستقیم ہے اور طعن وتشنیع کے لئے ان کا ذکر بہت برا، درحقیقت اس کو زمرۂ صوفیا میں سمجھنا ہی نہیں چاہیئے، محققین نے ایسی جماعت کا نام حشویہ اور باطنیہ رکھا ہے، باقی اپنے مکتوب میں آپ نے جو افادہ فرمایا ہے وہ عین خیر خواہی وشفقت ہے، دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ بزرگوں کی توجہ سے ہم عاجزوں کے کاموں میں استقامت اور قید نفس سے آزادی عطا فرمائیں کہ یہ سب سے زیادہ کثیف حجاب اور راہ سلوک میں بڑا مانع ہے، اور کتاب و سنت اور بزرگوں کی محبت پر استقامت عطا فرمائیں۔

انہ ولی الھدایۃ والتوفیق وبہ نستعین

مکتوب نمبر ۹

بنام شیخ عبداللہ نیازی قدس سرہ

العبارات الفصیحۃ فی شرح قولہ علیہ السلام الدین النصیحۃ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ۲ الدین النصیحۃ قالوا لمن یارسول اللہ قال للہ ولرسولہ ولکتابہ وعامۃ المسلمین وخاصتھم۔ (بخاری ومسلم) یعنی آپؐ نے فرمایا کہ دین تو نصیحت وخیر خواہی ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ کس کے لئے یارسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے لئے، رسول کے لئے کتاب اللہ کے لئے، عام مسلمانوں کے لئے اور خاص مسلمانوں کے لئے۔

یہ فرمان رسولؐ جوامع الکلم میں سے ہے کہ اس کے اجمال میں تمام علوم دین داخل ہیں۔ اگر دنیا کے تمام علما کی عمریں بقدر امکان طویل مان لی جائیں اور وہ اس فرمان کے علوم کو بیان کرنے لگیں تو اس کے ایک جزو کو مکمل بیان نہیں کر سکتے، جس نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ اپنے علمی اندازہ ووسعت کے اعتبار سے کہا ہے۔

جوامع الکلم اس حدیث کو کہتے ہیں کہ جس کے قلیل الفاظ نہایت اختصار کے ساتھ ہوں لیکن کثیر معانی کو جامع ہوں، کلام کی یہ تقسیم صرف نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ساتھ مخصوص ہے اور آپ کی نبوت کے دلائل میں سے ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جوامع الکلم عطا فرمائے ہیں جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور میں حسن وجمال کے دقائق ادراک انسانی سے بالاتر ہیں اسی طرح آپ کے کلام معجز نما کے اسرار وحقائق دائرۂ عقل وفہم سے خارج ہے

درد ل ہر امتی کز حق مزہ است روے وآواز پیمبر معجزہ است

یعنی ہر اس امتی کے دل میں جو حق سے بہرہ ور ہے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے چہرۂ انور اور آپ کے کلام میں معجزہ ہے۔

"الدین النصیحۃ" لغت میں نصیحت کے معنی خالص اور بے غل وغش ہونے، اور سچائی کے قدم پر کھڑے ہونے کے ہیں۔ آنحضورؐ فرماتے ہیں کہ دین نصیحت ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یہ نصیحت جس کا آپ حکم فرما رہے ہیں اور دین کو اسی میں منحصر فرما رہے ہیں کس کے لئے ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ کے لئے۔ رسول کے لئے، قرآن کے لئے، عام اور خاص مسلمانوں کے لئے ہے۔ یعنی جس حق کا ادا کرنا اور جس ادب کی رعایت کرنا ان سب کا حق ہے اگر اسے ادا کروگے تو علیٰ حسب مراتب دیندار ہو جاؤ گے، اب دیکھو کہ دین کا کونسا علم اس مفہوم سے خارج ہوگا۔ کیونکہ علم کا تعلق یا تو مرتبۂ الوہیت سے ہوگا یا مقام نبوت و شریعت سے، اس سے زیادہ مختصر عبارت یہ ہے کہ علم کا تعلق یا تو خالق کے ساتھ ہوگا یا مخلوق کے ساتھ جو بھی ہو اس سے باہر نہیں۔ ہم مختصر نمونے اور مثال کے ساتھ ان مقاصد کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ تفصیل کی نہ کوئی حد ہے نہ کسی میں بیان کرنے کی طاقت۔

جب یہ گفتگو علم و فقہ کی طرف پہنچ گئی تو توجہ و اعتنا کے ساتھ اسے سننا لازم ہے "نصیحت للہ" سے مراد اس کی ذات وصفات کی معرفت۔ اوامر و نواہی کا اتباع، دین کی نصرت اور اس کے احکام کی اطاعت ہے، اوامر و نواہی وہ احکام شرعیہ ہیں جن کا بندوں کو مکلف بنایا ہے اور انہیں "کرو" "مت کرو" کے دائرہ میں گھیر رکھا ہے، ان میں سے پانچ چیزیں دار و مدار دین ہیں اور بنیاد مسلمانی ان پر قائم ہے کہ دین کی عمارت بغیر ان کے تیار نہیں ہو سکتی اور پکا مسلمان وہ ہے جو ان کے شرائط و آداب کی رعایت کرتے ہوئے دوام و استقامت کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ اور دین کی مدد راہ حق میں جہاد کرنے، اعلائے کلمۃ اللہ کی نیت سے دشمنان دین سے معرکۂ کارزار گرم کرنے، امر معروف و نہی منکر کے قدم پر قائم رہنے اور نفسانیت و خواہشات نفس کے شائبہ کے بغیر اس سے عہدہ برآ ہونے میں ہے نصرت دین میں ان اسباب کا اختیار کرنا بھی داخل ہے جن پر دین کا بقا و تقویت موقوف ہے، اور وہ دو ہیں ایک علم دوسرے عمل علم سے مراد کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کا علم ہے اور وہ علوم بھی اسی میں داخل ہیں جو کتاب و سنت میں

معاون ہوں، جیسے علم وصرف ونحو اور علوم دینیہ وقواعد ادبیہ ؎

علم دیں فقہ است وتفسیر وحدیث ہر کہ خواند غیر ایں گردد خبیث

یعنی علم دین فقہ وتفسیر وحدیث ہے، اس کے علاوہ دوسرے علوم حاصل کرنے والا خبیث ہے۔ اور عمل کہتے ہیں اس علم پر کاربند ہونا، کیونکہ علم بغیر عمل کے فائدہ مند نہیں ہوتا اگرچہ جوہر علم کی نفاست موجود ہو۔ اور صنعت وحرفت کے اصول کا علم بھی اس میں داخل ہے جیسے زراعت وخیاطت وپارچہ بافی وغیرہ کیونکہ دین وملت کا بقا بلکہ عالم کے اہم امور بمقتضائے حکمت اس کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے، حدیث میں جو آیا ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے تو اکثر علما نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اجتہادات ومذاہب کا اختلاف کہ اس سے دین میں آسانی اور وسعت پیدا ہوگئی مراد ہے، اور بعض علما نے اس حدیث کو حرفت وصنعت کے اختلاف پر محمول کیا ہے، لیکن اس سے اگر عام مراد لیا جائے تاکہ دونوں قسموں کو شامل ہو جائے تو بہتر ہے۔

اور احکام الٰہی کے سامنے سر جھکا دینے سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ارادیہ وقہریہ جو بمقتضائے قضا وقدر ہوتے ہیں ان پر راضی ہونا، اور اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دینا، اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین یعنی جب ان سے پروردگار نے فرمایا کہ مطیع ہو جاؤ تو کہنے لگے کہ میں رب العالمین کے سامنے مطیع ہوں، اللہ تعالیٰ کے احکام واوامر دو قسم کے ہیں (۱) احکام شرعیہ تکلیفیہ ان کا وظیفہ یہ ہے کہ اطاعت وتعمیل حکم کی جائے، (۲) احکام ارادیہ قہریہ ان میں رضا وتسلیم شان بندگی ہے، مسلمانی کے بس یہی دو جزو ہیں۔ درحقیقت حوادث ومصائب کے نازل کرنے میں حق تعالیٰ کی حکمت بندہ کا اپنے (عجز) کو پہچان لینا، اور اس کو بندۂ عارف بنانا ہے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ یہاں کسی اور کی قدرت ہے جو دوسری تمام قدرتوں سے بالاتر ہے اور دوسری قدرتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ تعرف کبھی شان لطف سے ہوتا ہے کبھی صورت قہر سے، دوسری صورت سے بھی چونکہ قرب ومعرفت کی نعمت حاصل ہوتی ہے تو نظر برحقیقت اسے بھی لطف کہہ دیتے ہیں، اول کو لطف ظاہر اور دوسرے

کو لطف خفی نظر بہ باطن، ورنہ دونوں صورتوں میں لطف بھی ہے قہر بھی ایک میں لطف ظاہر ہے اور قہر خفی اور دوسری میں قہر ظاہر ہے اور لطف خفی ؎

عاشقم بر لطف و بر قہرش بجد — اے عجب من عاشقِ ایں ہر دو ضد

یعنی میں اس کے لطف و قہر دونوں کا حقیقۃً عاشق ہوں۔ حیرت ہے کہ ان دونوں ضدوں کا میں عاشق ہو گیا۔ اس مضمون کو رسالہ تسلیۃ المصاب میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

"نصیحت لرسول اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب و تعظیم اور محبت و اطاعت کا ہونا آپ کو اور تمام انبیائے کرامؑ کو ہر اس عیب و نقص سے پاک سمجھنا جو شانِ نبوت و رسالت کے خلاف ہو، آپ کے ادب و احترام کا ضابطہ یہ ہے کہ مرتبۂ الوہیت اور صفاتِ خداوندی کے علاوہ تمام مناقب و کمالات آپ کے لئے ثابت ہیں ؎

مخواں او را خدا از بہرِ امرِ شرع و حفظِ دیں
دگر ہر وصف کش میخواہی اندر مدحش املا کن

یعنی دین و شریعت کی حفاظت کی وجہ سے آپ کو خدا تو نہ کہو، اس کے علاوہ جو وصف و کمال تم چاہو آپ کی مدح میں ثابت کرو۔ تمام صوری و معنوی کمالات "عبدہٗ و رسولہٗ" میں داخل ہیں، عبودیت خاصہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے کہ آپ کے علاوہ بندۂ حقیقی کوئی نہیں ہو سکتا، خدا خدا ہے اور آپ بندہ، دوسرے تمام بندے آپ ہی کے طفیلی ہیں، اور عبادات و عادات و اعتقادات میں آپ کی سنت کی اتباع لازم ہے کیونکہ جو کچھ بھی آپ کی سنت کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔ اور تمام وہ ایجاد کردہ اور ایجاد کی جانے والی چیزیں جن سے سنت میں تغیر و مخالفت لازم آتی ہو ضلالت و قابلِ رد ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو ہمارے اس دین میں ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے" اور فرمایا "ہر نئی چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے" صوفیا کا قول ہے کہ جو دل گرفتارِ بدعت ہے اس میں ہرگز نورِ ولایت نہیں داخل ہو سکتا۔

دوسرے ہر اس چیز سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھتی ہے چاہے

چھوٹی ہو یا بڑی جیسے علما، صلحا. دیار و بلاد وغیرہ سے محبت رکھنا خصوصًا اہلبیت اطہار کی تعظیم کرنا، ان کی ایذا سے بچنا، ان کی لغزشوں سے قطع نظر کرنا، ان کے جوہر کی پاکیزگی کا قائل ہونا، ان کے عیب وتنقیص و اہانت سے دل وزبان کو محفوظ رکھنا اور دل کو ان کی محبت سے پُر رکھنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ یعنی آپ فرما دیجئے کہ میں اس تبلیغ پر تم سے بجز اس کے کہ اہل بیت سے محبت رکھنا، اور کچھ اجر طلب نہیں کرتا، اگرچہ یہ اہل بیت احکام شرعیہ و اقامت حقوق دینیہ میں دوسری تمام مخلوق کے شریک ہیں. اور اوامر ونواہی کے دائرہ سے باہر نہیں. درحقیقت فضیلت کا دارو مدار تقوی پر ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (یعنی اللہ کے دربار میں وہی زیادہ عزت والا ہے جو متقی ہو) قضیۂ کلیہ ہے، البتہ ان پر حدود شرعیہ جاری کرتے وقت اپنے آپ کو نائب محض اور امین مطلق سمجھا جائے. اور آنحضورؐ سے ان کے انتساب کی عظمت کو پس پشت نہ ڈالا جائے. جس طرح بندہ اپنے مولیٰ کے حکم کی بجاآوری میں اپنے فرزند کو مارتا ہے تو اپنے آپ کو درمیان میں نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کے فرمان کے مطابق عمل کرتا ہے اور زبان ودل کو اہانت وغیرہ سے محفوظ رکھتا ہے، اسی طرح اقامت حدود میں اہل اللہ کے ساتھ معاملہ کیا جائے بلکہ تمام مسلمانوں کے ساتھ ان کی حرمت ایمانی کا لحاظ رکھا جائے، افراط وتفریط میں بڑے اندیشے ہیں، یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وجہ سے آپ کے اہل بیت کی قدر ومنزلت بارگاہ خداوندی میں بہت بالا ہے، اس سے امید ہے کہ حق تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے گا اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت ان کے حق میں قبول فرمائے گا، لیکن اہل بیت کو بھی چاہیئے کہ تبلیغ دین و اختیار تقویٰ میں تمام امت سے پیش پیش رہیں کہ شریعت کی حمایت و رعایت دوسروں کے مقابلہ میں ان پر زیادہ ہے۔

"نصیحت لرسول اللہؐ" میں تیسری چیز یہ ہے کہ ان کی امت پر رحم وشفقت ہو۔ اور ان کے حقوق کی رعایت، ان کی امداد و اعانت اور حقوق فرض کفایہ پر جیسے سلام کرنا، عیادت کرنا، نماز جنازہ وغیرہ پڑھنا، عمل ہو، حرفت وصنعت

کا قیام کہ دین کی اہم باتیں اس پر موقوف ہیں، حکومت، عدالت اور فتویٰ کا انتظام اقامت سنت کی نیت سے یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

"نصیحت لکتاب اللہ" سے مراد قرآن کریم کی تعظیم، اس پر عمل، اس کے معانی و آیات میں غور و فکر اور اس سے متعلق علوم کی تحصیل ہے، طہارت، خوش آوازی اور حضور قلب کے ساتھ اس کی تلاوت کی پابندی بھی کتاب اللہ کے حقوق میں سے ہے، علما نے فرمایا ہے کہ جس نے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں ختم قرآن نہیں کیا تو قیامت کے روز قرآن اس سے جھگڑا کرے گا اور اس کا فریق مخالف بن جائے گا، بعض علما نے چالیس دن فرمایا ہے، اسلاف میں ایسی بھی ہستیاں تھیں جو یومیہ ایک قرآن کریم ختم کرتی تھیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قرآنی حقوق میں سے اپنی طرف سے بے سند تفسیر کرنا اور سلف کی منقول باتوں کا ترک کر دینا بھی ہے۔ جیسے کہ اس زمانہ کے بعض جاہل کر رہے ہیں اور اسے تفسیر قرآن کہتے ہیں۔ حالانکہ معلوم نہیں کہ حدیث میں ہے جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی وہ کافر ہو گیا۔ معاذ اللہ۔

"نصیحت لعامۃ المسلمین" کا مطلب ہے ان کے حقوق کی رعایت۔ ان کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت، انہیں حقارت سے نہ دیکھنا، ان کی ایذا رسانی سے دست و زبان کو روکنا، ان کے واجبی حقوق کو کامل طریقہ سے ادا کرنا اور بطریق مشروع ان کی نصرت و اعانت کرنا، حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ مظلوم کی مدد تو ممکن ہے ظالم کی مدد کس طرح ہو گی۔ آپ نے فرمایا کہ ظلم کرنے سے اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ جہاد، سرائے بنانا اور امر معروف و نہی منکر وغیرہ بھی اسی میں داخل ہیں۔ نصیحت عامۂ مسلمین میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کی عقل و صلاحیت کے مطابق ان سے کلام کیا جائے۔ حقائق و معارف سے متعلق ان سے کلام نہ کیا جائے اسرار و رموز ان کے سامنے حل کرنا ان کو گمراہ کر دینا ہے۔ علما کے اختلافات اور ان کے اقوال عام لوگوں کے سامنے ذکر کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

"نصیحت خواص مسلمین" خواص مسلمین کی تین قسمیں ہیں، اول بادشاہ، اور اہل حکومت

ان کی اطاعت اور ان کا محکوم ہونا جب کہ یہ خدا و رسول کے حکم کے خلاف حکم نہ دیں مذہب اسلام میں واجب ہے، قرآن کریم میں ہے کہ "اے ایمان والو اللہ کی اس کے رسول کی اور اپنے میں سے اہل حکومت کی اطاعت کرو" حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سوید بن عقلہؓ صحابی سے فرمایا کہ "اے سوید! ممکن ہے کہ تم پھر مجھے نہ دیکھ سکو لہٰذا میں تمہیں تقویٰ کی اور امیر کی اطاعت کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ وہ امیر حبشی غلام ہو۔" آپ نے اطاعت امیر کو علی وجہ المبالغہ اس طرح بیان فرمادیا ورنہ غلام اس کا اہل نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ امراء و حکام کی اطاعت جب مخالف حکم خدا و رسول نہ ہو فرض ہے۔ ہاں اکراہ کی صورت میں کچھ گنجائش ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مرد اپنے گھر کا، باپ اپنی اولاد کا، استاد اپنے شاگردوں کا اور ہر بڑا اپنے چھوٹوں کا امیر ہے، ان پر اس کی اطاعت ضروری ہے اور اس پر ان کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرنا۔ حدیث شریف میں ہے کہ "تم میں سے ہر ایک نگراں اور ذمہ دار ہے اور قیامت میں اس سے ان ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا" حتیٰ کہ ہر آدمی اپنے اعضاء و جوارح کا امیر ہے اور دست و زبان وغیرہ اس کے ماتحت، قیامت کے دن اسکے ان ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور یہ اعضاء وغیرہ بارگاہ رب العزت میں اسکے خلاف دادخواہی کرینگے۔

دوسری قسم علمائے کرام ہیں، ان کی تعظیم اور دینی معاملات میں ان کے ان اقوال کی جو کتاب و سنت کے موافق ہوں تصدیق کرنا اور اطاعت کرنا واجب ہے، البتہ جو باتیں وہ خلاف کتاب و سنت اپنی خواہش نفس، دنیا طلبی اور فتنہ انگیزی کے طور پر کہیں وہاں اطاعت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ "علما انبیائے کرامؑ کے وارث ہیں جب کہ وہ دنیا کی طرف مائل نہ ہوں، اور بادشاہوں کے پاس (دنیا طلبی کیلئے) نہ جائیں اگر وہ دنیا کی طرف مائل ہو گئے اور بادشاہوں کے پاس جانے لگے تو ان سے ڈرنا کیونکہ وہ دین کے لٹیرے ہوگئے۔" دنیا کی طرف مائل ہونے اور بادشاہوں سے خلط ملط رکھنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ دنیا کی وجہ سے دین فروشی کرنے لگے۔ اور غلط فتوے دینے لگیں، لیکن اگر دین کی سربلندی و ترویج اور مسلمانوں کی امداد و اعانت اور حق کی تقویت وغیرہ کی وجہ سے بادشاہوں سے ملتے ہیں تو یہ خود اچھا کام ہے۔

تیسری قسم مشائخ طریقت ہیں۔ جو علم پر عمل کرنے، سچائی اختیار کرنے، سنت کا

اتباع کرنے، حق تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے اور غیر خدا سے اعراض کرنے کے باعث فضیلت و کمال میں ممتاز ہیں، اس جماعت کے محققین اور کاملین جو شریعت و طریقت دونوں کے جامع ہیں احوال باطن اور اسرار حقیقت کے بارے میں جو کچھ وہ کہیں اس کی تصدیق ضروری ہے اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ان کی جو بات بلاشبہ شریعت کے مخالف ہو اس کا انکار ضروری ہے۔ اور جو بات مشتبہ ہو تو اس میں توقف کرنا چاہیئے بشرطیکہ وہ بات ایسے بزرگ کی ہو جو علم و عمل اور ورع و تقویٰ میں امام کی حیثیت رکھتا ہو، اور اس کے قول و فعل کی مناسب تاویل کر لینا اچھا ہے، لیکن اگر مصلحت شرعی کا تقاضا اس کی تردید ہی ہو تاکہ عوام کو گمراہی سے بچا سکیں تو دوسری بات ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ ولی لغزشوں اور گناہوں سے معصوم نہیں ہوتا۔ ہاں گناہوں پر اصرار اور جمے رہنے سے محفوظ ہوتا ہے۔" انبیا معصوم ہوتے ہیں اور اولیا محفوظ" کا یہی مطلب ہے، عصمت صدور معصیت سے پہلے ہوتی ہے اور حفاظت اسکے صدور کے بعد اس جماعت سے غلبۂ حال وسکر کی وجہ سے جو ایسی باتیں صادر ہوئی ہیں جو ظاہر شریعت کے خلاف ہیں تو حکایت کی صحت کے بعد مناسب راہ یہ ہے کہ یا تو توجیہ و تطبیق سے کام لیا جائے یا سکوت و تسلیم سے، لیکن کسی حال میں اتباع نہیں کیا جائے گا۔ اتباع واضح چیزوں میں کیا جاتا ہے نہ کہ مبہم اور موہم چیزوں میں، اور صاحب حال اگر بے اختیار ہو تو معذور ہے اور اس کا منکر علم شریعت کی وجہ سے وہ بھی معذور، اور بر تقدیر اشتباہ اس میں سکوت و توقف احتیاط و انصاف کے قریب ہے۔ اس باب میں بڑا طویل کلام ہے رسالہ مرج البحرین میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ وصلی اللہ علی السید الھادی الی الصراط المستقیم محمد و علیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

مکتوب نمبر ۱۰

بنام شیخ عبداللہ نیازی رحمۃ اللہ علیہ

اقامۃ المراسم فی اعمال المواسم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ حضرات محدثین رح کے یہاں ایسی روایت کو جو صحیح وثابت ہو عمل کے لئے اختیار کرتے ہیں یا حدیث ضعیف پر فضائل اعمال کے باب میں جواز عمل کے قائل ہیں خصوصاً اگر وہ روایت ضعیف متعدد طرق سے ثابت ہو تو پھر اشکال نہیں رہتا، حضرات فقہا معنی وعلت کا اعتبار کرتے ہیں۔ ہاں اگر نص صریح اس کے خلاف ہو تو پھر قیاس کو ترک کر دیتے ہیں جیسے بحث قیاس میں مذکور ہے مہینہ اور ہفتہ کے ایام لیل ونہار میں کوئی خاص نماز کا وجود حضرات محدثین کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ بلکہ اس باب میں وارد شدہ روایات پر موضوع وباطل ہونے کا حکم لگایا ہے، صلوٰۃ رغائب جو رجب کی اول شب جمعہ میں پڑھی جاتی ہے۔ حضرات مشائخ کے یہاں تو مشہور ہے لیکن حضرات محدثین کے یہاں موضوع وباطل ہے، اور اس سے منع وتشنیع میں سخت تشدید فرمائی ہے، اور جو روایت اس باب میں نقل کرتے ہیں وہ مطعون ہے۔ اور جو نماز نصف شعبان کی رات کو جسے شب برات کہتے ہیں، اور جو عاشوراء وغیرہ میں پڑھی جاتی ہے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ شب برأت میں قیام لیل، دعائے ماثورہ کے ساتھ لمبا سجدہ کرنے، قبرستان جانے، مردوں کے لئے دعا واستغفار کے علاوہ کچھ بھی ثابت نہیں، اسی طرح عاشوراء میں روزہ اور توسیع طعام کے علاوہ کچھ ثابت نہیں، توسیع طعام کی روایات بھی ضعیف ہیں لیکن تعدد طرق سے ضعف کی تلافی ہوگئی ہے، ہاں عاشوراء کے روزہ کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ جامع الاصول میں صحیح احادیث سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کا روزہ، فجر کی سنتیں اور ہر ماہ تین دن کے روزے سفر وحضر میں بھی

ترک نہ کئے، اور یہ تینوں چیزیں بڑی تاکیدی سنتوں میں سے ہیں، اور دوسرے اعمال جن کو "خصائل عشرہ" کہتے ہیں جیسے غسل، سرمہ لگانا وغیرہ عاشورا کے روز یہ بھی صحیح نہیں۔

اور شش عید کے روزے بھی صحیح روایات سے ثابت ہیں، اس باب میں جتنی بھی صحیح حسن، ضعیف اور موضوع روایات ہیں وہ سب میں نے ایک رسالہ "ماثبت من السنۃ فی ایام السنۃ" کے اندر جمع کر دی ہیں۔ بلاد عرب بالخصوص بلاد مغرب کے مشائخ کا طریقہ حضرات محدثین کے مطابق ہے، وہ فرماتے ہیں کہ طالب کیلئے صحیح و ثابت شدہ پر عمل کر لینا ہی کافی ہے۔ واللہ اعلم۔

وصل:۔ بعض مشائخ متاخرین کے نزدیک اس قسم کے اعمال و عبادات پر عمل ہے اور ان کے اوراد میں مکتوب ہیں چنانچہ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور ابو طالب مکیؒ نے قوت القلوب میں ان میں سے کچھ ذکر کئے ہیں، اور ہم نے سابقہ وصل میں اجمالاً اس کی توجیہ کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ وہاں ہم نے یہ کہا ہے کہ محدثین کے نزدیک ان اعمال کا یہ طریقہ ثابت نہیں ہے، یعنی یہ اختلاف درحقیقت طریقہ کے اختلاف پر موقوف ہے، اگر ایک بات کسی کے نزدیک ثابت نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے کے نزدیک بھی ثابت نہ ہو۔

اس مقام کی تحقیق و تفصیل یہ ہے کہ ان مشائخ نے جو ان اعمال و عبادات پر عمل کرتے ہیں۔ انہیں اپنے شیوخ سے سنا اور انہیں کرتے دیکھا، انہیں دوسرے مشائخ سے یہ بات ملی، ان اعمال کی روایت میں حسن ظن پر عمل کرتے ہوئے، راویوں کے معاملہ میں اہتمام اور بدظنی کو ترک کر دیا اور ان روایتوں کو قبول کر لیا کیونکہ انہیں عبادات و اعمال کی بڑی حرص اور فریفتگی تھی اور وہ عبادت کو علی العموم اچھا ہی سمجھتے تھے۔ نہ انہوں نے اس میں خصوصیت وقت کا لحاظ رکھا نہ خصوصیت حال کا۔

لیکن محدثین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ راویوں کے حالات کی تحقیق و تفتیش اور ان کا تزکیہ و تعدیل کرتے ہیں، اور اپنی صلاحیتوں سے روایت کی صحت کا جزم ظاہراً اور باطناً کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ احادیث و آثار کی تحقیق و تفتیش ان کا

ذمہ ہے اور اس باب میں انہیں پر اعتماد بھی ہے جس طرح کید و احوال نفس، احوال باطن کی تصحیح اور اس کے دقائق میں حضرات صوفیہ، اور حلت و حرمت اور صحت و فساد اعمال میں حضرات فقہا پر اعتماد ہے، سب ایک دوسرے کے محتاج اور ممد و معاون ہیں، اور جو ان تینوں طریقوں کا جامع ہے اس میں وجوہ و حیثیات کا فرق ہو گا۔

امام مسلمؒ اپنی صحیح مسلم کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ احادیث موضوعہ اور ان کی اشاعت اکثر اہل تقویٰ اور اہل صلاح سے صادر ہوئی ہے، یعنی ان سے جس کسی نے بھی کوئی ایسی حدیث روایت کر دی جو کسی قاعدۂ شرعیہ کے مخالف نہیں تھی اور ظاہراً وہ شخص صدق و صلاح سے بھی متصف تھا تو اس کے قول صادق سمجھتے ہوئے حسن ظن کی وجہ سے اس کی روایت کو قبول کر کے اس پر عمل شروع کر دیا اور دوسرے سے روایت بھی کر دیا، گویا انہیں یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا باندھ کر اپنی طرف سے روایت وضع کرے گا اور حضورؐ پر جھوٹ بولے گا حالانکہ اس باب میں وعید شدید بھی موجود ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا جس شخص نے میرے اوپر قصداً جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ ان میں اغراض نفسانی و شہوانی کس قدر ہیں۔ اسی کے ساتھ کسی نے ترغیب و ترہیب کے لئے وضع احادیث کو جائز قرار دے دیا، یہ بات بالخصوص بعض صوفیہ کی طرف منسوب ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ آنحضرتؐ پر دروغ نہیں، بلکہ اپنے نفع کیلئے ہے، یعنی وضع احادیث کا یہ سلسلہ ترغیب و ترہیب دین کے فائدہ کے لئے ہے نہ کہ اس کو نقصان پہنچانے کے لئے، اور جو وعید اس باب میں ہے وہ اس صورت میں ہے کہ ضرر دین کے لئے وضع احادیث ہو، جیسے کہ لفظ "علیّ" اس پر دلالت کر رہا ہے، اور اکثر وضع احادیث زہاد و عباد اور اہل بدعت وغیرہ سے ہوا ہے تاکہ ان کے اعمال اور مذاہب رائج ہو جائیں، اور ہم جانتے ہیں کہ ان اعمال سے متعلق روایات نہ تو صحاح میں ہیں اور نہ محدثین نے ان کی تصحیح کی ہے بلکہ ان روایتوں کو رد کر کے ان پر طعن کیا ہے لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشائخ کے پاس بھی سندیں ہیں اور مسئلہ ظنی ہے قطعی نہیں، کلام صرف راجح اور مرجوح میں ہو گا، اور حق کا اتباع کرنا چاہیئے واللہ اعلم۔

وصل:- معلوم ہوا کہ ان اعمال کے اختیار کرنے کا دار ومدار ان روایات میں تسامح حسن ظن اور حرص عبادت پر ہے، جبکہ یہ بھی وارد ہوا ہے کہ "جب کسی کو ہماری طرف سے کسی (عمل میں) فضیلت کا علم حاصل ہوا اور اس نے عمل کر لیا تو اچھا کیا اگرچہ صحت کو نہ پہنچے" حضرات محدثین فرماتے ہیں کہ یہ حکم حدیث ضعیف کا ہے، حدیث موضوع پر نہ تو عمل کرنا جائز ہے نہ اس کی روایت جائز بلکہ حرام ہے اگرچہ وہ قواعد کے مطابق ہو، مگر وضع و شک کا اس میں بیان نہ ہو، کیونکہ وضع کا حکم لگانا ظنی ہے اور قطعیت کا حکم ناممکن، اور اعتماد تو اس فن کے ماہرین اور ائمہ کے قول پر ہے۔ حدیث موضوع کے جو قرائن بیان کئے گئے ہیں وہ بھی قطعی نہیں، مثلاً کسی متعصب رافضی کی وہ روایت جو اہل بیت کے فضائل میں ہو یا کسی بدعتی کی وہ روایت جو اس کے مذہب کی ترجیح و تائید میں ہو، یہ بھی ظنی ہے، ایک وقت میں اگر کذب ہے تو دوسرے وقت صدق کا احتمال ہے، ابن جوزیؒ وغیرہ بعض ناقدین نے تو وضع حدیث کا حکم لگانے میں بڑے تعصب اور افراط سے کام لیا ہے، پس طرفین سے بڑی تنگی ظاہر ہوئی، یہ گفتگو مختلف فیہ میں ہے۔ لیکن جہاں ائمۂ فن نے تصریح کر دی ہو وہاں تو بات بالکل واضح ہے۔ مخالف سنت کوئی حجت یا روایت یا تو ان اقوال کی حقیقت حال معلوم نہ ہونے پر موقوف ہے۔ یا اپنے مشائخ کی عقیدت میں تعصب اور علماء محدثین کے اقوال پر عدم اعتماد پر، درحقیقت دونوں طرف کے متعصبین افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں، صاف بات یہ ہے کہ خشک قسم کے فقہا اور جاہل قسم کے صوفیا سے دامن بچا کر راہ اعتدال اختیار کرنا چاہیئے، اس کے علاوہ خوف و خطر ہے، واللہ اعلم۔

مکتوب نمبر ۱۱

بنام شیخ عبداللہ نیازی قدس اللہ سرہٗ

تطریب الالحان لمناصحۃ الخلان

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ ایک روز یہ فقیر ارباب فہم و فراست کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ بات شیخ ابو علی بن سینا اور شیخ ابوسعید ابو الخیرؒ تک پہنچ گئی، اور شیخ ابو الخیر نے رئیس بو علی بن سینا کو ان سے شناختِ راہ کے سلسلہ میں جو مکتوب بھیجا تھا اس کا ذکر آگیا، مکتوب عربی زبان میں تھا، اس لئے اس جماعت میں سے ایک فاضل محقق نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کا فارسی ترجمہ کردوں، چنانچہ میں نے اس مکتوب کا خلاصہ فارسی میں تحریر کر لیا، لیکن اس مقام کے مناسب مضمون مکتوب پر کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ مقصود سے پہلے اس کو تحریر کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

شیخ ابوسعید ابو الخیرؒ جو سلطان الاولیا اور اونچے درجہ کے بزرگوں میں سے ہیں مشہور ہے کہ انھوں نے شیخ الرئیس ابو علی بن سینا کو ایک خط لکھا جس میں پوچھا تھا کہ وہ کونسا راستہ ہے جو سالک کو کوچۂ معرفت میں لے جائے اور عارف کے دل پر نور حقیقت ظاہر ہو جائے۔ اور اس کا آئینۂ دل ماسوا کی کدورت کے زنگ سے صاف و شفاف ہو جائے، ہو سکتا ہے کہ آغاز کار میں یہ صورت طلب شیخ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو بلکہ ان کا امتحان مقصود ہو۔ واللہ اعلم بایں ہمہ شک نہیں ہے کہ یہ جذبہ صدق طلب، شدت تشنگی اور جناب باری عز اسمہٗ کے طرق وصول کے تتبع سے پیدا ہوا ہو۔ کیونکہ ارباب طریقت کا اس پر اتفاق ہے کہ مراتب قرب الٰہی اور درجات معرفت غیر متناہی ہیں۔ لیکن عقلمند کا کام غور و فکر کرنا ہے کہ ایسا شخص جو سلطان الاصفیا ہے وہ بھی طریق ہدایت اس سے معلوم کرتا اور حکمت سے مستغنی نہیں ہوتا ہے لہٰذا حکمت سب سے بلند مرتبہ ہے، واقعہ بھی ایسا ہی ہے

کیونکہ حکمت کی تعریف یہ ہے کہ علم و عمل میں نفس کو کمال اور جناب قدس واجب الوجود کے ساتھ تشبہ حاصل ہو جائے، انسان کا اس سے بڑھ کر کمال ممکن نہیں، اور یہ بھی درحقیقت شریعت کی شرح ہے کیونکہ شریعت میں جو چیز مجمل اور کلی طریقہ پر ہے حکمت اسی کی تفصیل و شرح کرتی اور منقول کو معقول سے روشن کرتی ہے، گویا حکمت شریعت کے باطن اور شریعت ظاہر حکمت کا نام ہے، مثلاً شریعت میں لوح و قلم، جنت و دوزخ، پلصراط و میزان وغیرہ کے وجود کی خبر اور ان کی شکل و صورت کا اثبات ہے، کیونکہ محض عقل سے ادراک معنیٰ اور بغیر وحی آسمانی کے اثبات صورت ممکن نہیں، اور جب حکمت سے شریعت کی تفصیل و تحقیق ہوتی ہے تو باری تعالےٰ کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا ومایذکر الا اولو الالباب۔ یعنی جس کو حکمت عطا کر دی گئی تو اسے خیر کثیر مل گئی اور نصیحت تو صرف اہل عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ کتب و رسائل فلسفہ میں جو جدال و نزاع مذکور ہے اور لچر قسم کے شکوک و شبہات سے اس کی تائید و اثبات ہے۔ اور جو بیوقوف بھی آیا اس نے اپنی علمی قابلیت جھاڑنے اور زور بیان دکھانے کے لئے اس پر اضافہ کیا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کا حاصل قیل و قال اور وبال ذکال کے علاوہ کچھ بھی نہ رہا حاشا و کلا اسے حکمت اور اس کے جاننے والے کو حکیم نہیں کہا جا سکتا، امام فخر الدین رازی ؒ جو رئیس المتکلمین و راس المناظرین ہیں اس حالت کی اس طرح شکایت کرتے ہیں ؎

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا سوی ان جمعنا فیہ ما قیل او قالوا

یعنی ہم نے تمام عمر کی طویل طویل بحثوں سے قیل و قال کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کیا۔ اور جس نے اس کے حاصل کرنے میں غلو سے کام لیا تو اس کا انجام دین میں شک اور نبوت اور ولایت کے انکار کے سوا کچھ نہیں ہوتا جس کا لازمی نتیجہ سوء خاتمہ اور آخرت کا نقصان ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حفظ و امان کسی کو حاصل ہو لیکن یہ بہت نادر ہے۔ کسی نے کیا ہی اچھا کہا ہے ؎

حکمت یونانیاں پیغام نفس است وہوا حکمت ایمانیاں فرمودۂ پیغمبر ست

یعنی اہل یونان کی حکمت نفس و خواہشات کا پیغام اور اہل ایمان کی حکمت پیغمبر خدا کا فرمان ہے۔

اب میں اس مکتوب کا ترجمہ جو شیخ ابوسعید رحؒ نے شیخ ابوعلی سیناؒ کو لکھا تھا تحریر کرتا ہوں۔

"اے صاحب علم! حق تعالیٰ آپ کو صلاح ظاہر و باطن کی توفیق اور سعادت آخرت کی نعمت عطا فرمائے، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ راہ راست صرف ایک ہے اور میں اسے یقین سے جانتا ہوں کہ شک و شبہ کے خس و خاشاک اس راہ سے دور ہیں۔ لیکن ایک طریق سے بھی ظنون و شکوک کی مختلف وادیاں نکل آتی ہیں کہ سالک کو اگرچہ اس میں شک نہیں ہوتا لیکن تحیر و تذبذب سے بھی خالی نہیں ہوتا۔ اور میں ہر سالک طریق سے طلب راہ کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون سی راہ مقصود تک پہنچتی اور جمال مقصود حقیقی دکھاتی ہے۔ اس امید پر کہ شاید حق تعالےٰ اسی تحقیق و تصدیق کے طفیل حقیقت حال واضح فرمادے اور قلب کے سامنے مقصود کے دروازے کھول دے، اور آپ کو اے صاحب فضل و کمال، علم معقول کی توفیق دی گئی ہے اور اسی طریق میں آپ مشہور بھی ہیں آپ نے کیا پایا، اور بتائیے کہ آپ کہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ ترہب و تعرف کے ابتدائی حال میں تذبذب اور تردد لازم ہے جس سے اولاً طالب کے کاموں میں قلق و اضطراب پیدا ہوتا ہے پھر جمعیت خاطر اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص زہد و انزوا کے راستہ سے سلوک طے کرتا ہے وہ بے شک منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اس نسبت کا حصول معمولی مجاہدہ اور ریاضت سے بہت آسان ہے، لیکن اگر عقل کے سپرد یہ معاملہ رہے تو بہت دشوار ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

شیخ بوعلیؒ نے اس کے جواب میں جو مکتوب تحریر فرمایا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

جناب والا کا مکتوب گرامی وصول ہوا۔ اس سے آپ پر اللہ تعالےٰ کے الطاف و انعامات۔ ہدایت و توفیق اور حبل متین کے ساتھ اعتصام معلوم ہوا، اور اسی سے بارگاہ عزت میں داعیۂ اقبال و تقرب، اللہ جل شانہٗ کی طرف توجہ، سلوک

طریقت میں استواری، ویرانۂ دنیا کے غبار تعلقات سے قلب کی صفائی۔ اور نفس و طبیعت کے مقدورات سے تنزہ کا مل مفہوم ہو رہا ہے مکتوب گرامی عزیز ترین ہے اس کے اندر کا مضمون مسرت افزا اور اس کے آسمانِ معرفت کا طلوع شدہ ستارہ بے انتہا سعد ہے اسے میں نے پڑھا اور سمجھا اور اس کے حقائق و معانی میں غور و فکر کیا۔ اولاً اللہ رب العزت کی حمد و ثنا کی جس نے عقل عطا فرمائی اور عدل کو نافذ فرمایا۔ اور اس کی بے حد و بے حساب نعمتوں کا شکر زبان سے ادا کیا۔ اور مزید توفیق و ہدایت و درایت کی دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے، اللہ تعالیٰ میرے قدم صدق کو جادۂ طریقت پر ثابت رکھے اور اپنے ماسوا کی طرف التفات کرنے سے محفوظ فرمائے کہ اس سے بڑی لغزشیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ پروردگار جو بے کسوں کا سہارا اور مشکلات کا آسان فرمانے والا ہے۔ تمام امور کی تدبیر اسی کے علم سے اور تمام کائنات کی تقدیر اسی کے حکم سے ہوتی ہے نہ آسمان و زمین کا کوئی ذرہ اس کے حیطۂ علم سے خارج اور نہ بسطِ حرکت اور قبضِ سکون اس کے قبضۂ قدرت سے باہر۔ وجودِ خیر اس کی رضا و امر سے ہے اور وقوعِ شر اس کی قضا و قدر سے، تمام حوادث اسی کی بارگاہ سے نازل ہوتے ہیں اور تمام امور اسی کی طرف راجع ہیں، اس کا امر ایک ہے لیکن شانیں کثیر، وما امرنا الا واحدۃ کلمح بالبصر یعنی اس کا حکم تو صرف ایک ہے پلک جھپکنے کی طرح، ہر امر اسی سے متفرع ہے اور ہر حادث اسی کی طرف منتہی، امرِ ملکوت اور سرِّ جبروت کا یہی تقاضا ہے اور یہ امر و سر بہت عظیم ہے سمجھا جس نے سمجھا اور نہ سمجھا جس نے کوشش نہ کی۔ سعید ازل سے ہوتا ہے اور شقی بھی ازل سے، نہ کسی میں طاقت کہ پوچھ سکے یہ کیوں کیا اور نہ کسی کو مجال کہ کہے کیا کر رہا ہے۔ لایُسئل عما یفعل وھم یسئلون۔ وہ کتنا خوش بخت ہے جس پر آخرت کا سودا سوار ہو گیا اور فانی کے عوض میں باقی کو ہاتھ سے نہ دیا۔

اس عقل مند پر بڑا تعجب ہے جو اس دنیا کے عدم و وجود، رد و قبول، رنج و راحت اور غم و شادی کو برابر نہ سمجھے خواہشات دنیا کا حصول حرص و شہوت ہی کو زیادہ کرتا ہے اور اس کے انتفاع سے سیری حاصل نہیں ہوتی۔ اس سے

مطلوب کا حاصل کرنا خیال ہی خیال اور اس کے محبوب کا وصل محال ہی محال ہے. اس کے کمال کو زوال لازم اور تمام احوال میں اس کا زوال ضروری ہے۔ اس کی تکلیف بھی بے انتہا ردی اور اس کی لذت بھی بے انتہا قبیح، اس کی صحت مکمل بیماری اور اس کی محبت عین گرفتاری ہے۔

جس چیز کو دنیا میں سلامت سمجھا گیا ہے وہ بھوک مٹانے کی حاجت، ستر پوشی کی ضرورت اور وہ چند قطرات منی ہیں جو مباشرت کے وقت جسم سے نکلتے ہیں، اور اسے ہی تو تمام لذتوں کی جڑ سمجھتا ہے، خدا کی قسم دنیا کے ساتھ مشغولیت بیوقوف اور نفع سے بے خبر شخص رکھتا ہے اور اس میں تصرف مخبوط الحواس اور دیوانہ کرتا ہے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ مخلوق کے اختلاط سے تو گریز ہو اور اجانب واغیار کے ساتھ خلوت خانہ میں نشست ہو، عمر رفتہ کی فریاد کرے اور عشقِ کہنہ کو جدید اور نیا سمجھے، حدوث کو دیکھ کر ازل الآزال کا مطالعہ کرنے لگے اور ممارست فنا سے ابدالآباد کا منظر کھینچنے لگے حتیٰ کہ وہاں پہنچ جائے جہاں لذت در لذت اور کمال در کمال ہے۔ وہاں وہ آب زلال ہے کہ جتنا سیراب ہو گے اتنی ہی خوشگواری ہوگی، اور وہ رزق ہے کہ جتنی سیری حاصل کرو گے اتنی ہی لذت پاؤ گے اس کی سیرابی وہ سیرابی نہیں کہ طبیعت کو ناگوار ہونے لگے اور اس کی سیری وہ سیری نہیں کہ بغیر لذت کے ذائقہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ ہماری بصیرت سے غفلت کے پردے. قلوب سے قساوت کے پردے. عقل سے اسباب حیرت اور نفوس سے اسباب حسرت دور فرمائے، اور تہذیب اخلاق وتکمیل اوصاف کی توفیق عنایت فرمائے. سلوک طریقت آسان فرمائے اور اس مکار، دھوکہ باز اور فریب دہ دنیا سے جو بظاہر لطف ومہربانی اور بباطن عداوت جانی کرتی ہے اور صورۃً ملاپ لیکن حقیقۃً جدائی ڈالتی ہے محفوظ رکھے۔ اور سلوک طریقت میں آپ کو ہمارا مقتدا اور امام بنائے۔ اور جس مقام پر آپ پہنچے ہیں آپ کے اتباع کی برکت سے ہمیں بھی اس مقام پر پہنچائے. (آمین)

جناب شیخ نے مجھ حقیر سے جو نصیحت ورہنمائی کے لئے فرمایا ہے اور اس درد کی دوا مجھ سے پوچھی ہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی آنکھوں والا کسی اندھے سے راستہ

معلوم کرے یا کوئی کانوں والا بہرے سے کوئی بات پوچھے، مجھ میں کہاں صلاحیت کہ آپ جیسے بزرگ کو نصیحت کے لئے زبان کھولوں، اور آپ کی اصلاح و رشد کے جواب کے ساتھ خطاب کر سکوں، طریقۂ نجات کو بتا سکوں یا منزل مقصود کی طرف رہنمائی کر سکوں۔

لیکن اعتراف تقصیر و اقرار جہالت کے باوجود حق بات کہنے سے گریز نہیں اور بیانِ حقیقت ناچار ہے، لہذا تمہارا اعتبار اول و آخر، ظاہر و باطن خدائے عزوجل ہو، اور چشم دل اسی کے مشاہدہ کے سرمہ سے سرمگیں، اور ملکوت اعلیٰ اور آیات کبریٰ جو اس مقام میں رکھی ہوئی ہیں ان کی طرف دیکھنے والی ہو اس کے بعد یہ مشاہدہ ہو کہ ہر چیز میں اسی کی تجلیات ہیں اور ہر چیز کا ظہور اسی سے ہے

ففی کل شئی لہ اٰیۃ تدل علی انہ واحد

(یعنی ہر چیز میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ وہ یکتا ہے) اور جب یہ حالت اس کی طبیعت بن جائے تو نگینِ دل پر عالم ملکوت کی صورتیں منتقش ہوں گی اور آئینۂ قلب پر تقدس لاہوت کی جلوہ ریزی ہوگی حضور قدس سے الفت ہوگی اور مذاقِ حال کے مطابق اس عالم کی لذت ہوگی، سکینہ اور وقار کا اس پر فیضان ہوگا اور طمانیت و قرار اس میں پیدا ہوگا، دنیا اور اہل دنیا کو صرف نظر رحمت سے دیکھے گا اور نعمت پروردگار کی شکر گزاری ان کو بخشے گا جس مقام پر وہ خود ہے ان کو بھی اس کا طلب گار بنائے گا اور مواعید و مواثیقِ رحمت کو بیان کر کے انکے جذبات میں شوق پیدا کر دے گا، اسے ہر حال میں لذت در لذت اور مسرت حاصل ہوگی، اپنی لذت سے لطف اندوز اور اپنی مسرت سے خوش ہوگا لوگوں کے ساتھ ہوگا بغیر لوگوں کے، ہر جگہ ہوگا بغیر ہر جگہ کے، مخلوق اس پر تعجب کرے گی اور وہ مخلوق پر ان سے بھی زیادہ، مخلوق اس کے معاملہ میں حیران ہوگی اور وہ ان سے بھی زیادہ ان میں حیران۔

خوب یاد رکھو کہ افضل ترین حرکت نماز ہے لیکن بوصف مراقبہ، اور بہترین سکون روزہ ہے لیکن حفظ مراتب کے ساتھ، نافع ترین نیکی صدقہ اور مخلوق کے ساتھ احسان کرنا ہے اور کامل ترین طریقہ مصائب و شدائد پر صبر و تحمل کرنا ہے، اور

جب تک نفس قیل و قال کی طرف ملتفت ہے اور مناقشہ و جدال اور تاثر و انفعال مختلف صورتوں میں باقی ہے تو طبیعت کی کثافت اور کدورت سے صاف ہونا محال ہے، بہترین عمل وہ ہے جو مقام نیت سے صادر ہو اور بہترین نیت وہ ہے جو بارگاہ حلم و معرفت سے پیدا ہو، تمام فضائل کی اصل حکمت ہے اور سب سے مقدم معرفت الٰہی ہے، کلمات طیبہ کا صعود خدا کی طرف ہے اور اسکی رفعت کا سبب عمل صالح۔ یہ تھی میری عرضداشت، خدائے تعالیٰ سے میں بخشش کا طلبگار ہوں اور ہدایت و کفایت اسی سے طلب کرتا ہوں، اور اسی کی قربت کا خواہاں ہوں۔ انہ سمیع مجیب۔

شیخ بوعلی سینا کے مکتوب کا جو شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کے نام ہے یہ مضمون ہر ایک دوسری نقل اور بھی ہے، کہتے ہیں کہ شیخؒ نے ابوعلی سینا کو تحریر کیا کہ "مجھے ایسی دلیل جو رہنمائی کرے اور پردۂ غفلت کو چاک کر دے تحریر کیجئے" ابوعلی سینا نے جواب دیا کہ "دلیل یہ ہے کہ ایمان مجازی کو چھوڑ کر کفر حقیقی میں داخل ہو جاؤ اور موالید ثلاثہ کے ماورا جو چیز ہے صرف اسی کی طرف التفات رکھو، بلکہ اپنا اشتغال باطن ماسوائے عوالم ثلاثہ کے ساتھ رکھو جو ناسوت، ملکوت اور جبروت ہیں، مگر ذات محض کے مرتبہ میں جو لاہوت محض اور وحدت مطلقہ ہے واللہ اعلم۔ روایت ہے کہ شیخ نے اس کے جواب میں یہ لکھا کہ مجھے ان کلمات و اشارات نے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں چار ہزار سال کی عبادت سے بھی نہ پہنچتا۔ واللہ اعلم۔

یہ حکایت غرابت سے خالی نہیں، اسی وجہ سے عین القضاۃ ہمدانیؒ نے فرمایا کہ ابوعلی سینا جو راہ سے ہٹے ہوئے محض ایک طبیب تھے وہ اس مقام پر کہاں کہ ابوسعیدؒ کو ایسا لکھے اور اس کے جواب میں ابوسعید یہ لکھیں ان کلمات سے اس مقام پر پہنچ گیا کہ چار ہزار سال کی عبادت سے بھی نہ پہنچتا، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ابوسعیدؒ نے ان کلمات کا ذائقہ محسوس کر لیا ورنہ ابوعلی جیسے کو سنگسار ہونا پڑتا۔

ایک اور حکایت بھی ملفوظات مشائخ چشتیہ میں مذکور ہے کہ ابوعلی نے

ایک شخص کو جاسوس بنا کر شیخؒ کی مجلس میں بھیجا کہ جناب شیخ پس پشت انہیں کس عنوان سے ذکر کرتے ہیں، اور ان کے حق میں شیخ کا کیا نظریہ ہے، ایک روز اس شخص نے شیخؒ سے دریافت کیا کہ ابو علی کے بارے میں کیا خیال ہے اور وہ کس مقام پر ہے۔ شیخؒ نے فرمایا کہ طبیب فاضل اور دانشمند انسان ہے لیکن مکارم اخلاق اس میں نہیں ہیں، ابو علی کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو شیخ سے اس کی شکایت کی اور لکھا کہ میں نے اتنی کثیر کتابیں مکارم اخلاق میں تصنیف کی ہیں لیکن شیخؒ فرماتے ہیں کہ مکارم اخلاق مجھ میں نہیں ہیں۔ شیخؒ نے جواب دیا کہ میں نے یہ کب کہا ہے کہ مکارم اخلاق نہیں جانتا میں نے تو یہ کہا ہے کہ مکارم اخلاق اس میں موجود نہیں۔

دانشمند و ذکی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ شیخ نے جس مکتوب میں استرشاد و استمداد کیا ہے وہ ابتدائے حال و آغاز طلب کے زمانہ کا ہے نہ کہ انتہا تک پہنچنے کے بعد کا (لہذا ان واقعات میں کوئی تضاد نہیں)، واللہ اعلم وعلمہ احکم

مکتوب نمبر ۱۲

بنام نواب خان خانان سپہ سالار

اختیار التخلی لانتظار التجلی

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ خدا کرے توفیق ابدی کے انوار اور تحقیق ازلی کے اسرار شامل احوال اور حاصل اوقات بابرکات ہوں (آمین)

جب بھی ارادہ کیا کہ عرض دعا کے بعد اس راہ اور اس طریق کے سلوک کی باتیں لکھی جائیں تو اس مقام کے صدمۂ ہیبت اور اس مقصود کی صعوبت کے تصور سے ایسی حالت ہوتی کہ قلم ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور ہاتھ کام کے لائق نہ رہتا۔ کیا کہے اور کیا لکھے، بزرگوں نے تو نہ لکھنے کے لئے کچھ چھوڑا نہ کہنے کے لئے۔ اب تو اسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ اے نفس تجھے شرم آنا چاہیئے کہ پہنچے ہوئے بزرگوں کی باتیں انہیں کے مقام سے باوجودیکہ تو وہاں نہیں پہنچا، کہتا ہے، اور حقیقت حال کو حروف والفاظ میں تلاش کرتا ہے اگر مردانگی ہے تو جو کام ان بزرگوں نے کیا تو بھی کر، اس کے بعد وہ باتیں جو انھوں نے فرمائی ہیں تو بھی کہہ، اور اگر اس مقام پر پہنچ کر بھی تو خاموش رہے اور کچھ نہ کہے تو بہتر اور اچھا ہے۔ اس کہنے کی ایک یہ خاصیت ہے کہ مادۂ نورانیت کو سینہ سے باہر کرتا اور باطن کو ذوق وحضور سے خالی کر ڈالتا ہے حقیقت کو بھی اگر تنگنائے سینہ میں محبوس رکھا جائے تاکہ صبر کی طاقت اور اخفا اس پر تنگ ہو جائے، تو کشادگی میں فضائے باطن میں جولانی پیدا ہوتی اور اجزائے وجود میں سرایت کر جاتی ہے اور شدت ضبط واخفا کی وجہ سے چاہتی ہے کہ باطن کو چیر پھاڑ کر باہر نکل پڑے تاکہ اس کے انوار کی شعاعیں، احوال کے رخساروں پر بے اختیار چمکنے لگیں اس کو نور دوسرا اور حضور دوسرا ہوتا ہے جیسے طاق جس میں چراغ ہے اور چراغ ایک شیشہ میں ہے، اس صورت میں خاموشی زبان حال بن جاتی ہے

اور معنی بغیر الفاظ و عبارت کے کلام میں آتے ہیں، کتنا مبارک ہے یہ حال اور کتنا اچھا ہے یہ ذوق جس کو حاصل ہو جائے۔

ایک دوسری جماعت بھی میرے سامنے ہے جو ذوق سخن اور لذت کلام سے ایسی مجبور رہے کہ کلام سے صبر کرنا ان کے لئے محال ہے اور لفظ عین معنی اور قال نفس حال بن گیا ہے یہاں بھی اگر اچھی روش اختیار کریں تو تاثیر معنی کی قوت پر واضح دلیل موجود ہے کہ الفاظ کے پردہ اور صورت کے حجاب کے باوجود یہ تاثیر ہے تو جہاں صرف معنی اور محض حقیقت ہے وہاں کیا حال ہوگا۔

پھر اگر کوئی کہے تو اتنی ہی بات جو اسے حاصل ہوگئی اور دم مارے تو اسی جگہ کہ جہاں قدم رکھ چکا ہے تاکہ دائرۂ صدق سے باہر نہ نکلے اور یہ کلام اس کے لئے وبال نہ بنے۔

اب میں کہتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں لغزشوں اور رخنوں سے محفوظ رکھے۔ کہ مقام معرفت پر فائز بزرگوں نے فرمایا ہے کہ باطن کو التفات محسوسات سے پاک و صاف اور یکسو، اور اللہ رب العزت کی عبادت اور ذکر میں مشغول ہونے کے بعد نفس کو روحانیت سے ایک الفت و نسبت پیدا ہوتی ہے اور نور معرفت دل میں آجاتا ہے جس سے مشاہدۂ حق کی توفیق اور مرادِ الٰہی اور کائنات کی لامتناہی حکمتوں کا علم ہونے لگتا ہے۔ اور آنکھوں پر اس کے دل سے ایک ایسی شعاع منعکس ہو جاتی ہے کہ وہ ان ظاہری آنکھوں سے مغیبات و روحانیات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے تاکہ وہ اس عالم ظلمت سے اپنے ظاہر و باطن سمیت نکل جائے اور نور حق میں مستغرق ہو جائے۔

ان احوال کی تفصیلات تو وہی حضرات جانتے ہیں جو پہنچے ہوئے ہیں لیکن تصدیق ایمانی کے لئے اجمالاً اتنا یقینی طور پر معلوم ہوگیا ہے کہ مخلوق سے عزلت نشینی و انقطاع اور جناب باری عزاسمہٗ کی طرف توجہ و اشتغال کی نورانیت قلب، تزکیۂ نفس اور جن کدورتوں سے عام مخلوق کے قلوب ملوث ہیں ان سے طہارت میں بڑی تاثیر ہے، ہوسکتا ہے کہ اگر یہ ورد احتیاط و شرائط کی رعایت کے ساتھ دائمی ہو جائے تو جس مقام کو ان بزرگوں نے فرمایا ہے وہاں تک رسائی ہو جائے

لہذا اس نسبت کے طالب اور اس کمال کے شوقین کے لئے لازم ہے کہ طلب و اجتہاد کی راہ سے نہ ہٹے، اگر تمام سال میں ایک مہینہ، مہینہ میں ایک ہفتہ، ہفتہ میں ایک دن اور دن میں ایک ساعت اس مضمون کو اپنا وظیفہ بنالے کہ اس ساعت میں مخلوق سے خلوت حاصل کر کے ذکر و مناجات میں مشغول ہو جائے، اور انتہائی تضرع و ابتہال اور صدق و التجا کے ساتھ بیٹھے تاکہ اس ساعت کے انوار و برکات تمام اوقات پر واقع ہوں اور رفتہ رفتہ دوام و استمرار حاصل ہو جائے۔ عجیب ہے وہ شخص جسے اس معاملہ کی خبر نہ ہو اور اس سے بھی عجیب ہے وہ جو اس کے امکان و وجود کے معلوم ہو جانے کے بعد بھی اس کے باطن میں کوئی داعیہ اس بات کا امتحان کرنے کے لئے نہ ہو۔ لاالہ الااللہ۔ اگر دن اور رات میں ایک ساعت بھی اس خیال میں مشغول ہو جائے تو کون سا نقصان واقع ہو جائے گا۔

اگر کسی کا مادۂ ایمان کامل ہو گیا اور نور یقین اس کے دل پر چمک رہا ہے تو یہ بڑی مبارک اور اچھی حالت ہے کہ یہی نور یقین بغیر کسی زحمت اور تکلیف غیر کے اس طریق کے سلوک و اختیار کا باعث ہو جائیگا، کیونکہ طالب کے شوق کا پیدا ہونا اور مصائب و تعب کو برداشت کرنا حسن مطلوب کے اندازۂ ادراک پر موقوف ہے، اور حسن مطلوب کا ادراک نور یقین کے اندازۂ اشراق پر، اگر کوئی طالب ابھی درجۂ یقین پر نہیں پہنچا ہے اور طبیعت پر کدورت اور نفس پر عوارض طاری ہو جانے کی وجہ سے ابھی مرتبۂ ظن و تخمین میں ہے تو یہ بھی اختیار مجاہدہ و طلب میں کافی ہے۔

حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ ابتدائی حالت میں اختیار عمل کو حصول یقین کے ساتھ مشروط نہ رکھنا چاہیئے، بلکہ اس کو جتنی بھی تصدیق حاصل ہے چاہے اعتقاداً ہو یا تقلیداً اسی کے ساتھ عمل میں ابتدا کر دینی چاہیئے۔ تاہم صفائے معاملہ اور نورانیت عمل سے رفتہ رفتہ شاہد غیب کے جمال سے ریب و شک کے حجاب اٹھ جائیں گے۔ اور نور یقین جلوہ گر ہو جائے گا نقصان پر راضی ہونا اور ازالہ و علاج کی سعی میں تاخیر کرنا اس مقصود کو بہت دور پھینک

دبے گا۔ اور بعد و حجاب کی علت کو ختم و طبع وغیرہ سے راسخ و مستقر بنادے گا۔ نعوذ باللہ منہا یقین ہے کہ صاحب فطرت سلیم کبھی راہ استقامت اور طریق سلامت سے باہر نہیں جائے گا۔ ع کہ ہرگز نگردد اصل گوہر خطا۔ یعنی اصلی موتی سے کبھی خطا نہیں ہوتی، میں اس طالب پر قربان جو نور و اثر کے ظاہر ہونے سے پہلے محض بات سننے پر عمل شروع کردے اور تحصیل مطلوب میں اگرچہ وہ متعذر الوصول ہو بیتاب و بے اختیار ہو جائے۔ ایک محقق کا قول ہے کہ فطرت سلیمہ کی طبیعت میں دین اسلام کا اختیار کرنا داخل ہے، واللہ الموفق ومنہ الالہام، اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر الخلق محمد و علی آلہ وعلی اصحابہ اجمعین۔

مکتوب نمبر ۱۳

بنام نواب مرتضیٰ خان

تحصیل المطلوب بانتظار المحبوب و رعایۃ الاعتدال فی العلم والحال

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ طلب کرنا چاہیئے کہ طلب کے بغیر انتظار اور ہوس و آرزو کے ساتھ انتظار مطلوب تک نہیں پہنچا سکتا، طلب کی حقیقت یہ ہے کہ مطلوب کی طلب و تشنگی طالب کی روح پر ایسی غالب و مسلط ہو جائے کہ کوئی مقصود اور کوئی آرزو اس سے مانع نہ ہو۔ اور غلبۂ شوق و تشنگی اس درجہ ہو جائے کہ اگر دنیا کے تمام اہل عقل یہ فیصلہ کر دیں کہ اس مطلوب کا حاصل ہونا محال ہے تب بھی یہ بات نہ تو طالب کے کان قبول کریں نہ اس کے دل میں اترے، اور نہ ان کی اس بات سے وہ اپنی جستجو سے باز آئے، اگر یہ حالت ہو تو طلب ہے، باقی ہوا و ہوس سے زیادہ کچھ نہیں، اور ہوا و ہوس سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اور محبوب کا انتظار اس طرح ہو کہ ایک لمحہ بھی اس کے خیال اور اس کے حصول وصال سے غافل نہ ہو۔ جو سانس لے اور جو قدم اٹھائے تو اس کے پیش نظر حصول مطلوب اور حضور محبوب ہو، امیدوار رہے کہ شاید اسی وقت کام بن جائے امید و انتظار اگرچہ معنی کے اعتبار سے قریب قریب ہیں لیکن ذوق کے لحاظ سے حالت انتظار مقام امید سے پہلے ہے، امید تو سوادِ قلب میں پوشیدہ ہوتی ہے اور انتظار کا اثر باہر ہوتا ہے، امید سے آرام و تسکین حاصل ہوتا ہے اور انتظار سے قلق و اضطراب اور بیقراری کہ الانتظار اشد من الموت یعنی انتظار موت سے بھی زیادہ سخت ہے، یہی موت عین حیات ہے ہزاروں زندگیاں اس موت پر قربان، اس میں شک نہیں کہ ایسی حالت کا وجود بڑا نایاب ہے تو پھر کیا کرنا چاہیئے جب کہ بیکار بیٹھنا بھی صحیح نہیں۔ ہاں اگر یہ مرتبہ حاصل نہ ہو تو بحکم ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ یعنی جو سب حاصل نہ ہو

توسب کو چھوڑنا بھی نہ چاہیئے (بلکہ جتنا حاصل ہو سکے حاصل کرلے) اپنے اختیار سے اس راہ میں قدم رکھ دینا چاہیئے۔

یقین سے جان لینا چاہیئے کہ ہر عمل کا اجر اور ہر فعل کی جزا اگرچہ وہ ذرہ سے زیادہ نہ ہو ضرور ملتا ہے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ یعنی جو ذرہ برابر بھی نیکی کریگا تو وہ اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا تو وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔

اندریں رہ گر آنچناں نہ کنی　　　دست وپائے بزن زباں نہ کنی

یعنی اس راہ میں اگر اُس جیسا نہیں کر سکتے تو ہاتھ پاؤں مارو، کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مقامات یقین میں سے پاداش عمل کا اعتقاد بھی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کسی عمل کو حقیر نہ سمجھا جائے اگرچہ بندہ کی نسبت سے حقیر و بے اعتبار ہے لیکن اس حیثیت سے کہ یہ حکم الہٰی کا امتثال، اس کا فرمان اور اس کا وعدہ سچا ہے اور اس کا یہی طریقہ جاری ہے، بہت عظیم ہے، درحقیقت جزائے عمل بھی عین عمل ہے جو دار آخرت میں اس صورت میں ظاہر ہوا، عمل دنیا میں عرض ہے اور آخرت میں جوہر اختلاف مکان سے یہ اختلاف پیدا ہو گیا۔ کلمۂ سبحان اللہ جنت کا پودا ہے اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ جنت کے خزانوں میں سے ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے، اسی راز کو ظاہر کرتا ہے، اور ارباب عقل کے مذہب سے بھی اس مضمون کی معقولیت پر روشنی پڑتی ہے، ان کا مذہب ہے کہ ذہن میں اشیا کا حصول حقیقت کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ مثال ونمونہ کے ساتھ، یہ بحث کسی دوسرے مقام پر انشاء اللہ مکمل طریقہ پر کی جائے گی۔

اس وقت تو کلام وصول حق کے طریقہ اور ان مجاہدات و ریاضات میں ہے جو درویشوں نے کئے ہیں اور وہ کام جنہیں وہ کر کے منزل مقصود تک پہنچ گئے کس میں طاقت ہے ان کاموں کے کرنے اور اس بار کو برداشت کرنے کی، یہاں ایک آسان اور سہل طریقہ بھی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر ان صفات کے ساتھ جو دین اسلام میں مذکور ہیں اعتقاد رکھنے کے بعد ہمیشہ اسی کی بارگاہ میں التجا کرنے والا توفیق وہدایت کا اسی سے مانگنے

والا، اسی کے فضل وکرم سے امید رکھنے والا اور تضرع و نیاز کے ساتھ اسی کے قرب و قبول کا تلاش کرنے والا ہو جائے، جس طرح غلام اور خادم اپنے بادشاہوں اور مخدوموں کے ساتھ۔ ادب اور خشوع و خضوع کا معاملہ کرتے ہیں۔ انھیں کے انعام و اکرام کے امیدوار، ان کے قہر و غضب کے خوف زدہ اور انکی سطوت و ہیبت سے لرزاں رہتے ہیں حضرت ربوبیت جل شانہ کے ادب کو غلاموں کے بادشاہوں کے ساتھ معاملہ سے سمجھا جاسکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سب سے برتر ہے ؎

گر وزیر از خدا بترسیدے ہمچناں کز ملک، ملک بودے

یعنی اگر وزیر خدا سے اتنا ڈرتا جتنا بادشاہ سے تو فرشتہ بن جاتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور و ادب ہو، دوسرے الفاظ میں اعتقاد اور خدمت، علم اور حال اور معرفت اور طاعت ہو، اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں تو اعتدال حاصل ہوگا کوئی سعادت اور کمال اس سے بڑھ کر نہیں ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ حال و علم حقیقی اعتدال کے ساتھ حاصل ہو جائیں، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی ؒ اور ان جیسے بزرگ اس مقام پر پہنچے ہوئے تھے، ورنہ بعض پر غلبۂ حال کی وجہ سے محبت اور شوق و مستی پیدا ہوگئی اور بعض پر غلبۂ علم کی وجہ سے ادب اور خدمت و بندگی ظاہر ہوگئی، پہلی جماعت مستوں کی ہے اور دوسری ہشیاروں کی اور مستی و ہشیاری کو جمع کرنا آسان نہیں ہے ؎

برکفے جام شریعت برکفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

یعنی ایک ہاتھ میں جام شریعت اور ایک میں عشق کا گھن ہے، ہر بوالہوس جام اور گھن سے کھیلنا نہیں جانتا۔

محققین اہل دین عمل کی تقدیم اور ظاہر کی رعایت کو اہم قرار دیتے ہیں حضرت شیخ ؒ نے فرمایا کہ باطن کی حالت کو ظاہر کے عمل پر مقدم نہ رکھا جائے تاکہ ادب واعتدال کے دائرہ سے باہر نہ نکل پڑے۔ نیز ظاہر پر بھی اکتفا کر کے نہ بیٹھ جانا چاہیئے تاکہ بلند مراتب اور کمال سے محروم نہ رہ جائے، ظاہر میں تو عمل و خدمت ہونا چاہیئے اور باطن میں محبت و تشنگی، تاکہ کام درست ہو نیز آپ نے فرمایا کہ فقیہ صوفی بنو، نہ کہ صوفی فقیہ، یعنی پہلے عمل شریعت و فقاہت کو خوب اچھی طرح حاصل

کرو اس کے بعد حقیقت کی چوٹی پر چڑھو، یہ روش سلامتی کے قریب تر اور اس کی مضبوط بنیاد ہے، اگر پہلے ہی سے صوفی ہو گئے اور حال کے تابع بن گئے تو سلامتی سے دور ہو جاؤ گے اور بنیاد کمزور ہو جائے گی، علم پہلے حاصل کرنے سے شوق ترقی و تشنگی کے ساتھ طریقۂ تصوف و اہل حال میں کمال پیدا ہوتا ہے، لیکن غلبۂ ذوق وحال کے بعد علم کی طرف رجوع کرنا بہت دور جا پڑتا ہے۔

ہمارے اس کلام سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حقیقت شریعت کے مخالف کوئی دوسری چیز ہے، حقیقت شریعت کی روح اور شریعت حقیقت کی صورت ہے، شریعت تو نام ہے اس کا کہ جو کچھ بتلایا گیا ہے اس کا اعتقاد اور جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل ہو، اور حقیقت ان تمام باتوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کرنا ہے، حقیقت، شریعت کی حقیقت اور علت ہے کہ جس چیز پر ایمان لائے ہیں اگر اس کو مشاہدہ سے سمجھ لیں تو اس کی حقیقت تک رسائی ہو جائے حضرت غوث الثقلین، شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رح کا ایک فرمان منقول ہے کہ جس حقیقت کو شریعت رد کر دے وہ زندقہ ہے یعنی اگر کسی کو دین و شریعت کے خلاف کشف ہوتا ہے تو اگر اس کا اعتقاد رکھے تو کافر زندیق ہو جائے گا۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رح فرماتے ہیں کہ بسا اوقات راہ تصوف کے وجدانات میں سے کوئی نکتہ قلب پر وارد ہوتا ہے اور اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ جلوہ ریز ہوتا ہے میں اسے اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک دو شاہد عدل اسکے صدق پر گواہی نہ دیں اور وہ دونوں گواہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین ایک ہے دو نہیں ہو سکتے، اس بحث کا میدان تو بڑا وسیع ہے جتنے اشارات کئے گئے ہیں وہی کافی ہیں، سچی بات یہ ہے کہ اس کے علاوہ سوچنے والا خطا میں مبتلا ہو جائے گا واللہ اعلم بالصواب۔

مکتوب نمبر ۱۴

بنام نواب خان خانان سپہ سالارؒ

تذکیر اولی الاحلام بان لذات الدنیا کلھا احلام و رفع التعب والعنا بالجمع بین الفقر والغنا

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ انجام بخیر ہو۔ آغاز کلام دعا سے رسوم تکلف و ادعا کو چھوڑ کر اس وجہ سے ہے کہ ہر چند کہ مختلف اقسام سخن کے ارد گرد گردش کی اور اہل سخن کے طور و طریق کو آزمایا کوئی کار آمد و بالاتر مقصود دعا سے بڑھ کر نہیں پایا خصوصاً یہ دعا جو تمام دعاؤں کا خلاصہ اور تمام رغبتوں کی جامع ہے۔ انجام بخیر ہو — آمین، آمین۔ اگر شرح میں، مدح و ثنا ہو تو تعریف کرنے والوں کے منہ میں خاک، اور اگر بیان شوق و اشتیاق ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں۔

وہ جماعت کہ جس کی طبیعت کا رجحان خلوت نشینی و مشق دیوانگی ہو اور اس کا سرمایۂ وقت وحشت و نسیان ماسوا ہو، وہ بھی ایک دوسرے کی صحبت کا دم بھرتے ہیں، اور اغیار کی مخالطت و موانست کا سر میں سودا رکھتے ہیں، دوستوں کی محبت تو موجود ہے لیکن اتنی فرصت و فراغت کہ ایک دوسرے کی صحبت سے دل آرام حاصل کرے تنگنائے دنیا میں حاصل نہیں، کل اگر قسمت میں ہے اور ایک منزل میں مقام بھی ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ اذھب عنا الحزن (ہم سے غم کو دور کر دیا)، کے فراغستان میں اور اخوانا علی سرر متقبلین (بھائیوں کی طرح مسہریوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے یعنی جنت میں)، کے باغستان میں صحبت حاصِل ہو سکے گی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، آج تخم محبت زمین دل میں ڈال دیں کل کو دیکھیں گے کہ کیسے گل کھلے اور کیسے پھل آئے اس دنیا میں اگر باغ جنت کی تلاش ہے تو وہ دوستوں کے ساتھ ہے کہ جس کے تصور سے ہی دل باغ باغ ہو جاتا ہے، دیکھنا اور نفع حاصِل کرنا تو علیحدہ۔

اس سے بالاتر ایک بہشت اور ہے اور وہ وقت سحر ہے اور اگر نصف شب ہو تو خوب اچھا تخلیہ حاصل ہوتا ہے، اُس بہشت کے گل ومیوہ توجہ ومناجات کے انوار اور ذوق وحضور کے آثار، بیدار دلی، آرام وقت، اطمینان قلب اور نورانیت ذکر ہیں، حضرات مشائخؒ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں بہشت کی لذتوں کا جو نمونہ رکھا گیا ہے وہ بوقت سحر ذوق مناجات ہے، شاہانہ لباس وطعام، ہرسبز وشاداب گلشن، حسین وجمیل صورتیں، رسیلی آوازیں اور اچھے اچھے مکانات بھی اگرچہ بہشت کے نمونوں میں سے ہیں لیکن بہشت تو سراپا آرام وراحت کا نام ہے اور یہاں سراسر محنت وغم ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک غم کو دوسرے غم سے بڑھکر بنا یا گیا ہے لہذا کم درجہ کا غم جب اونچے درجہ کے غم کو دور کردیتا ہے تو نفس وطبیعت اس سے ایک لذت محسوس کرتے ہیں، مثلاً بھوک ایک اذیت ہے اور روٹی کو ان مشقتوں اور حرکتوں کے ساتھ جو اسباب وآلات اختیار کرنے میں پیدا ہوتی ہیں، حاصل کرنا دوسری اذیت ہے، ایک اذیت کیا ہے اس کے اوپر تہ برتہ سینکڑوں صعوبتیں رکھ دی گئیں، بھوک کی آگ بجھانے کے لئے ان تمام مشقتوں کو آسان بنا دیا گیا۔ جب بھوک کی تکلیف دور ہوگئی اور طبیعت کو آرام حاصل ہوا تو اسی کا نام لذت رکھ دیا، حالانکہ حقیقت میں ایک تکلیف کو دوسری تکلیف سے دور کیا گیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی پیٹ بھرے یا پیاسے کو طاقت سے زیادہ کھانے پینے پر مجبور کردیا جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہ ہو، دوسری ان حالتوں کو بھی جنھیں عرف عام میں لذت کہا جاتا ہے اسی پر قیاس کرلیا جائے۔

کتنا اچھا ہے وہ عاقل جو اشیاء کی حقیقت سمجھ لے اور متاع دنیا کی حقارت اور اس کے فنا کا ادراک کرکے طبیعت اور شہوات جسمانی سے دور ہوجائے، اور نظر عقل کو لذت روحانی کے سمجھنے کی طرف مبذول کردے اور اس نسبت کا حصول دو طریقہ سے ہوتا ہے، فقر صبر، پائے حرص کا باندھنا، دندان طمع کا توڑنا اور زخارف دنیا سے قطع نظر اور عدم التفات، تاکہ درجۂ کمال تک پہنچ کر "الصبور" کا مظہر ہوجائے، اور بازوئے ہمت کا قوی رکھنا اور مرضیات حق کی طلب میں ثابت قدم رہنا تاکہ خزانہ "الشکور" کا طلسم بن جائے، بیشک یہ فقیر دنیا سے بے التفاتی

اور عدم نیاز مندی کی وجہ سے غنی ہے اور یہ غنی اپنی بے تعلقی، مجرد روی اور درویش پرستی کے باعث فقیر، کمال جامعیت یہ ہے اس کے علاوہ باقی سب بیکار۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ صبر وشکر ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ہم نے جو بات کہی ہے اس میں فقر وغنا ایک دوسرے کا عین ہیں۔

علما کا اس میں اختلاف ہے کہ فقیر صابر افضل ہے یا غنی شاکر؟ جو فقر کو افضل کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ سلامتی اور عصمت اسی فقر میں ہے کیونکہ یہ بڑی عصمت ہے کہ قدرت ہی نہ ہو، ایک بزرگ کا قول ہے کہ آدمی کے ہاتھ کے ناخن جب دراز ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مسلمان بھائی کا پیٹ پھاڑ دے، اور کبھی بھی کسی بھوکے پیٹ سے سیری وسرکشی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا اور فرعونیت ونمرودیت اس کے سر میں انڈے نہیں دے سکتی، دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ غنی سے ایسے ایسے کارنامے اور حل مشکلات ہوتا ہے کہ فقیر ان سے محروم وبیخبر ہے۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء

یہ تو متقدمین کا کلام ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ دونوں قضیہ کلیہ نہیں ہیں کہ ہر ایک کا صلاح وتقاضا دوسرے کے مشابہ ہو قل كل يعمل على شاكلته، فربكم اعلم بمن هو اهدى سبيلا، (یعنی آپ فرما دیجئے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہے، سو آپ کا رب اسے خوب جانتا ہے جو ہدایت کے راستہ پر ہے)، جس شخص کو فقر سازگار ہو کہ غنا اسے دائرہ سے باہر نکال پھینکے اس کے لئے فقر مناسب اور جس شخص کی غنا اس کو معتدل رکھے اور توفیق بھی حاصل ہو اس کے لئے غنا مناسب۔

حضرت شیخ ؒ نے اپنے شیخ ؒ کا عمل ذکر فرمایا کہ جب تک انھوں نے افضلیت فقر کا اعتقاد اقرار لسانی کے ساتھ ہم سے نہیں لیا زبان قبول نہیں کھولی اور نہ دست ارادت ہم سے قبول کیا، ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے لیکن تواضع وانکسار اس میں ہے کہ غنی کو چاہیئے کہ فقیر کو اپنے سے افضل سمجھے اور فقیر کو بھی اپنا حال غنی سے افضل نہ سمجھنا چاہیئے، تاکہ جانبین میں عجب وتکبر پیدا نہ ہو، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو حق یہی ہے ہر شخص کا انجام اور پروردگار کے ساتھ اس

کامعاملہ معلوم نہیں ؎

ہمہ بضاعت خود عرضہ میدھند آنجا
قبول حضرت او تا کدام خواہد بود

یعنی اپنا تمام سرمایہ اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں معلوم نہیں اس میں سے کیا قبول ہوگا۔

امید و بیم کے درمیان راستہ مقرر ہے حیرت ہی حیرت ہے اور تسلیم کے بغیر چارہ نہیں اعلموا ان اللہ شدید العقاب وان اللہ غفور رحیم (یعنی جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے) آخر میں رحمت کا ذکر آیا ہے (انشاء اللہ) رحمت ہوگی۔ والسلام

مکتوب نمبر ۱۵

بنام شیخ ابوالخیر محمد مبارک ؒ

رافع صوت النجیب بالمام ضعف المشیب

لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوۃ ثم جعل من بعد قوۃ ضعفا و شیبۃ یخلق ما یشاء وھوالعلیم القدیر (یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا کمزوری سے پھر اس کمزوری کے بعد قوت دی پھر اس قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا، وہ جو چاہتا ہے پیدا فرما دیتا ہے اور وہ علیم و قدیر ہے)، انسان پر پیدائش کے مختلف ادوار و اطوار طاری ہونے کے بعد یعنی نطفہ اور جنین کی تخلیق کے بعد اس عالم کون و فساد اور صورت عنصری میں ظاہر ہونے کے وقت سے تین درجات آتے ہیں ۱۔ بچپن، ۲۔ جوانی اور ۳۔ بڑھاپا پہلا درجہ (یعنی بچپن)، کمال ضعف و نقصان کا ہے کہ حصول لذت اور جسمانی و روحانی کمالات کا اکتساب اس زمانہ میں محال عادی ہے، اس زمانہ کی جو خوبی ہے وہ یہ ہے کہ وہ عقل کی کشمکش اور شریعت کے اوامر و نواہی سے آزاد ہے، اور چونکہ وہ ابھی اپنے مبدا سے قریب ہے اس مناسبت کی وجہ اس عالم جیسی فراغت اور جمعیت خاطر وغیرہ اس میں ہوتی ہے، حتیٰ کہ اہل عقل بھی حال گزشتہ کو یاد کر کے آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش ہم پہلے جس حالت میں تھے آج بھی اسی میں ہوتے.

دوسرا مرتبہ جوانی کا ہے جو انسان کی عمر کا خلاصہ اور نچوڑ ہے کہ اس کے قوائے جسمانی میں اعتدال، شوق ادراک میں اشتغال تحصیل کمال میں اشتداد اور قابلیت تکمیل نفس قریب بظہور ہوتی ہے، آفتاب عمر سمت الراس پر اور کامرانی عین شباب پر ہوتی ہے۔ اس وقت اگر توفیق کی دستگیری ہو جائے تو مقصود حاصل ہو جائے، ورنہ امید و آرزو جو اس زمانہ میں دل و ذوق کو تسلی دینے والی ہے نقد حاصل ہے۔

مرا امید وصال تو زندہ میدارد　　　دگرنہ صد رہم از ہجر تست بیم ہلاک

لیکن اس درجہ پر پہنچنے سے بھی جہالت اور تغافل کی غرض طاری ہوتی ہے جو عبرت کی آنکھ اور کان پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ جس سے دیکھنا اور سننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور تدبیر اور تفکر کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ اور مستی و غرور کی نیند غالب آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اچانک جوانی کی رات صبح کی سفیدی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ (یعنی اس پر تیسری حالت جو بڑھاپا ہے طاری ہو جاتا ہے) اس وقت آدمی کو اپنی گذری ہوئی زندگی ایک سانس کی مانند معلوم ہوتی ہے اس وقت وہ بڑھاپے کی کمزوری اور ناتوانی کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ کمزوری اور ناتوانی صورتاً اگرچہ پہلے درجہ کی کمزوری اور ضعف کی مانند ہے۔ لیکن ان دونوں حالتوں (یعنی بچپن کی حالت اور بڑھاپے کی حالت میں جو کمزوری ہے) میں فرق یہ ہے کہ بچپن کی کمزوری اور ناتوانی ایسی ہے جس میں رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ قوت آتی ہے۔ جس سے آدمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور پاؤں میں جمود آجاتا ہے۔ پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ کی بُرے بڑھاپے اور ذلیل عمر سے غرضیکہ ان تمہیدی مقدمات سے مقصود حسرت و تعجب سے اپنا ہی وجود ہے۔ کہ ایک دن عجیب پیش آنے والا ہے۔ نہ معلوم کہ کیا ہو اور کہاں جانا پڑے۔ بچپن اور جوانی ہر دونوں حالتیں گذر گئیں اور مراد حاصل نہ ہو سکی اور جو دل میں گرہ تھی وہ کھل نہ سکی۔ ہائے افسوس۔ ہائے افسوس۔ یہ کیا تھا اور کیا نہ تھا عمر تھی یا بالوریت کا خواب و خیال ؎

جوانی شد و زندگانی نماند　　　جہاں گو ہماں چوں جوانی نماند

(جوانی گذر گئی اور زندگانی نہ رہی جس طرح جہاں میں دوام نہیں جوانی بھی نہ رہی۔) اور مجھے خود عمر کے دو درجے حاصل ہوئے ہیں۔ بچپن اور بڑھاپا۔ رہی جوانی وہ تو زمانۂ حال کی مانند تھی جس کا وجود کالمعدوم ہے۔ اور میری تمام عمر ریاضت و محنت رنج و غم۔ ناکامی و نامرادی میں گذری ؎

من ندانم کہ زندگانی چیست　　　کامرانی چہ و جوانی چیست

(یعنی مجھے معلوم نہیں کہ زندگی کیا ہے۔ کامیابی کیا اور جوانی کیا ہے۔ اور میری حالت مصائب سے دوچار ہونے سے یہ ہے۔)

روزگارِ خوشی گر اگویند　　　دلِ خوش در جہاں کجا جویند

(یعنی لوگ اس زندگانی کو خوشی کی زندگی کیوں کہتے ہیں. خوش و خرم دل جہاں میں کیسے تلاشں کر لیتے ہیں۔)
اگر زمانہ ناسازگار ہو اور توفیق کام کی تیرے شامل حال نہ ہو. تو لمبی امیدیں باطل آرزوئیں۔ اور جھوٹے وعدوں سے منہ موڑ کر دماغ کو تروتازہ رکھکر مصروف بکار ہو۔ اب کس چیز پر دل لگائے بیٹھا ہے۔ اور کس حیلہ سے دل کو تسلی دے رہا ہے. جو راستہ تھا وہ مسدود ہو گیا اور تو نے مقصود کا منہ تک نہ دیکھا اور محبوب کے گلی کوچوں تک نہ پہنچ سکا۔ اگر محبوب منزل میں سامنے ہے. تو پاؤں چلنے کے لئے کہاں؟ اور طاقت اس تھوڑے سفر کی کہاں ہے۔ (لیکن پھر بھی) ہلاک شدہ دل۔ اور کمزور پاؤں سے چل کر راستہ میں آہ و بکا اور نالہ زاری کر شاید کہ تو اپنے مطلوب کو پالے اس لئے کہ اللہ کی ذات تو ہر چیز پر قادر ہے ۔

ھی الشمس مسکنھا فی السماء۔ فعز الفؤاد عزاءً جمیلا

فلن تستطیع الیھا الصعودا۔ ولن یستطیع الیک النزولا

۔ او آفتاب و منزل او بر سماءِ قدس — صبر کن اے دل از نتوانی وصول یافت
نے تو بسوئے دوست توانی عروج کرد — نے دوست جانب تو تواند نزول یافت

(ترجمہ:- یعنی وہ سورج ہے اور ٹھکانہ اس کا آسمانوں پر ہے. اے دل اگر اس کی طرف پہنچنا چاہتا ہے تو صبر سے کام لے نہ تو دوست کی طرف پرواز کر سکتا ہے۔ اور نہ دوست تیری طرف اتر سکتا ہے۔)
اس جگہ پھر دل امید و ناامیدی کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور وصالِ محبوب کی آرزو کا اشتیاق درجہ اشتداد تک پہنچ جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مکتوب نمبر ۱۶

بنام جناب نواب فرید مرتضیٰ خانؒ

تقسیم الانام علیٰ اربعۃ اقسام

لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ محمد رسول اللہ ۔ تمام آدمیوں کی چار قسمیں ہیں۔
اوّل ملوک دنیا و آخرت ۔ دوّیم ۔ فقراء دنیا و فقراء آخرت ۔ سوّیم ملوک دنیا و فقراء آخرت ۔ چہارم فقراء دنیا و ملوک آخرت ۔ دنیا و آخرت کے بادشاہ وہ لوگ ہیں ۔ جو دنیا میں خوشی و کامرانی ۔ سلطانی و حکمرانی پائیں ۔ اور آخرت کے لئے بھی اعمال صالحہ کا ذخیرہ جمع کرلیں ۔ اور نیک بختی و سعادت مندی کا خزانہ مرتے وقت اپنے ساتھ لے جائیں ۔ اور اپنے نیک اعمال کے بدلے بہشت اور دیدار خداوندی جیسی نعمتوں سے نوازے جائیں ۔
اور فقرائے دنیا اور ملوک آخرت وہ لوگ ہیں ۔ جو اگرچہ دنیا کی نعمتوں ۔ لذتوں اور آسائشوں سے محظوظ نہ ہوں مگر مرتے وقت ایسی دولت اپنے ساتھ لے جائیں کہ آخرت کی سعادت اور نیکی اور مختلف الاقسام انعام خداوندی حاصل کریں ۔ ان دونوں پر دوسری دو قسموں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے ۔ میں نہیں جانتا کہ میں ان چار قسموں میں سے کونسی قسم میں داخل ہوں ۔ یہ دو قسمیں جن کا ابھی ذکر ہوا ۔ ان کا درجہ اور مرتبہ بہت زیادہ ہے ۔ اے خداوند عالم میں اگر آپ کی توفیق سے ان میں کے کسی بھی مرتبہ تک پہنچا دیا جاؤں تو میری خوش بختی ہے ۔ اور یہ کام آپ کے لئے مشکل نہیں اس لئے کہ آپ تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں ۔ اللہ کا انعام و احسان فقراء و غرباء میں ظاہر ہوتا ہے ۔ جب ظاہری اور باطنی نعمتیں سب خداوند کریم ہی کی ذات سے حاصل کیجاتی ہیں ۔ تو بندہ کو سوائے شکر گذاری عجز و انکساری اور کچھ زیبا نہیں ۔ خدا تعالیٰ خود مسبب الاسباب ہیں ۔ وہ ناتوانوں اور کمزوروں کے دستِ بستہ اور پائے شکستہ کو درست فرما کر مقصود

تک پہنچاتے ہیں۔ اور دوسرے گروہ کو سعادت اور شرافت کے پالینے کی توفیق سے مخصوص فرماتے ہیں۔ اور ان کے اوقات اور احوال کی نگہداشت فرماکر انکی جمعیت خاطر اور فراغِ قلب کا باعث بناتے ہیں۔ اور ان کے اعمال صالحہ میں آپ کی دلالت خیر کارفرما ہوتی ہے۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذوالفضل العظيم (یعنی یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عنایت فرماتے ہیں اور اللہ تعالےٰ بڑے فضل والے ہیں) اسی طرح سے نظام عالم کا سلسلہ قائم ہے۔ اور جمیع اہل جہاں خدا کے فضل وکرم کے محتاج ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ممدو معاون ہیں۔ اور اسی جگہ کہا گیا ہے کہ فقر اور محتاجی فقیر کا شیوہ ہے اور جود وسخا اغنیار کا ؎

جود محتاج گدایاں صنعاف ہمچو خوباں کائینہ جویند صاف

کبھی خدا تعالیٰ فقیروں پر اغنیار کو فضیلت دیتے اور کبھی اغنیار سے فقرا کو ممتاز شان دیتے ہیں یہ سب اس کی نوازش کا نتیجہ ہے اور فقرا و اغنیاء سب اسی کے خوشہ چیں اور رہین نعمت ہیں۔ اس کی ذات بلند اور ملک بڑا ہے۔ انجام کار خیر ہو۔

مکتوب نمبر ۱۷

بنام نواب فرید مرتضیٰ خاںؒ بر واقعہ وفات اکبر بادشاہ

تنبیہ الغافلین بفناء الدنیا و اربابہا

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ سبحان الملک الحی الذی لا یموت ولا یفوت (پاک ہے ذات اس بادشاہ کی جو ہمیشہ زندہ ہے نہ اس پر موت آئے گی نہ وفات) اس سانحہ عظیمہ اور شدیدہ سے مخلوق کے دلوں کے صفحات پر رنج و الم کی لہریں دوڑ گئیں۔ اور مجھے بھی اس ناگہانی حادثہ نے کچھ لکھنے اور تحریر کرنے پر مجبور کر دیا۔ کیا کیا جا سکتا ہے سنت الہٰی اسی طرح جاری ہے اور رہے گی۔ کیا بادشاہ اور کیا فقیر سب کو اسی راستے سے گذرنا ہے۔ ؎

ہر کہ آید بجہاں اہل فنا خواہد بود آنکہ پایندہ و باقی است خدا خواہد بود

(یعنی جو چیز بھی اس جہاں دنیا میں آئی اس کے لئے بقا نہیں بلکہ وہ اہل فنا میں سے ہے۔ اور جو باقی اور ہمیشہ رہنے والی چیز ہے وہ خدا کی ذات ہے) اللہ تعالیٰ اس گرامی قدر اور جوان بخت بادشاہ کے جلال ملک اور اقبال کو ہمیشہ رکھے۔ تمام مخلوق کو خواہ خاص ہو یا عام اور خصوصاً اہل اسلام کو اس نیک سیرت بادشاہ نے اپنے عدل و احسان کے زیر سایہ رکھا۔ اور مکروہات و آفات سے محفوظ رکھا۔

اللھم اصلح الامام والامۃ والراعی والرعیۃ والف قلوبھم فی الخیرات (اے اللہ اصلاح فرما امام اور امت کی راعی اور رعیت کی اور محبت ڈال دے ان کے دلوں میں نیکی اور بھلائی کی) یہ دعا بڑے بڑے بزرگوں سے مروی ہے۔ اس کے پڑھنے سے دنیا و آخرت کی سعادت اور امن و امان میسر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ دعا بھی مروی ہے۔ اللھم اصلح امۃ محمد اللھم ارحم امۃ محمد اللھم اغفر لامۃ محمد (اے اللہ محمدؐ کی امت کی اصلاح فرما۔ اے اللہ محمد کی امت پر

رحم فرما۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بخشدے) کہا گیا ہے کہ جو شخص اس دعا کو ہمیشہ پڑھتا رہے۔ مراتب عالیہ پائے واللہ الموفق۔ اب میں دنیا کی بے ثباتی پر کیا کہوں اور کیا لکھوں؟

بعض حکما نے فرمایا ہے۔ الدنیا اشبہ شیئ بظل انعمام ونوم الاحلام یعنی دنیا بادل کے سایہ کی مانند ہے جو جلدی سے گذر جاتا ہے۔ یا مانند شیطانی خواب کے جو بالغ مرد دیکھتا ہے۔ مثال اول میں تو دنیا کی بے ثباتی کو دکھایا گیا اور ظاہر کیا گیا ہے۔ اور دوسری مثال میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ دنیا کا مال و اسباب قلیل و حقیر ہے۔ مصرع۔ گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانہ (یعنی یہ دنیا یا مثل خواب کی ہے یا ہوا کی یا افسانہ کی) بیشک موت آنے والی ہے مگر آدمی اس سے غافل ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا مقولہ ہے۔ کہ ایک چیز ایسی ہے۔ کہ آدمی کو اس کا یقین ہے۔ مگر پھر بھی شک و شبہ کرتا ہے اور وہ موت ہے۔ کہ ہر شخص اس کے آنے پر یقین رکھتا اور خوب جانتا ہے کہ موت ضرور آنے والی ہے مگر افعال ایسے کرتا ہے گویا کہ اس کو موت کا کوئی علم ہی نہیں۔ بلند ہے ذات اللہ تعالیٰ کی معلوم نہیں اس میں کیا قدرت ہے۔ اور یہ کیا پردہ ہے جو آدمی کی عقل پر پڑا ہوا ہے۔ یہ کیا غفلت اور فریب ہے کہ جو چیز اس کو کھانے والی ہے یہ اس سے بھاگ رہا ہے۔

حکایت:۔ نقل ہے کہ ایک جنگل میں ایک آدمی کے پیچھے شیر چیرنے پھاڑنے کے لئے دوڑا اس آدمی نے اپنے پیچھے شیر کو دوڑتے ہوئے دیکھ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ بہت بھاگ رہا ہے لیکن شیر بھی پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے جب وہ آدمی تھک گیا تو جائے پناہ تلاش کرنے لگا اتفاقاً سامنے ایک ویران کنواں نظر آیا جس کے اردگرد گھاس تھی اس نے گھاس کو پکڑ کر کنویں کے اندر چھلانگ لگا دی اوپر شیر کھڑا انتظار کر رہا ہے کہ جب نکلے تو اس کو اپنا لقمہ بناؤں۔ پھر اس نے جو نیچے دیکھا تو ایک اژدہا (سانپ) منہ کھولے بیٹھا ہے کہ یہ گرے اور اس کو کھا کر اپنا پیٹ بھروں۔ اس وقت اس کو دو خطرے لاحق ہوئے اوپر آتا ہے تو شیر سے بچنے کا راستہ نہیں اور نیچے گرتا ہے تو سانپ سے بچنے کی کوئی سبیل

نظر نہیں آتی ۔ان دونوں خطروں سے بچنے کے لئے اس نے سوچا کہ صرف گھاس ہی ایسی چیز ہے کہ اس کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی جان ان دو مضبوط خطروں سے بچائی جا سکتی ہے۔جب اس نے اپنی توجہ گھاس کی جانب مبذول کی تو اس کو دو چوہے کاٹ رہے ہیں۔اس صورت میں گھاس کا پکڑنا اور نہ پکڑنا دونوں برابر ہیں۔اسی پریشانی میں اچانک اسکی نظر کنویں کی دیوار پر پڑی اس میں شہد تھا وہ اپنی انگلی سے شہد کو چاٹنے لگا اور ایسا محو ہوا کہ ان تینوں مصیبتوں سے بے خبر ہو گیا حقیقت میں شیر تو موت ہے۔کنواں دنیا ہے اور سانپ قبر ہے اور گھاس عمر اور چوہے دن اور رات ہیں ۔جو عمر کے رشتہ کو کاٹ رہے ہیں۔اور شہد دنیا ہے کہ اس کے حاصل کرنے میں آدمی باوجودیکہ موت کے آنے کا یقین رکھتا ہے سب چیزوں کو بھول جاتا ہے۔کاش کہ زندگی کی مدت معلوم ہوتی کہ اتنی ہے تاکہ اس کے مطابق کوئی راستہ اختیار کیا جاتا۔اور پھر اس زندگی کی معلوم مسافت کو بڑے اسلوب سے اور بتدریج طے کرتا۔اور اس کے بعد ایک قسم کی فراغت اور قرار پاتا۔لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ زندگی کی مدت کتنی ہے اور بعد اس مسافت کا کس قدر ہے۔ہر وقت اور ہر نفس کے ساتھ خطرہ ہے کہ شاید یہ آخری سانس ہو۔اسی طرح ہر دن۔ہفتہ اور ماہ و سال کا حال ہے۔اور اگر فرض کر لیں کہ ہمیں علم بھی ہو جائے اور یہ راز ہم پر ظاہر ہو جائے تو کیا فائدہ جب اس جہاں سے گذر کر اگلے جہاں میں جانا ہی ہے تو معلوم اور نامعلوم دراز اور کوتاہ سے کیا حاصل ؎

چوں قامت ما برائے غرق است کوتاہ و دراز را چہ فرق است

(یعنی جب ہمارا وجود غرق ہونے ہی کے لئے ہے۔تو بڑے اور چھوٹے میں کیا فرق)

دنیا اور اسباب دنیا اگر ہمیشہ کے لئے ہوتے اور عیش خاطر اور آسائش وغیرہ بھی اس کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے تو پھر بھی اگر ایک آدمی شوق مولیٰ اور محبت رب میں ان کے نہ ملنے پر صبر کرے اور ان چیزوں پر کوئی توجہ نہ کرے تو دیدار مولیٰ اور محبت رب ان سب چیزوں سے اولیٰ اور افضل ہے۔لیکن

جب یہ یقین ہے کہ دنیا اور اس کے اسباب سب کے سب فانی اور سراسر وحشت و کدورت اور باعث محنت و مشقت ہیں۔ تو پھر ان کے فوت ہونے پر حسرت اور تاسف کیوں۔ اور اگر کوئی آدمی بقدر ضرورت اپنے کو اس دنیائے ناپائدار کے کاموں میں مصروف کر لیتا ہے تو وہ اپنی جان پر صدہا مصائب کو دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس شراب کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے ہر گھونٹ اور قطرے سے حرص بڑھتی جاتی ہے۔ اور پیاس ختم ہونے کے بجائے اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پینے والے کو مست اور بے خبر کر دیتی ہے۔ اور کسی نصیحت کو کان میں جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ اور آخر کار اس مستی اور غرور میں خدائی دعوٰی بھی کر لیتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں کیا کہوں فرعون ہی کو لیجئے جس کی سرحد زمین مصر تھا۔ اور ملک اس کا معمولی تھا۔ اس نے دعوئے خدائی کر دیا۔ دوسروں کے بارے میں کیا کہوں وہ تو خداوند کریم کی ذات ستودہ صفات سے بھی بے خبر ہو گیا۔ کیا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ خدا تعالٰے زمین و آسمان کے پیدا فرمانے والے ہیں۔ اور اس سے ایک مکھی اور مچھر بھی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر وہ (فرعون) دیوانہ بھی نہ تھا کہ اس نے اپنی دیوانگی میں ایسی باتیں کہی ہوں۔ بلکہ اس کو نصیحت کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السّلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور پیغمبر تو عقلمندوں کو سمجھانے کے لئے آتے ہیں نہ بیوقوفوں اور دیوانوں کو یہ دیوانگی نہ تھی بلکہ ملک و سلطنت دنیا اور اس کے اسباب کا غرور اور مستی تھی جو باوجود عقلمند ہونیکے بیوقوفوں کے سے کام کرتا تھا۔ اور باتیں دیوانوں کی سی کرتا تھا حالانکہ وہ دیوانہ نہ تھا۔ پھر بعض دیوانہ صفت لوگ پیغمبری کا دعوٰی کرتے ہیں اور حالانکہ ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ پیغمبر کس کو کہتے ہیں۔ حالانکہ پیغمبر نام ہے میاں جی کا۔ یعنی خداوند کریم سے فیض حاصل کر کے مخلوق خدا میں تقسیم کرنا۔ اور پیغمبر بچپن سے آخر عمر تک گناہوں سے معصوم ہوتا ہے۔ اور عالم قدس تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس پر ایک فرشتہ آتا ہے۔ جو خدائی پیغام اس تک پہنچاتا ہے۔ اور اس کے وجود سے معجزات کا ظہور ہوتا ہے۔ زمین و آسمان اس کی مدد و نصرت کرتے ہیں۔ وہ اپنی انگلی کے اشارہ سے چاند کے "ٹکڑے" کرتے ہیں اور ان کی انگلیوں سے پانی

کے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ اور درخت ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ پتھر اور گھاس سلام کرتے ہیں اور ان کے پاس ایک کتاب ہوتی ہے۔ اگر جن و انس دونوں مخلوقیں جمع ہو کر اس کی ایک سورت کی مثل بنانا چاہیں تو نہ بنا سکیں۔ اور اگر تمام عقلمند اور علماء اس کی تفسیر کرنا چاہیں تو اس کی حقیقی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکیں اور پیغمبر ایک شریعت لاتا ہے جس کے علم اور نور سے جہاں کے ایوانوں کو منور کرتا ہے۔ کافروں کو کفر سے اور جاہلوں کو جہل سے نمایاں کرتا ہے۔

اور دور لوگوں کو اپنے قریب کرتا ہے۔ گمراہوں کو راستہ دکھاتا ہے۔ وہ ظاہر اور باطن سیرت اور صورت کے اعتبار سے سب مخلوق سے افضل ہوتا ہے۔ اور کسی کے اندر اس جیسی خوبی نہیں ہوتی پیغمبر اپنی امت کو علم و عمل کے زیور سے آراستہ کرتا ہے۔ اور اپنے قریب ترین لوگوں کو علم و عمل زہد تقویٰ اور نورانیت سے پیراستہ کرتا ہے۔ اور اس کی اتباع کرنے والا جامع کمالات اور صاحب کرامات بن جاتا ہے۔

آدمی کے اندر تین چیزیں ہیں۔ اوّل نفس۔ دوئم قلب۔ سوئم روح۔ جبلت نفس عالم کون و فساد سے ہے اور اسی سے جسمانی لذتیں متعلق ہیں۔ اور نفس ایک زمین و ظلمت اور بدن کے اجزاء میں سے ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ بہ نسبت دوسروں کے اس قدر لطیف ہے کہ حسی اشیاء کو دریافت کرتا ہے۔ اور اس کا مادہ۔ سمع بصر شم۔ ذوق اور لمس ہے۔ اور نفس ایک ایسی چیز ہے جو عقلی اور روحانی چیزوں سے ناواقف ہے جو آدمی کو اس جہاں کے مصائب اور دیگر چیزوں میں لگا دیتا ہے۔ اور روح شی لطیف و نورانی ہے جو عالم بالا سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی توجہ ہمیشہ عالمِ قدس اور اس کے علم و معرفت سے رہتی ہے وہ ہمیشہ خداوند کریم سے محبت اور اس کی ذات و صفات کی معرفت میں مصروف رہتی ہے۔ لیکن اس کا بدن سے اختلاط اور میاں بیوی کا سا تعلق ہے۔ اس لئے کبھی نفس کے عشق و محبت میں گرفتار ہو کر حقیقی راستہ سے پھر جاتی ہے۔ اور قلب نفس اور روح کے درمیان رہتا ہے۔ اگر ایک پر احکام روحانی غالب آ گئے تو قلب اور نفس اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت نفس سے بھلائی اور نیکی کا صدور ہوتا ہے۔ اور اگر نفس غالب

آگیا تو روح اور قلب اس کے تابع ہوتے ہیں۔ پھر نفس سے شر اور فساد کی بلائیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس بیان سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ تذبذب اور رسہ کشی کے عالم میں مبتلا رہتا ہے۔ آدمی آخر آدمی ہے ایک طرف تو اسے عقل کھینچتی ہے اور دوسری طرف دوسری چیز ہزاروں قسم کی مصیبتیں اس کے پیچھے ہیں جن میں یہ گرفتار ہے۔ پھر ان مصیبتوں اور مشقتوں کا نام، جہان ہے جو اس کے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر یہ احوال آخرت اور اس کی مشکلوں کو دیکھے تو زار و قطار روتا رہے جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً۔ یعنی اگر تم وہ چیز جان لو جو میں جانتا ہوں جو عالم آخرت میں پیش آنے والی ہیں۔ کہ کس طرح وہاں پہنچنا ہوگا اور کیا کیا پیش ہوگا تو پھر کم ہنسا کرو اور زیادہ رویا کرو۔ لیکن ان حالات کو بھی خداوند کریم نے ایک خاص حکمت کی بنا پر اس جہان سے پوشیدہ رکھا ہے۔ اور جو کچھ یہ دیکھتا ہے یہ عالم ظاہر ہے۔ (یعنی عالم آخرت کو تو دیکھ نہیں سکتا اس لئے اس کی فکر نہیں اور جس کو دیکھ رہا ہے وہ عالم ظاہر ہے اس لئے خوشی میں ہے) اس لئے دھوکے میں ہے اور حقیقی راستہ کو گم کئے ہوئے ہے۔ یعلمون ظاهراً من الحیوٰة الدنیا وهم عن الاخرة هم غافلون (یعنی یہ لوگ عالم ظاہری کو جانتے ہیں اور عالم آخرت کے سلسلہ میں غافل ہیں) حضرات مخبرانِ صادق جو انبیاء علیہم السلام ہیں خبر اس جہاں کی دیتے ہیں اور علم و ہدایت کی روشنی دکھاتے ہیں لیکن لوگ نفس اور طبیعت کے اندھیروں میں اس طرح ملوث ہیں کہ وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بات پر کان نہیں دھرتے۔ لیکن حقیقت حال مرنے کے بعد واضح ہو جائے گی کہ کیا ہے ؎

باش تا پردہ بر انداز د جہاں از روئے کار
آنچہ امشب کردۂ فردات گردد آشکار

(یعنی تو اس طرح ہو گیا کہ جہاں نے تیرے کاروبار پر پردہ ڈال دیا۔ لیکن جو چیزیں تو رات کو کر رہا ہے صبح ہوتے ہی سب ظاہر ہو جائیں گی) لوگ غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے ہیں جب مر جائیں گے تو بیدار ہوں گے پھر معلوم ہوگا کہ ہمارے کرتوت کیسے تھے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس وقت اگر کہیں گے تو بے سود ہوگا اور اس وقت یہ بات ان کے عمل کی نقیض ہوگی۔

اعتراض:۔ بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر عالم دنیا میں بھیجدیا دنیا میں رہتے ہوئے اس کو ہر چیز کی ضرورت پڑتی رہے گی اور یہ ان چیزوں کا محتاج رہے گا اس کے حاصل کرنے کی کوشش اور سعی بھی کرے گا۔ اس صورت کے ہوتے ہوئے یہ مخلوق سے جدا کیسے رہ سکتا ہے اور اپنی طبیعت اور نفس کے خلاف کیسے کر سکتا ہے۔ اس کا حکم تو امر محال ہے۔ ان ساری چیزوں پر تو عالم دنیا کے نظام کا مدار ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ہماری بات کو سن کر جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ دراصل ہماری بات کی کنہ اور حقیقت تک نہیں پہنچتے اور انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ ترک دنیا اور مخالفت نفس اور طبیعت سے ہماری مراد کیا ہے ان سب علائق کو ترک کرنے سے ہماری مراد یہ ہے۔ کہ خداوند کریم کی نافرمانی نہ کیجائے۔ اور روشن راستہ کو جس کا نام شریعت ہے اختیار کیا جائے۔ اگر کوئی آدمی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے بظاہر تو وہ دنیا داروں سے معلوم ہوگا لیکن حقیقۃً اس کا تعلق خداوند کریم ہی سے ہے۔ اور وہ تارک دنیا ہی ہے۔ اگرچہ اس صورت میں وہ نفس کے موافق ہی عمل کیوں نہ کر رہا ہو۔ اِس لئے علماء محققین کا کہنا ہے۔ کہ مقصود اصلی حق تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے نہ نفس کی مخالفت یعنی صوفیائے کرام نفس کے خلاف چلتے ہیں اور جو نفس کہے اس کے برعکس کرتے ہیں۔ اِس لئے یوں کرتے ہیں تاکہ نفس خدا تعالےٰ کے احکام کے تابع ہو جائے۔ اور راہِ راست پر آجائے اور اگر نفس پہلے سے ہی راہ راست پر ہے تو اس کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ فقراء ہوں یا اغنیاء امراء ہوں یا رعایا۔ مالک ہوں یا مملوک۔ خادم ہوں یا مخدوم وغیرہ ذالک۔ فقراء کو تو صبر چاہیئے اور اغنیاء کو شکر۔ امراء کو عدل و انصاف اور رعایا کو انقیاد و فرمانبرداری۔ مالکوں کو رحم اور نرمی اور مملوکوں کو خدمت۔ خادموں کو ادب اور مخدوموں کو عنایت۔ ہر گروہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے اپنے راستہ پر چلے بندگی اور انصاف کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے اس پر پابندی سے عمل کر کے خدا کا واصل اور مقرب بن جائے۔ اس جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر گروہ کے لئے اپنا اپنا مشغلہ اور کام متعین ہے۔ اگر وہ اپنے متعین کردہ راستہ پر چلے تو وہ سالک ہے۔

اور شریعت غرا کا حکم بھی اسی طرح سے ہے۔ سرور کائنات سید رسل صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہٗ کسی فرد کو اس کی حرفت اور جس کام کے وہ لائق ہوتا تھا اس سے نکال کر دوسرے کام میں نہیں لگاتے تھے۔ مزارعوں کو زراعت کے لئے۔ تاجروں کو تجارت کے لئے۔ متأہلوں کو اہل و عیال کے لئے۔ مجردوں کے لئے علیحدگی اور اغنیاء کو مال و منال کے لئے فقراء کو فقر و فاقہ کے لئے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ لیکن ہر طائفہ اور گروہ کے لئے ایک دستور العمل اور قاعدہ متعین فرما دیتے تھے تاکہ وہ اس پر عمل کرے اور اس سے باہر نہ جائے اگر باہر جائے تو کفر و فسق سرزد ہو۔ سعادت مندی اور نیک بختی کا سرا اور بھید شریعت کے سامنے اپنی گردن کو جھکا دینا ہے۔ اور یقین رکھنا اس بات کا کہ ہر عمل کا اجر ہے اور ہر کام کی جزا ہے۔ اور نیک عمل کا انجام نیک اور برے کا برا فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ،

خلاصہ کلام یہ کہ ایک گروہ اپنے اعمال کی جزا کو دنیا میں طلب کرتا ہے۔ اور دوسرے گروہ کا مطمح نظر آخرت ہے اور دنیا کے کاروبار تو سب آخرت کے بن سکتے ہیں مثلاً ہر کام شروع کرتے وقت نیت یہ کر لی جائے کہ یہ کام خدا کے لئے ہے تو وہ بھی کارِ آخرت ہے۔ فعند اللہ ثواب الدنیا والآخرۃ عاقبت بخیر باد۔

مکتوب نمبر ۱۸

بنام نواب خانخاناں صاحب

سلوک اقرب السبل بالتوجہ الی سید الرسل

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللّٰہم کما انعمت فزد و کما زدت فادم و کما ادمت فبارک (یعنی اے اللہ جیسے آپ نے انعام فرمایا تو اسی طرح اس کے اندر اضافہ فرمائیے اور جیسے آپنے اضافہ فرمایا اس کو دائم رکھئے جیسے آپ نے دائم رکھا تو اس کے اندر برکت عطا فرمائیے) جناب والا کا حکم موصول ہوا کہ یہ حقیر کبھی کبھی اپنی معروضات حوالۂ قلم کرتا رہے سو آپ کا ارشاد بسر و چشم مگر اپنی شبانہ روز کی کچھ مصروفیات ایسی ہیں جو امتثال امر میں مانع ہیں جب میں اس مقام پر پہنچا تو مقاصد و معانی متزاحم ہوئے کچھ تو ایسے تھے جو فقراء اور مساکین کے حال کے مطابق اور کچھ ایسے جو میرے لئے باعث تکلیف بنے اور ان کا اظہار مساکین کے حال کے مناسب ہی نہیں جنہوں نے تردد اور تعارض میں مبتلا کر دیا۔ اس لئے خدا تعالےٰ ذات ستودہ صفات سے دعا رہے جو فقیروں کا اصل و اصول ہے۔ اور اسی سے اپنے مقصد کی جانب پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی دعا و استمداد اور طلب و توفیق ہی ایک ایسی چیز ہے جو نیک مقاصد کے لئے مفتاح اور چابی ہے۔ اور تمام مرادوں کے حاصل کرنے کا مقدمہ ہے۔ اسی لئے لوگوں کی کہاوت ہے کہ شوقِ مطلوب اور جذبۂ طلب طالب کے باطن میں اس طرح ہونا چاہیئے کہ اگر دنیا کے سب عقلاء و حکماء جمع ہو کر اس کے مطلوب کے حاصل کرنے کو مشکل قرار دیں تب بھی وہ اپنے مطلوب کی جستجو میں مصروف رہے یہ ہے طلب صادق ؎

این نشان دولت و آیات تست   این طلب مفتاح مطلوبات تست

(یعنی ایسی طلب ہی تیری نشانیوں میں سے ہے۔ جو سب مطلوبات کے لئے مثل چابی کے ہے۔)

لیکن ایسی کیفیت کا پیدا ہونا نادر رہے مگر پھر بھی نا امید ہو کر مایوس نہیں ہونا چاہیئے بلکہ یہ امر لازمی ہے کہ جو چیز تمام حاصل نہ ہو وہ پوری کی پوری ترک نہ کر دی جائے بلکہ اس کا جتنا حصہ ہو سکے غنیمت ہے۔ ثابت قدمی سے اس راستہ پر قدم رکھ اور کام میں مصروف ہو فارغ نہ بیٹھ کہ اصل اور عمدہ چیز اس راستہ میں کام ہے اور مطلوب کے راستہ میں للچائی ہوئی نظریں رکھ کر بیکار بیٹھے رہنا محض خیال اور ہوس اور سرد لوہے کو کوٹنے کی مانند ہے اور اگر اس کام کو کسی مرد صاحب درد کے سایۂ عاطفت میں کریں تو اس کی خاصیت اور تاثیر جداگانہ ہے۔ اس سے جو آپ سو سال میں حاصل کریں۔ اگر ایک ساعت ان نیک لوگوں کی صحبت محبت اور الفت سے نصیب ہو جائے تو وہ سرمایۂ عمر بلکہ زاد آخرت ہے۔ اور ان لوگوں کی صحبت سے نور ایمان اور یقین دل میں آوے۔ اور اس طرح سے دل میں منقش ہو جائے کہ اس کا مٹ جانا اور زائل ہونا محال اور متعذر ہووے۔ اور ایسے علوم اور حِکَم آئیں جو بواسطۂ عمل اور قوت کے حاصل ہوں۔ اس جگہ بات مرد شناسی اور ولی کی پہچان کی بھی زیر بحث لانا مناسب معلوم ہوتا ہے جو امر عظیم ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ آسان فرما دیں۔ فقہاء اور متکلمین کی ایک جماعت جو سلامتی کے راستہ پر چل رہی ہے وہ فرماتے ہیں الولی ھوالعارف باللہ علیٰ قدر طاقۃ البشریۃ مواظباً علی الطاعات غیر منھمکٍ فی الشھوات (یعنی ولی وہ ہے جو اپنی بشری طاقت کے موافق اللہ تک رسائی رکھتا ہو اور اللہ کی عبادت میں ہمیشہ مصروف اور شہوات نفسانیہ سے دور رہتا ہو) لیکن یہ مسئلہ فروعی ہے اولیاء اللہ کی پہچان خدا پر چھوڑی جائے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے دوستوں کو بہتر جانتے ہیں میرا مقصد یہ ہے کہ ہمارے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ جو ہم کو راہِ راست دکھائے اور نیکی کا امر کرے۔ اور میرے اور دوسرے لوگوں کے پیر حضرت خواجہ شیخ محی الدین ابو محمد عبدالقادر جیلانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ آدھی رات کو اٹھ کر وضو کیا جائے اور دو رکعت نفل ادا کرنے کے بعد سجدہ میں الحاح وزاری کے ساتھ فریاد کی جائے اور اس دعا کو پڑھا جائے۔

یَارَبِّ یَارَبِّ دُلَّنِیْ عَلٰی عَبْدٍ مِنْ عِبَادِكَ الْمُقَرَّبِیْنَ یَدُلُّنِیْ عَلَیْكَ وَیُعَلِّمُنِیْ طَرِیْقَ

الوُصُولِ اِلَیْکَ (یعنی اے میرے رب اے میرے رب مجھے اپنے مقرب بندوں میں سے کوئی ایسا بندہ بتلادے جو آپ تک پہنچنے کا مجھے راستہ دکھادے) اگر یہ دعا اسی طریقہ سے دوام اور استمرار سے پڑھی گئی تو امید ہے کہ گوہر مطلوب ہاتھ آئے اور پردے کا نقاب مراد کے چہرہ سے اٹھ جائے۔ اور اسی طرح سے مانگنے میں اسکی اجابت کا تجربہ ہے فالحمد للہ۔ اور اسی طرح ہر وہ دعا جو امور اُخرویہ سے متعلق ہو صدق دل سے مانگنے سے قبول ہوتی ہیں۔ اور اگر اس کی وہ دعا جو امور دنیوی سے متعلق ہو اس کی قبولیت میں دیر ہو جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں شاید کہ اللہ کے ہاں طالب کی بھلائی اسی میں ہو۔ لیکن وہ ادعیہ جو امور دینیہ سے ہیں ان کی اجابت میں تیرے لئے امان ہے۔ اور اس کی عطایا تو سوال کرنے سے ملتی ہیں۔ لیکن صاحب ہمت جو ماسوی اللہ سے قطع ہو کر صرف خداوند کریم سے استدعا کرتا ہے اور عدم اجابت کی صورت میں اس کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں لیکن جن کے شامل حال خدا کی توفیق ہوتی ہے تو ان کی اجابت بایں صورت ہوتی ہے کہ ان کے لئے باری تعالےٰ دنیاوی نعمتوں کو آخرت کی سعادت کے لئے وسیلہ بنا دیتے ہیں، اور ان کے لئے دارین کی سعادتوں کو باقی اور دائم رکھتے ہیں۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اس سے بالاتر اور درست راستہ ایک اور ہے جس کو متاخرین مشائخ شاذلیہ قدس اللہ اسرارہم نے اپنے مریدوں کو بتلایا کیا متاخرین اور کیا متقدمین سب نے اسی راستہ کو صحیح بتلایا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں اور اگر ہے تو وہ طالب کو اپنے مطلوب تک پہنچانے والا نہیں اور وہ درست ہونا توجہ کا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو منبع جمیع کمالات ہیں ان کے دربار میں دواماً التجا کرتے رہنا ہے۔ اقتباس از انوار ہدایت۔ کہتے ہیں کہ یہ طریقہ امام المسلمین حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بہت سے مسائل میں علماء کرام کے اختلاف کے باوجود اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حقیقی حیات سے جس میں مجاز کا شبہ نہیں قائم اور دائم ہیں اور اپنی امت کے اعمال آپ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اور طالبان حقیقت کے مربی اور فیض پہنچانے والے ہیں۔ سلوک کے افضل اعمال اور اقرب وسائل میں یہ طریقہ ہے کہ

اپنے پہلے گناہوں سے توبہ کی جائے آئندہ گناہ کے قریب تک نہ جایا جائے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود پاک پڑھا جائے اور کلمۂ توحید کا کثرت سے ورد کیا جائے جو کہ اصل مقصود ہے۔ اور بزرگوں کی مجلس میں یہ خیال کر کے بیٹھ کہ سعادت ازلی اور عنایت کبریٰ نے ان لوگوں کو سب مخلوق سے ممتاز کر دیا ہے۔ اگر ان دلائل اور شواہد کے ہوتے ہوئے کوئی آدمی اس طریق سے انکار و انحراف کرتا ہے تو اس پر ہزار برس ایسی باتوں کے کہنے سے کوئی اثر نہیں ہوگا اور وہ ہماری بات کو نہیں سمجھے گا اور اس جیسا دنیا میں کوئی بے وقوف نہ ہوگا پس ہم اللہ سے ایسی بے وقوفی سے پناہ مانگتے ہیں۔ میں نے جناب والا سے عرض کر دیا ہے کہ شرعاً۔ عقلاً۔ عرفاً اس طریق کو اختیار کرنا فرض عین ہے۔ اور اسی میں مصلحت ہے اس طریقہ میں تردد اور توقف دور از کار بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اس راستہ پر ثابت قدم رکھے۔ افسوس میرا روئے سخن اور مراد کچھ اور تھی لیکن میں چلا کہیں اور گیا تو اس بارے میں مجھے معذور تصور کیا جائے اس لئے کہ ہاتھ کی عنان میرے قبضہ میں نہیں بزرگوں کی مجلس میں حاضر ہو کر یہ تصور رکھ کہ اگر دوسری جگہ نصف مشاہدہ نصیب ہو تو اس جگہ مکمل مشاہدہ بلکہ حضوریٔ کامل و اکمل حاصل ہو۔ سعادت مندی۔ اور بزرگی۔ توفیق و استقامت۔ رعب و جلالت۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملے جس میں دوام اور استمرار ہو۔ جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل اطہار کو نصیب ہوئی۔

مکتوب نمبر ۱۹

بنام نواب خانخاناں صاحب

التعطش والدوام فی طلب المقصد والمرام

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ وفوق کل ذی علمٍ علیمٌ (یعنی ہر علم والے پر ایک بڑا علم والا ہے) مجموعۂ لطیفہ شریفہ کے اجمال سے یہ بات بھی ہے کہ جو رسائل حکمیہ اور حقیقیہ ہیں ان کو دیکھ کر طبیعت میں تحیر اور تلون پیدا ہوتا ہے۔ اور آخر کار یہ بات عین الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے کہ قوت اور امداد خداوندی بعضے لوگوں پر بایں صورت ہوتی ہے۔ کہ باوجود دنیا کے مال واسباب اور عیش و راحت فرحت وسرور کے ان کی توجہ صرف لذات روحانیہ کے حاصل کرنے کی طرف ہوتی ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتے ہیں عنایت فرماتے ہیں۔ اس جگہ ایک دقیقہ دوسرا بھی ہے کہ ان کی طبیعتوں میں علوم عقلیہ پر نظر عمیق رہتی ہے اور وہ اس کے دقائق اور حقائق کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں جس کو لوگ علم حکمت کہتے ہیں۔ اس سے غرور اور تکبر پیدا ہوتا ہے جس سے نظر و فکر ہمیشہ اعتقادات ملیہ کے ظواہر پر رہتی ہے۔ اور مذاہب سمعیہ ساقط ہو جاتے ہیں۔ اور شریعت کو حکمت کے تابع بنا کر اعتقادات شرعیہ کے اندر رکیک تاویلات کرتے ہیں۔ ان کی نظر صرف معانی پر ہوتی ہے۔ ہاں جس کو اللہ تعالیٰ بچالیں مگر اس کا وجود نادر ہے۔ ہم گداگروں کو اس کوچے اور گلی کی احتیاج نہیں کہ دوسروں کے ذہن کے تابع رہیں۔ ہزار بوعلی اور ارسطو اس دریا کے اندر داخل ہوئے اور باہر نہ آسکے۔ اب تو مشاہدہ اور برہان سے ان لوگوں کا حال واضح ہو چکا ہے۔ مزید کاوش اور تحقیق کی ضرورت نہیں اور زمرۂ فقراء وغرباء کا جو خداوندی علوم حاصل کر کے خاموشی اور بے زبانی سخن دانی۔ ودانش اندورنی سیکھتے ہیں پھر طلب کی وادی میں صدق اور یقین سے قدم رکھتے ہیں۔ یہ عقلاء اور حکماء جن کا ذکر ہوا صراط مستقیم سے پھرے ہوئے ہیں۔ جو ہر آدمی کو عاقبت کی راہ نہیں دکھلاتے اور نہ

ہی اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خدا کی طلب میں مصروف ہیں یقین ہے کہ یہ طلب آخر کار بار آور ہوگی اور دعا یہ ہے اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ اور اس فقیر کا نصیبہ ان مجموعوں میں سے چند فقرے ہیں جو کہ رسالہ بارقہ الہٰیہ سہروردیہ شہابیہ مقتولیہ کے خطبہ میں ہیں جو وقت وحال کے بہترین مناسب ہیں۔ اور بعض رسائل افضلیہ تاشیہ ہیں جو متانت اور معانی کے اعتبار سے طریقہ جداگانہ کے حامل ہیں۔ یہ طریقہ بھی مدارج کمال اور معرفت حال میں سے ہے جو آدمی کو روحانیت کے دروازہ تک پہنچا دیتا ہے۔ اور اہل دانش لوگوں کو فضل و امتیاز کے زیور سے مزین کر دیتا ہے۔ اور شیخ فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کی باتوں سے محروم نہیں رہنا چاہیئے بلکہ ہر آدمی کی بات کو من اولہٖ الی آخرہ سنا جائے کہ وہ کیا کہتا ہے اگرچہ اس کی باتوں میں سے کچھ باتیں غلط ہی کیوں نہ ہوں سب کو سن۔ اس کے بعد اگر تیرے اندر اس کی تردید کرنے اور ابطال باطل کی توفیق ہے تو تردید کر اور اتنی طاقت نہیں تو درگذر کر اور اس کو اپنے حال پر چھوڑ دے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اگر تجھے کسی جگہ پر جانے سے اس بات کا خطرہ ہو کہ میں تذبذب اور تردد میں مبتلا ہو جاؤں گا یا اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا تو اصل عظیم یہ ہے کہ اس راستہ سے منہ پھیر لے اسی میں سلامتی اور عافیت ہے۔ اور باقی محل خطار ہے۔

مشہور ہے کہ ہر شخص اپنے کہے اور کئے کا خود ذمہ دار ہے۔ پھر کسی کے سخن کے درپے ہونے کی کیا ضرورت وہ اپنی بات کا خود کفیل اور ذمہ دار ہے۔ علاوہ ازیں ہر بات کی ایک وجہ اور علت ہوتی ہے ہو سکتا ہے جس وجہ کی بنار پر اس نے بات کہی اس بات کی وجہ تیرے ذہن میں کوئی اور ہو جس کی بنار پر تجھے وہ بات صحیح معلوم نہ ہو رہی ہو تو تُو جس معاملہ میں جانتا ہے وہ کر اور جس کو دیکھتا ہے وہ کہہ کمال جامعیت اور حفظ مراتب اسی میں ہے۔ اور بڑے ہدایت دینے والے ہیں۔ تو اپنی غرض دعا کے پیش کرنے میں رکھ اور بات اپنی خاصیت کی بنار پر دوسرا مقام رکھتی ہے۔ اگر کوئی بات خلاف شان ہو تو معذور تصور کریں اس لئے کہ میں کیا اور میری ذات کیا اور ایسی باتیں کیا عاقبت بخیر باد۔ والسلام

مکتوب نمبر ۲۰

بنام شیخ ابوالفیض فیضی

تثبیت القدم علی الاصطبار بترک صحبۃ الاضداد

لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ یہ ربیع کے دن ہیں ۔ طبیعت خوش وخرم ہے اور لوگ خواہشات کے باغ اور صحرا کی سیر میں گھوم رہے ہیں ۔ اور انہیں اسباب عیش وعشرت میسر ہیں ۔ مگر گوارا ہو اور خوشی ہو اس عیش وعشرت کی ان طلبگاروں کو ۔

هنيئاً لارباب النعيم نعيمهم وللعاشق المسكين ما يتجرع

(یعنی نعمت والوں کو اپنی نعمت پر خوشی ہو ۔ اور عاشق مسکین کو اس کی جس کے وہ گھونٹ پی رہا ہو)

اور ایک دوسری قوم کو دیکھ رہا ہوں جو غم اور رنج میں مبتلاء ہے اور وحشت اور تنہائی سے انس ومحبت رکھتی ہے ۔ اور اگر کوئی ان کو وطن مالوف اور مسکن مانوس یاد دلاتا ہے تو اس کی پروا نہیں کرتے اس لئے کہ عارف کی نظر تو معنی پر ہے نہ کہ صورت پر گو حقیقت یہی ہے کہ لذت اور مسرت پہلے ہی گروہ کو نصیب ہے اور حالت اس گروہ کی سوائے حسرت اور نکبت کے کچھ نہیں لیکن اس دل دیوانہ کا کیا کروں ۔ اگرچہ میرا نفس بدکیش اپنی خصلت اور عادت کی بنا پر لذات اور عیش سے محروم اور رنج والم اور حسرت میں مبتلاء ہے ۔ مگر اس جگہ صبر کرنا چاہیئے ۔ اس دل ناقابل علاج کا کیا علاج کیا جائے کہ باوجود پاتے مقام اصلی اور لذت حقیقی کے اس کے حاصل کرنے سے محروم ہے ۔ اور مدت اس کے حاصل کرنے کی معلوم نہیں اور خلاصی اس حال سے ممکن نہیں کہ یہ حالت کب تک جاری رہے ۔ جتنا ہو سکے ضرورت سے زیادہ دم نہ مارا جاوے ۔ اور زبان کو فضول باتوں سے محفوظ رکھا جائے ۔ افسوس کہ کاغذ کا ٹکڑا بہت چھوٹا سا میسر ہو سکا کہ اس میں دعاء کے علاوہ گنجائش ہی نہیں اسی دعاء کو بزرگ محبوب ومنظور قرار دیتے

ہیں اور باقی سب ھبا، اور بیکار قلم بھول گئی اور دل پریشان ہے۔ اس لئے کہ اس کام کی سختی اور راستے کی صعوبت سے اتنا غم نہیں ہے کہ فقدان رفیق اور یار کے گم کرنے سے ہے۔ کسی کو نہیں دیکھتا اور پاتا کہ وہ میری طرف مائل ہو اور کوئی لفظ دوستی کا کہہ کر ہمت اور ڈھارس بندھوائے اور دلداری کرے اس مقام پر پہنچ کر مجھے نفس کہتا ہے تو راستہ سے پھر چکا ہے اور اپنے کو غلط کام میں ڈال چکا ہے۔ راستہ وہی ہے جس پر عامۂ مخلوق چل رہی ہے اور کام وہی ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ اس جگہ حیرت اور توقف بلکہ تذبذب اور تردد دامنگیر ہوتا ہے۔ اور ہمت کی رفتار ذرا کم پڑ جاتی ہے۔ بلکہ قریب ہے کہ سرے سے رفتار ہی ختم ہو جائے۔ اسی راہ پر چل جس پر دوسرے چلتے ہیں۔ پھر غیب سے آواز آتی ہے یہی راستہ سالکوں کا ہے انہی پر چلتے رہ خدا ہی بہتر جانتے ہیں راستہ قریب ہے یا ابھی مسافت بہت لمبی رہتی ہے۔

عمر کے دن تو بہت تھوڑے ہیں زیادہ نہیں۔ اس راستے کی صعوبتوں اور مشکلات سے نہ ڈر بہت سے لوگ اس راستہ پر چل کر منزل مقصود تک پہنچ چکے ہیں ہر قدم پر یہی کشمکش رہتی ہے شاید کب غالب آؤں لیکن غالب تو وہی ہے جو ہے واللہ غالبٌ علیٰ امرہٖ ولکن اکثر الناس لایعلمون۔ ہمت درکار ہے پھر خدا شناسی نصیب ہو جائے گی۔ اور نظر ماسوی اللہ سے اٹھالی جائے اصل مقام یہی ہے۔

عاقبت بخیر باد۔ والسلام

مکتوب نمبر ۲۱

بنام نواب فرید مرتضیٰ خاں صاحب

تجدید الذکر فی بیان حقیقۃ الشکر

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ جاننا چاہیئے کہ نعمت پر شکر بجا لانا نعمت سے بہتر ہے وجہ اس کی ایک تو یہ ہے کہ یہ نعمت کے بقار کا سبب ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ خدا کا ارشاد ہے لئن شکرتم لازیدنکم۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ شکر کرنا حقیقت میں منعم کو پہچاننا ہے اور اس بات کا علم ہے کہ نعمت اس سے ہے تو گویا کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو معرفت اور علم کے زیور سے مزین ہے۔ ورنہ عمل بغیر علم کے یوں ہے جیسے جسم بغیر روح کے اور سلسلہ شکر کا اگر انتہا تک پہنچ جائے تو انسان آخر کار اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور زبان حال سے کہتا ہے۔ لا الہ الا اللہ ولا خالق سوی اللہ ولا فاعل فی الحقیقۃ غیر اللہ۔ (یعنی اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور نہ ہی کوئی پیدا کرنے والا اور نہ ہی خدا کے سوا کوئی فاعل ہے) اور حدیث میں آتا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے خداوند کریم کی دربار میں فریاد کی کہ اے اللہ میں آپ کی نعمتوں پر شکر کس طرح اور کیسے کروں۔ اور اس سلسلہ کی انتہا کیسے اور کہاں ہے۔ پس داؤد علیہ السلام کے پاس خدا کی طرف سے حکم آیا کہ اے داؤد اگر تو اس بات کو جان لے کہ جو چیز اور نعمت تیرے پاس ہے وہ میری طرف سے ہے۔ پس تو نے میرا شکر ادا کر دیا یعنی شکر کی حقیقت اور اس سلسلہ کی انتہا یہ ہے۔ کہ تو اپنے کو درمیان میں نہ دیکھے اور سب چیز کو میری طرف سے جانے بنار اس کام کی اپنی ہستی اور وجود کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہستی اور وجود کیا چیز ہے تاکہ اس پر نفی اور ترک کا حکم عائد کیا جا سکے۔ تو مراد ترک وجود اور نفی ہستی سے یہ ہے کہ اپنے نیست اور معدوم ہونے کا ادراک اور یقین کر لینا۔ اور اپنی ذات اور صفات۔ مال و منال سب کو خداوند کریم کی طرف سے سمجھنا۔ اور اس بات کا یقین کرنا کہ

دوسرے کو ان کے اندر کوئی دخل نہیں۔ آدمی کیا چیز ہے کہ اس کا نام لیا جائے یہ معنی میں نے اس گروہ کی کتابوں سے تفصیل اور تحقیق سے معلوم کئے ہیں۔ اور اگر کوئی مرد آشنائی اس راہ کی پالے تو تاثیر کچھ اور ہی ہو جاتی ہے اور کام اس کا دلنشین ہو جاتا ہے۔ نیکوں کی بات سننے اور ان کی صحبت اختیار کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ جو چیز استعداد وغیرہ ہو فطرت اس کو پیدا کرتی ہے۔ اور قوت سے فعل میں لاتی ہے۔ اور مشکلات کے سب پردوں کو دور کر دیتی ہے۔ لیکن پھر بھی استعداد اور قابلیت کا مدار طلب پر رکھا گیا ہے اس لئے کہ مجرد آرزوئے مطلوب محض خام خیالی ہے۔ اور حقیقت طلب یہ ہے کہ طالب اپنے مطلوب میں مستغرق ہو جائے۔

اس لئے مشغول ہو کہ ماسوٰی سب کو ترک کر دے۔ بلکہ ماسوٰی معدوم اور نایاب ہو جائے اس طرح ہو جائے کہ کسی کا خواب و خیال نہ رہے۔ اور دل میں کسی کی گنجائش تک نہ رہے۔ اور مطلوب کی طلب میں ہاتھ و پاؤں مارنے چاہیئے تاکہ وہ حاصل ہو جائے۔
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لربکم فی الایام دھرکم نفحات الا فتعرضوا لہا
حاصل اس کا یہ ہے کہ اس حدیث کے اندر بشارت ہے جو ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ حضرت واہب البرکات تعالیٰ و تقدس ہر دن کی رات کی ایک ساعت میں اپنے جود و کرم سے اپنے بندوں سے فرماتے ہیں کہ جو مانگو گے وہی دوں گا سچ فرمایا نبی علیہ السلام نے جو صادق و مصدوق ہیں۔ حرکت کرنا صرف ہماری طرف سے ہے وہاں تو سب کچھ موجود ہے تجربہ کار بزرگوں کا فرمان ہے کہ اگر خداوند کریم کی ذات سے ہمیشہ سوال کرتے رہیں تو عجب نہیں کہ وہ قبول ہو جائے خلاصۂ دعا اسئلک منک کا ہے اور باقی سب اس کی فراع و باللہ التوفیق۔

میں بات تو کچھ اور عرض کر رہا تھا مگر کہہ کچھ اور رہا ہوں اس لئے معذرت خواہ ہوں۔ اور وہ عرض یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق فقراء کے ذمہ ثابت ہے۔ تو اس کی شکر گذاری بذریعہ دعا کی جائے اور اس کے ضمن میں بعض دوسری درخواستیں اور التجائیں بھی عرض کی جائیں کبھی ایسی بات جو متضمن خیر اندیشی اور خیر طلبی کے ہوتی ہے لکھی جائے اور ذوق ہمزمانی اور لذت صحبت روحانی کی خاطر حاضران مجلس میں کسی کو لازم پکڑیں۔ نیز بحکم عادت اور ارادت اس طرح بیٹھ کہ کبھی کبھی اس حقیر کے قلم میں بھی جریان

آئے اور جو چیز کہ اس حقیر کے لائق اور موافق ہووے اس کو بھی لکھ اگر اس دوران میں وہ حرف آشنا سرزد ہو تو زہے سعادت و قبول۔ لیکن اس شرط پر اس کی اجازت ہے کہ ستر و کتمان کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اس طرح کہ بات پر پردہ رہے۔ اور اس سے قدم باہر نہ رکھیں۔ اول تو اس لئے کہ اس حقیر کا کیا مرتبہ کہ نصیحت کرے اور حقیقت گوئی کی بنیاد ڈالے۔ دوسرے اس لئے کہ میری قلم میں ایک قسم کی جولانی ہے جو کہیں سے کہیں تلک نکل جاتی ہے اس کو کون سمجھے گا۔ اور خبر نہیں سننے والا کس وادی میں داخل ہو جائے گا۔ اس وقت تو میں خود فقراء وقت کے نزدیک احکام شریعت کی بات کہنی نہیں چاہتا۔ بلکہ ان سے حقائق و اسرار شریعت حاصل کر رہا ہوں۔ بلکہ مشکل تر اس وقت فرقۂ ملامتیہ ہے جو اس زمانہ کے اہل شریعت لوگ ہیں۔ پناہ مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے جہالت اور گمراہی کی اور سوال کرتے ہیں اس سے تندرستی اور عافیت کا۔ اور کیا کہوں۔ والسلام

مکتوب نمبر ۲۲

بنام نواب خانخاناں صاحب

اتحاف الاحبۃ بیان حدیث المحبۃ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اللھم انی اسئلک حبک وحب من یحبک و حب عمل یقربنی الیک (یعنی اے اللہ میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اسکی جو تجھ سے محبت کرے اور اس عمل کی جو مجھے تیرے قریب کردے) اور استادوں کے استاد محبوبوں کے محبوب وہ ہیں جو مرکز ہیں جوامع الکلم ہیں اور منبع ہیں اسرار اور حکمتوں کے یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم۔ اس کلمہ میں مقصود حقیقی تک پہنچنے کا اشارہ ہے فقرہ اول بھی عین مقصود ہے جو کہ محبت ذات خداوندی ہے جو کہ مطلق ہے قیود وافعال و انجذاب سے۔ اور فقرہ ثانی میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ چیز اس مقصود حقیقی کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ ظاہر و باطن میں خداوند کریم تک رسائی رکھتے ہیں جس سے رشد وہدایت کے روشن چراغ بن جاتے ہیں۔ اس راستے کے ہادیوں اور رہنماؤں کا فرمان ہے۔ اس طرح سعی وکوشش کرکہ یا تو وہ تیرے دل میں جگہ بنالے یا تو خود اسکے باطن میں جگہ بنالے اگر وہ تیرے باطن میں جگہ بنالے تو تیرا باطن نورانیت سے نورانی ہو جائے اور تیرا باطن آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہو کر اس کی رحمت کو اپنے اندر جذب کرے۔ اور ہر روز خداوند کریم کی رحمت کی نظر تیرے باطن پر پڑے۔ اگر ان مردان حق کی محبت تیرے دل میں جاگزیں ہو تو اس کا اثر بھی یہی ہو۔ اگرچہ بادی النظر میں دونوں میں وساطت اور وسیلہ کا فرق معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقۃً اُن دونوں میں کوئی تفاوت وافتراق نہیں اسی لئے بزرگوں کا کہنا ہے کہ سخت کوتاہ نظر ہے وہ آدمی جو ان مردان حق کی صحبت اختیار کرے اور اس کا مطمح نظر کمالات کو محض نفس کے لئے حاصل کرنا ہو۔ یہ ایک باریک فرق ہے جو عاشقوں کے علاوہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا یہ مرتبہ اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب عاشق اپنے کو کلی طور پر فنا کردیتا ہے

اس کے بغیر اس کا سمجھنا ممکن نہیں حقیقی کمال یہی ہے کہ دوسرے کمالات ہستی کے مٹ کر فنا اور نیستی میں جذب ہو جائیں۔ اور اگر ہوں تو اس کے تابع بن کر رہیں۔ اور اگر سرے سے ختم ہو جائیں تو بھی کوئی غم نہیں۔ بیان حب من یحبک یہ ہے اور حب عمل یقربنی سلوک اور توسل ہے اور وہ عمل جو شامل ہے باطن وظاہر کو۔ اور عمل باطن بھی محبت ہے۔ اور مراد اس محبت سے محبت ذات ہے پس مآل اس کلمے کا بھی ان دونوں کلموں کا سا ہے جن کا اوپر بیان ہوا، غایت اس کی یہ ہے کہ اپنے کو محبت کے لائق نہ شمار کر۔ محبوب تو پردۂ غیب میں ہے اور اسی طرح محبت کی بھی کوئی جگہ نہیں۔ پس اگر وہ محبت چاہے تو بھی تو اس کی محبت کی خواہش رکھ۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد وحب عمل یقربنی کے اندر ایک اور سلسلہ دل میں وارد ہوا۔ کہ نقشبندیہ حضرات کسی کام کی بنا، تین طریقوں پر رکھتے ہیں۔ اول طریقہ توجہ و مراقبہ کا اس طرح کہ بلا حیل و حجت اپنی ذات کو اسم ذات میں ڈالدے تو وہ بغیر توسط عبارت عربی اور فارسی کے ملاحظہ کرے اور جمیع قویٰ اور مدارک اس کی طرف متوجہ ہوں۔ یہاں تک کہ تکلیف کے پردے سب اٹھ جائیں۔ اور ہمیشہ کی آگاہی اس کے ہاتھ آئے اور فنا کے اندر فنا ہو جائے۔

اور دوسرا طریقہ۔ یہ ہے کہ رابطہ اور توجہ بصورت مرشد و پیر ہو جو کہ فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہو۔ جو اس طرح غائب کر دے کہ سب جہات سے توجہ ہٹا کر بجز شہود ذات اور حضور حق کی طرف لگا دے جو جانب اور سمت اس کی علو ہے۔

اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ لاالہ الا اللہ کا ذکر خفیہ کیا جائے جس میں نفی اور اثبات دونوں موجود ہیں۔ (اس لئے اس کو ذکر نفی و اثبات بھی کہتے ہیں) طریق اول تو سب طریقوں سے اعلیٰ ہے اور اس کے حصول کے لئے سالک کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور دوسرا طریقہ جس کو طریقہ رابطہ سے تعبیر کیا جاتا ہے صوفیائے کرام کی اصطلاح میں یہ اقرب الطرق کہلاتا ہے اور منشا اس کا عجائب و غرائب کا ظہور ہے۔ یہ رابطہ محبت ہے اور اس کی حفاظت کرنا اس کے لوازمات میں سے ہے۔ اس کے ضمن میں اسرار کھلتے ہیں۔ اور تیسرا طریقہ احکم الطرق کہلاتا ہے اور حدیث شریف میں انہیں تینوں طریقوں کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ اسئلک حبک طریق اول ہے۔ جو کہ مراقبہ اور توجہ ہے۔ اور حب من یحبک طریقۂ رابطہ ہے۔ اور حب عمل یقربنی

طریق ذکر اور محبت ہے جو ہر جگہ معتبر ہے۔ پس اصل تو محبت ہی ہے۔ اللّٰھم انی اسئلك حبك وحب من یحبك وحب عمل یقربنی الیك۔ اس حدیث کا تتمہ یہ ہے کہ اے اللہ میں تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ تو اپنی محبت میرے اندر میری جان ومال۔ اہل وعیال سے زیادہ بنادے۔ اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ جس کو پیاسا آدمی محبوب سمجھتا ہے۔ علم خداوندی تو ہر چیز کو محیط ہے۔ اور سنت الٰہی اس طرح سے چلی آرہی ہے کہ وصول الی المقصود مرشد کامل کے بغیر محالات میں سے ہے۔ اور مرشد کامل کا اس آخری زمانہ میں ملنا مثل وجود عنقا ہے۔ اور حق یہی ہے جس کو بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز پر قادر ہے۔ آخر زمانہ اور اول زمانہ اس کے ہاں برابر ہے۔ اور اللہ کا فیض ختم ہونے والا نہیں۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن تعلیم سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے حقیقت میں شریعت محمدیہ کے دورات ہیں مثل دورات فلکیہ کے اور ہر دور کے سو سال بعد اللہ تعالیٰ بھیجتے ہیں اس امت پر ایک ایسے آدمی کو جو دین محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تجدید کرے اور اس کو قدرت دیتے ہیں تاکہ وہ دین کو تقویت پہنچائے اور اس دین کی ترویج کرے۔ ہر طائفہ اس بشارت میں داخل ہے خواہ وہ از قسم علماء ومشائخ ہو یا امراء وحکام سب پر یہ عنوان صادق آتا ہے۔ اور دین کے اعظم امور میں سے ہدایت اور ارشاد ہے اور ترویج وتجدید نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اس سے بالاتر ہے جس سے سعادت ونیک بختی ابدی اور سرمدی نصیب ہوتی ہے۔ قل ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین تعجب اس بات کا ہے کہ بعد ظاہر ہونے اس حقیقت کے کونسی ذات ہے جو اس کی نعمتوں کی شکر گذار ہو اور اس کا شکر بجالائے۔

یضل بہ کثیراً ویھدی بہ کثیراً۔ ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسی زابدال حق آگاہ شد

(یعنی سب عالم ہی تقریباً تقریباً اس ناشکری کی وجہ سے گمراہ ہے اور کم لوگ ایسے ہیں جو اس راز سے آگاہ ہیں)

تعجب ہے میں مرد عاقل اور طالب کو کیا کہوں جو اس خبر کو سننے کے بعد بھی اس راستہ پر نہیں چلتا اور قدم صدق کے اس راستہ میں نہیں رکھتا۔ اس وقت جبکہ

سنہ ۱۱۱۱ھ ہے۔ ایک رشد و ہدایت کا نیا نور مشرق کی طرف چمک رہا ہے۔ بیشک اس جگہ خدا کے اسرار مضمر ہیں۔ کہ توقف اور انکار کی اس جگہ مجال نہیں اور اس کی حقانیت اور نورانیت کے دلائل ظاہر اور واضح ہیں۔ اور یہ مظہر حق طالبان راہ کی ہدایت کے لئے مشغول ہے۔ اور اس کا ذکر الٰہی میں مشغول رہنا اور انوار و اسرار برساتے رہنا ایسے امر ہیں جن کو قلم بند کرنا امرِ محال ہے۔ اس وقت ایسا حلقۂ ذکر و شغل نہیں اور اگر ہے تو اس سے کمتر وہ لوگ جو اس چیز سے واقف ہیں بقدر استعداد حصہ لے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں کو ابھی تک یہ دولت نصیب نہیں ہوئی وہ حیران ہیں کہ یہ کیا ہے اور کہاں سے آیا۔ لیکن یہ تعجب کیوں کیا جا رہا ہے اس لئے کہ ان کو اس کی چاشنی نہیں لگی لیکن وہ لوگ جو اس کے نشیب و فراز سے واقف ہیں انہوں نے مقربانِ درگاہ کی خبروں کو سنا اور تمام کو آنکھوں سے دیکھا تو سننے سے زیادہ پایا یعنی جس طرح سنا تھا دیکھ کر اس سے بھی زیادہ پایا۔ آخر کار یہ کام خداوند کریم کرتے ہیں اس لئے واللہ اعلم و علمہٗ اتم و احکم دعا کرنی چاہیئے کہ خداوند کریم ہمارے چہروں سے حجاب کا پردہ اٹھا دیں اور نفس کی قید سے آزاد کر دیں تاکہ یہ مطلوب تک پہنچنے کے لئے سدِ راہ نہ بن جائیں۔ یہ بات باعتبار سب مخلوق اور لوگوں کے ہے اور صاحب فطرت سلیمہ خود مجبول ہے طریق حق پر اور سلوک ایک انصاف کا راستہ ہے مجھے اپنی عمر کی قسم یہ امر عظیم ہے اور بیشک یہ اس پر آسان ہے جس پر خداوند تعالیٰ آسان فرما دیں۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں خلاصہ دعا کا دعا ہے اور انجام ہر دعا کا یہ ہے۔

عاقبت بخیر باد

مکتوب نمبر ۲۳

بنام شیخ اسماعیل

ترك الاختلاط والمجانبة عن صحبة الاغيار

لاالٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ۔ الم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللّٰہ وانزل من الحق
اب وہ وقت کہ اپنے ارادہ کی عنان وقت سے پھیر کر فارغ البال ہو کر بیٹھا ہوں۔ اور برے نقصان دہ خیالات سے پناہ مانگتا ہوں۔ اور اچھائی و بھلائی کی خداوند عزاسمہٗ سے امید اور توقع رکھتا ہوں۔ اور ہر چیز جو اس سے چاہی جائے مل جائے۔ اور جاننا چاہیئے کہ یہ امت اگر تمام کی تمام جمع ہو جائے اس بات پر کہ تجھے نفع پہنچا سکے الی آخر الحدیث نہ پہنچا سکے کئی بار غربت کا گوشہ اختیار کیا اور بزرگوں کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ان کی باتوں کو محفوظ کیا۔ اور رہے غیر تو ان کے بارے میں خداوند کریم کا فرمان ہے قل اللّٰہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون (کہ ان کو چھوڑ دیجئے اپنی بکواس میں کھیلتے رہیں) آخر ان اغیار کی صحبت اور ان کے اختلاط سے سوائے اس کے اور کیا حاصل ہوگا کہ جو استعداد اور قابلیت حاصل ہو چکی ہے وہ دور ہو کر ختم ہو جائے گی۔ اور سوائے محنت و مشقت۔ بے عزتی اور ذلت کے اور کیا نفع ہوگا اور اگر حالت اضطرار میں کبھی ایسا ہو جائے تو خداوند کریم سے محفوظ رہنے کی درخواست کی جائے آخر حکیم مطلق نے جو یہ تقسیم کی ہے کہ بعض علماء اور بعض جہلاء اور بعض غرباء۔ بعض امراء اور کچھ ایسے اور کچھ ویسے تو اس تقسیم کا کچھ ثمرہ اور نتیجہ تو ضرور ہوگا ورنہ تقسیم ہی صحیح نہ رہی۔ تو فرق ان کے درمیان حسن و قبح، نقص اور کمال کے اعتبار سے ہے۔ جو عقلمند پر مخفی نہیں۔ اب تجھے سوچنا ہے کہ تو کس قسم میں داخل ہے۔ کس قسم میں بھی ہے اس پر خوش رہ۔ کہ تیری تقدیر کا نوشتہ یہی ہے۔ اور پھر ہر قسم کی علامات کو معلوم کر اور شکر کر اور خوش رہ کر ایسے کام کر کہ ان کاموں سے خدا اور اس کے دوست رنجیدہ نہ ہوں۔ اور اصل اس باب میں یہ ہے کہ اغیار کی صحبت کو ترک کر دے۔ اور گوشہ غریبوں کا اختیار کر کے صابر اور شاکر بن کر بیٹھ جا۔ اور آخرت کے کاروبار میں مشغول ہو جا۔ اور پھر آخرت کے کاروبار میں مشغول ہونے کا حسن ہر اس شخص پر واضح ہے

جو ادنیٰ درجہ عقل اور ایمان کا رکھتا ہو۔ اس باب کے اندر یہی معتبر ہے اسباب کو دل میں بٹھا لینا چاہیئے۔ اور صاحب حال ہو کر مرتبۂ یقین حاصل کر لینا چاہیئے ولما یدخل الایمان فی قلوبکم کے اندر اسی کیطرف اشارہ ہے۔ اور اس کا حاصل ہونا توفیق الٰہی سے ہوتا ہے اگر توفیق الٰہی شامل حال ہو جائے تو پھر مخلوق کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ برادر من! تو اپنے کو اسلام کے زیور سے ہرگز عاری نہ کر اور اسلام کے دائرہ سے ذرہ برابر بھی قدم باہر نہ رکھ اور ابنائے وقت کے خیالات سے متاثر ہو کر ان کی ہاں میں ہاں نہ ملا۔ علاوہ ازیں تو اس تذبذب اور پریشانی میں کیوں مبتلا ہے اور حالات کو دیکھ کر یوں کیوں کہتا کہ عصبیت اور حمیت اسلامی کہاں گئی اور یہ خیال کرتا ہے کہ عیش و راحت تو سب دنیا داروں کے پاس ہے۔ اہل اسلام اور اسلام کی تبلیغ کرنے والے اور صوفیائے کرام کے پاس عیش و راحت ندارد ہے۔ لیکن حاشا وکلا آپ مغالطہ میں مبتلا ہیں حقیقت یہ ہے کہ جو ذوق اور فراغت ان فقیروں کو نصیب ہے وہ دنیا داروں کو کہاں حاصل۔

بلکہ دنیا دار تو حسرت اور غم میں مبتلا ہیں اور یہ ان کی زندگی کے بہترین ساتھی ہیں۔ اور بات تو یہ ہے کہ عیش اور راحت تو وہی چاہیئے جو ہمیشہ رہنے والی ہو۔ اور یہ مسلمہ بات ہے کہ آخرت کی عیش اور فرحت دائمی ہے اور اس دنیا کی فانی اس لئے کہ یہ خود بھی فانی ہے تو کیوں نہ آدمی کوشش کرے اس بات کی کہ مجھے عیش و راحت ابدی اور سرمدی نصیب ہو جائے۔ اور وہ حاصل ہوتی ہے ان فقیروں کی صحبت اختیار کرنے سے اور اغیار کی صحبت اختیار کرنے سے تو ایمان ہر روز کمزور اور ضعیف ہوتا رہتا ہے۔ اس کا علاج پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا ہے۔ جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللہ (یعنی اپنے ایمان کو لا الٰہ الا اللہ کہہ کر تر و تازہ کر لیا کرو) یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ ایمان کے اندر بھی کہنگی آجاتی ہے سچ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صادق اور مصدوق ہیں۔ یہ حالت تو ہماری ہر آن ہر ساعت اور ہر وقت رہتی ہے یعنی ایمان میں کمزوری آتی ہے چہ جائے کہ جب گناہوں کا بھی ارتکاب کرتے ہوں۔ زیادہ کیا لکھوں عاقبت بخیر باشد اور آپ کے فرزند ارجمند جناب نور الحق صاحب کے لئے بھی دعا کرتا ہوں اور وہ بھی اس نصیحت میں شریک ہیں

واللہ الموفق

مکتوب نمبر ۲۴

بنام نواب فرید مرتضیٰ خاں صاحب

تسبیب الخیر لدفع الضیر و دوام اللجاء بالخوف والرجاء

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض

یہ آیت شریفہ اشارہ کرتی ہے اس بات کی طرف کہ مخلوق کو فائدہ پہنچانے والا اور ان کے کام آنے والا وہ ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور بندوں کے دلوں کو اپنی طرف پھیرنے والا وہ خدا ہی ہے۔ لیکن ہر چیز کا ایک سبب ہوتا ہے اور خداوند کریم مسبب الاسباب ہے مخلوق پر نیکی اور احسان کے سبب دیرپا اور ہمیشہ کی زندگی عنایت فرماتے ہیں وہ ذاتِ پاک بیشک بلاواسطہ اور سبب بھی ہمیشہ کی زندگی دے سکتے ہیں۔ مگر اس کی ذات کا یہ خاصہ ہے کہ کسی کو نیکی کے سبب دوسروں پر ترقی دیتے ہیں۔ اور اپنے چاہنے والوں کے لئے اپنی خاص خاص عنایتیں کرتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے مطلوب کو پالیتے ہیں۔ یہی بزرگوں کا تجربہ ہے اور اس کا تخلف ہرگز نہیں ہوا۔ اور عقل کا اقتضا بھی یہی ہے کہ نیکی کرنے والوں کو ترقی دی جائے اور برائی کرنے والوں کے لئے تنزل کے راستوں کا انتخاب کیا جائے اسلئے کہ نیکی اور برائی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کہ جو نیکی کرے اسے برا نتیجہ نہیں ملنا چاہیئے۔ اور اگر ایک نظر برائی پر پڑے تو نورانیت نیکی کی برائی کی ظلمت سے بدل جاتی ہے اور اگر کوئی برے کام کر کے آخر میں نیک ہو جائے تو یہ محض اس کا فضل و کرم ہے اور سبقت رحمتی علی غضبی پر محمول ہے۔ اور اصل نیکی جو بنیاد اور ستون ہے سب نیکیوں کی وہ ایمان کی دولت ہے۔ بغیر اس کے انسان ایسا ہے جیسے جسم بغیر جان اور روح کے اور اگر بغیر ایمان کے کوئی عمل کیا جائے تو وہ کوئی اثر نہ رکھے اور اگر رکھے تو کسی کام نہ آوے۔ اور ایمان ایک ایسی دولت اور نعمت ہے کہ جسمیں آجائے پھر ہرگز نہ جائے اس لئے کہ ایمان کا رنگ اصلی ہے نہ عارضی سو پہاڑ گناہوں کے اگر ایمان کے پہلو سے وابستہ ہوں تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کی بناء پر مانند گھاس اور تنکے کے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری یہ

نسبت درست نہیں اگر نسبت درست ہو جائے تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی غم اسی کا کھاتو دوسر غموں سے نجات مل جائے گی حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ تمام رات آہ و بکار اور گریہ زاری میں گذارتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اس بات پر خوش ہوں کہ گناہوں کا بوجھ میری گردن پر نہیں۔ گناہ اگر پہاڑ کی مثل ہوں تو یوں رونے اور معافی مانگنے سے پرکاہ بن جاتے ہیں اور گریہ اس خطرہ کی بنا پر کرتا ہوں کہ کیا خبر ایمان سلامت لے جاؤں یا نہ ؎

ایمان چوں سلامت بلب گور بریم   احسنت زہے چستی و چالاکی ما

(یعنی اگر میں اپنی قبر میں ایمان کے ساتھ چلا جاؤں۔ تو میری یہ ہوشیاری اور عقلمندی قابل تحسین ہے) اور باد رحمت اور ہبوب صبا سے امید رکھنی چاہیئے کہ دل کا غنچہ سربستہ کھلے گا اور امید کے پھول کو تازہ رکھ اور رجاء شہباز کے دو بازوؤں میں سے ایک بازو ہے ایمان ہاتھ اور بازو دوسرا خوف ہے جو مشکلات کی سخت ہواؤں کی مثل آدمی کو پژمردہ کر دیتا ہے۔ اللہ تعالٰی کے اوصاف متضادہ مثلاً یحیی و یمیت یعز و یذل وغیرہ ایسے اوصاف ہیں کہ بندہ کو ایک حال سے دوسرے حال میں کر دیتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہیں۔ اور راستۂ ایمان درمیان خوف اور رجا کے ہے۔ اور بعضے رجا کو مقدم رکھتے ہیں اس لئے کہ مشعر رحمت خداوندی ہے۔ اور اللہ کی رحمت مقدم ہے۔ اور بعضے اس کا عکس کہتے ہیں کہ سالک کی نظر ہمیشہ سزا پر ہوتی ہے۔ وہ پہلے کام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس زندگی پر ہمیشہ خوف غالب رہنا چاہیئے تاکہ کاروبار میں توازن رہے۔ اور نظام عالم میں خلل نہ واقع ہو۔ اور جب آخر وقت آئے تو اس کی رحمت کی امید رکھی جائے اور یہی نیک بختی اور سعادت کی علامت ہے۔ ؎

ناامید مشو کہ رحمت حق عام است   مغرور مشو کہ خاصگان در بیم اند

(یعنی تجھے دنیا میں یوں رہنا چاہیئے کہ نہ تو ناامیدی رکھے کیوں کہ اس کی رحمت عامہ ہے جو ہر ایک پر برابر اترتی رہتی ہے اور نہ ہی مغرور رہو کیوں کہ اس کے مقرب بندے بھی کسی وقت میں ناامید ہو جاتے ہیں جب ان خاص لوگوں کی یہ حالت ہے تو تجھے کس بات پر ناز ہے جس کی وجہ سے مغرور ہو کر اس کے دروازے پر آکر اپنی جبین نیاز کو خم نہیں کرتا)

اللہ تعالٰی عاقبت بخیر رکھیں اور دنیا و آخرت میں عافیت کے حصہ سے محروم نہ رکھیں کہ اصل سب نعمتوں میں سے عافیت ہی ہے۔ اور عافیت عرف عام میں تندرستی

اور صحت کا نام ہے۔ اور حقیقۃً عافیت کہتے ہیں تمام آفتوں اور مصیبتوں سے نجات پانے کو خواہ وہ اس جہان سے متعلق ہو یا عالم آخرت سے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محبوب ترین جو خداوند کریم کی درگاہ سے مانگتا ہوں وہ عافیت ہے۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا کہ اے میرے چچا! خداوند کریم سے عافیت مانگئے جو بہترین چیز ہے۔ یہ عبارت بزرگوں کے وردوں میں متعارف اور مشہور ہے اگر اسکو پابندی سے ہمیشہ پڑھا جائے تو بہت ہی خوب اور بہتر ہے۔ اللھم انا نسئلك العفو والعافیۃ والمعافاۃ الدائمۃ فی الدنیا والاخرۃ۔ (یعنی اے اللہ ہم آپ سے عفو اور عافیت اور دائمی معافات دنیا اور آخرت کی مانگتے ہیں) افسوس ہیں کہنا کچھ اور چاہتا تھا مگر قلم اپنی جولانی میں کہیں اور چلا گیا لیکن مقصود تو دعا کرنا تھا اس عارضہ کے سلسلہ میں جو آپ کے وجود شریف کو لاحق ہوا تھا۔ انشاء اللہ فقیروں اور درویشوں کی دعا سے وحشت کا غبار عیش اور راحت سے جلد ہی بدل جائے گا۔ اور وجود ان بزرگوں کا غنیمت ہے اور بقا ان کی عین مصلحت خداوندی ہے۔ تمام کمالات اور نیکیاں منحصر ہیں دو جملوں میں التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ اللھم زد ولا تنقص کہ اللہ کے حکموں کی تعظیم کرنا اور مخلوق خدا پر شفقت کرنا اے اللہ اس میں اضافہ فرما نہ کہ کمی

والعاقبۃ بالخیر

مکتوب نمبر ۲۵

بنام جناب نواب فرید مرتضیٰ خاں صاحب

کشف استار الظلم عن لسان الحال والقال والقلم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ آدمی کی تین زبانیں ہیں۔ اول زبان حال۔ دوئم زبان قال سوئم زبان قلم۔ بولنا زبان حال ہے جس سے بات تکلف کے ساتھ باہر آکر اپنے مافی الضمیر کو عیاں کرتی ہے۔ مگر بعض اوقات اس کا سمجھنا باریک اور پوشیدہ ہوتا ہے اس کا حکم عمومی حالات میں ساقط ہو جاتا ہے۔

اور زبان قال کو عرف میں زبان کہا جاتا ہے۔ جو دل کے ضمیر کی ترجمان ہوتی ہے جو چیز کہی جاتی ہے وہ اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جو کچھ دل میں ہوتا ہے اس کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔ اور جو چیز کہ نفس الامر میں حق اور ثابت ہے وہ سایہ اور پرتو ہے اوصاف حقانیہ کا جو واجب اور قدیم ہے۔ اگر اس کو عبارت اور لفظوں میں لایا جائے تو وہ حق اور صادق ہے۔ اور اگر اس کے اندر توہمات اور تصورات شیطانیہ کی آمیزش ہو جائے تو وہ کذب اور جھوٹ ہے۔ اگرچہ بات وہی نکل رہی ہے جو دل کے اندر ہے مگر خارج میں ایک شئی دوسری مل گئی ہے جس کی وجہ سے وہ نفس الامر بات خلاف واقع بن کر از قسم جھوٹ بن گئی ہے۔ اللہ کا علم تو روشن ہے اور ایک آدمی ہے۔ کہ نفس اور روح کے اختلاط سے کشف و حجاب اور ظلمت و نور میں گرفتار ہے۔ اگرچہ فطرت روحانی صدق و سلامت سے متصف ہے مگر نفس اور شیطان کی ہم نشینی کی وجہ سے اس کی فطرت کے کارخانہ کے انتظام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اور ومن یکن الشیطان لہ قرینا فساء قرینا (یعنی جس کا ساتھی اور ہمنشین شیطان ہو تو وہ برا ہمنشین ہے) اور فابواہ یہودانہ اوینصرانہ اویمجسانہ (یعنی لڑکا اپنے ماں باپ کی وجہ سے یہودی، نصرانی، مجوسی بن سکتا ہے اس لئے کہ وہ انہی کے مذہب کو دیکھ کر اسی کو اختیار کرے گا) ان دونوں مقامات میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ اور زبان قلم۔ پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ سے

اس کے پھسل جانے اور گمراہ ہونے سے۔ اگرچہ اس کی عنان اور لگام کاتب ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن یہ جھوٹ کو سچ کر دکھاتی ہے اور سچ کے اندر جھوٹ کے پیوند لگاتی ہے۔ اور کاروبار اس کا دل کی طرف راجع ہے۔ اگرچہ حرکت ایک جامد ٹکڑا کر رہا ہے لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو شوق اور ارادہ کے بغیر اس میں حرکت نہیں آتی ہے جس سے روز روشن کی طرح واشگاف ہے کہ قلم کی حرکت حقیقۃً دل اور قلب ہی کا کام ہے۔ اور وہ نور علم جو قلب میں اور ارادہ میں جنبش کر رہا ہے زبان پر آتا ہے اور پھر قلم سے عالم ظہور میں نمایاں ہوتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ قلم بھی ایک زبان ہے۔ اور آفات زبانِ قلم کی بہت ہیں ہم خدا سے پناہ مانگتے ہیں ان آفات سے۔

یہ مقدمات جو دائرۂ تحریر میں آ گئے ہیں اگرچہ میرا مقصود نہ تھے مگر اب بن گئے ہیں یہ بھی قلم کی جنبش اور طغیانی کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں کاتب پر سخت ترین وقت وہ ہوتا ہے جب اس کی زبان قلم سے حروف چلتے اور نکلتے ہیں اور پھر خصوصاً خط لکھتے وقت پھر جب کہ مکتوب الیہ نہایت ہی بلند مقام اور درجات پر فائز ہو۔ اور ذی وقار اور صاحب دبدبہ ہو تو اس وقت قلم پر ایک عجیب پریشانی اور حیرانی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کہ کیا لکھوں اور کیسے ؟ ہر لفظ کے کاٹنے اور لانے میں طرح طرح کے اشکال اور وسواس پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کی عرفی اور رسمی تعریف و ثنا نہ کی جائے تو معلوم نہیں اس پر کیا گذرے گی۔ لیکن بحمداللہ جس کو میں خط لکھ رہا ہوں ان کے قلب سلیم میں ایسے وسواس ہرگز ہرگز گنجائش نہیں رکھتے بلکہ وہ حسن ذاتی پر نظر رکھتے ہیں۔ اور مادح کی مدح سے ان کو کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ اور خصوصاً یہ درویشوں اور فقیروں کا زمرہ کہ ان کی نظر مدح و ثنا پر نہیں ہوتی بلکہ مطلوب اور مامول ان کا صرف دعا ہوتی ہے۔ اور پھر دعاء غائب کی جلدی قبول ہوتی ہے اس لئے غائبوں سے دعاء کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں اس جگہ چوں کہ دعاء کا ذکر شروع ہو گیا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دعاء کے آداب وغیرہ بھی بیان کر دئے جائیں۔ دعا سب سے زیادہ جامع اور سریع الاثر وہ ہوتی ہے جو قرآن میں بتلائی گئی ہو۔ اور وہ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار ہے (یعنی اے اللہ دے ہم کو دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی

اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے) یہ ایسی دعا ہے کہ اس کے اندر دنیا کے سب کاروبار وہ از قسم فرحت ہوں یا تکلیف داخل ہیں۔ اسی طرح آخرت کے امور مہمہ اور جو آخرت میں انسان کے لئے ابدی عذاب ہیں جس سے بچنے کی خاطر انسان راتوں کو روتا اور دن کو اسی کی فکر میں رہتا ہے جس کو دوزخ کہا جاتا ہے۔ اس سے بچنے اور محفوظ رہنے کی بھی دعاء ہے۔ غرضیکہ یہ ایک ایسی جامع دعاء ہے کہ اس میں دنیا اور آخرت سے متعلق سب وہ چیزیں آگئیں جو انسان کو مطلوب ہیں۔ اور اسی طرح ان سب چیزوں سے پناہ جو انسان کو غیر مطلوب ہیں۔ طالب اگر خداوند کریم کے دربار میں حضوری کے وقت التجا اور تضرع کے ساتھ سب حسنات کو جدا جدا بیان کرے اور جو لذت اس کو ان میں آئے اس سے زیادہ اس دعا میں موجود ہے۔ اور نیز اس بات کو بھی خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی مراد فی الدنیا حسنة سے، یہ ہے کہ ایسی نیکی جو آخرت کے حصول کے لئے وسیلہ اور ذریعہ بنے اور آخرت کے، کاموں کو کروانے اور ان پر آمادہ کرنے کی موجب ہو۔ جو چیز ایسی نہ ہو وہ حسنة میں داخل نہیں ہے۔ خلاصہ مختصر یہ ہے کہ اس دعاء کے اندر استدعاء ہے مکمل عافیت اور طلب کرنے بہتری آخرت کی۔ اگر ہم فرض کریں کہ اس مختصر سی حیات دنیوی میں آدمی کو سخت اور مشکل کاروبار سے واسطہ رہے۔ اور وہ ان ایام عدیدہ کو بڑی تنگی سے گذارے تو کیا حرج ہے جبکہ اس کی آخرت درست ہو اور عاقبت میں راحت و آرام نصیب ہو اس وقت وہ ان سب تکلیفوں کو بھول جائے گا۔ اور پھر دعا سے مقصود تو خداوند کریم کی ذات ہی ہونی چاہیئے بس اس کی رضا حاصل ہوگئی تو سب کچھ مل گیا لیکن یہ مقام بہت بلند ہے۔ اور اس مقام تک پہنچنے کی ہر ایک میں ہمت نہیں اس مقام تک تو وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو صاحب ہمت اور محبت عالی رکھتے ہوں۔ اور ان کی محبت اغراض نفسانیہ اور وساوس سے یکسر بے غبار ہو (اللھم ارزقناہ)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دائرہ عمل ہمارا تنگ ہے۔ اور تدارک اور تلافی اس کی دعا و استغفار سے کی جائے کہ خدا غفور و رحیم ہے اس سے امید ہے کہ ہماری لغزشوں اور بد اعمالیوں کو بخش دے۔ اور سب گناہوں کی مغفرت اور راحت

دنیا اور انجام آخرت منحصر ہیں رضائے الٰہی پر۔ اب خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ مصلحت اسی میں ہے کہ عمر کا بقیہ حصہ اسی آستانہ گرامی پر گذارا جائے تو تمام پریشانیوں سے نجات مل جانے کا قوی امکان ہے۔ اگر جمعیت اور آشنائی حاصل ہو جائے تو زہے سعادت۔ اگر شوق اور ہمت ہے تو مشورہ وغیرہ کی ضرورت کو محسوس نہ کرنا یہی مانع ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر اس سفر کے اختیار کرنے میں مصلحت ہے۔ تو بھی اس مجلس عالی کو الوداع کرنا مناسب نہیں۔ اور اگر میری بات نہ مانیں تو پھر آپ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ زیادہ طوالت مقام ادب کے خلاف تصور کرتا ہوں۔ اس لئے رخصت چاہتا ہوں۔ والسلام والعاقبۃ بخیر باد

مکتوب نمبر ۲۶

بنام نواب فرید مرتضیٰ خاں صاحب

سلوک طریق الفجاج والاجتناب عن الاعوجاج

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ خداوند کریم کا علم شریف محیط ہے۔ طور کہ شکر سبب زیادتی نعمت اور بقائے دولت ہے۔ اور استیفائے شکر بحساب عقل اس طرح مشہور ہے۔ کہ صورت نہ بند ہے اور سلسلہ اس کا منتہی نہ ہووے۔ اور اسی کی طرف اشارہ ہے ان تعد وانعمۃ اللہ لا تحصوھا کے اندر۔ اول نعمت تو نعمت وجود ہے اور ثانی نعمت شہور ہے۔ اور نعمت وجود کو دوام اور ہمیشگی ہے۔ اور دوام نعمت کو دوام شکر لازم ہے پس اگر ایک نعمت کا شکر ادا کیا جائے تو دوسری نعمت کے شکر میں زبان کو کھولا جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت عامہ کے ساتھ اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کے شکرانہ کے عوض میں اپنے بندوں کو کچھ چیزوں کے کرنے اور نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اسی قدر کرنے سے اپنے بندوں سے راضی ہو جاتا ہے۔ یہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ شکرانہ ہیں عوض مال و منال اور قدرت وقوت کا جو اس نے اپنے بندوں کو بخشی ہے خصوصاً نماز جو متضمن ہے ظاہری اور باطنی نعمتوں کے شکر کو اور آدمی کے تمام اعضاء اور قویٰ خدا کی شکر گذاری میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور جس طرح نماز کے ادا کرنے کا حکم ہے اگر اس کو اسی نہج پر ادا کیا جائے تو بے شک وہ آدمی شکر گذاروں میں سے ہے لیکن اس طرح اس کو اللہ کے قلیل بندے ادا کرتے ہیں اسی لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا وقلیل من عبادی الشکور۔ کہ تھوڑے بندے ہیں میرے شکر گذار اور اکثر لوگ ان کو زحمت سمجھ کر گوارہ نہیں کرتے۔ اور حاصل ہونے نجات ابدی کے اور مقبول ہونے دربار ایزدی میں بعد ادا کرنے مقدار فرض کے دوسری چیز پر موقوف نہیں سمجھتے لیکن اگر وہ تمام اوقات خداوند کریم کے دربار میں نفل

اور دیگر وظائف کے پڑھنے اور ذکر کرنے میں صرف کریں تو زیادتی اس عبادت سے توفیق پائیں اس بات کی کہ وہ خداوند کریم سے ایسی نعمتیں پائیں جو شمار سے باہر ہوں۔ اور مراتب و اقسام نفلی عبادت کے بے شمار ہیں۔ اور سالکوں کے درجات میں تفاوت اور مقربان خدا کے درجات میں افتراق ساتھ تفاوت درجات عبادت کے ہے۔ جو خداوند کریم کے دربار کا مقرب بنا دیتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ ان اللہ ربی و ربکم فاعبدوہ ھذا صراط مستقیم۔ یعنی اللہ کی عبادت کر کہ یہی سیدھا راستہ ہے اس کے علاوہ اور کوئی سیدھا راستہ نہیں اور اگر ہے تو وہ ٹیڑھا ہے اور ٹیڑھے راستے پر چلنے میں بہت مصیبتوں اور آفتوں میں ڈال کر اپنے کو ہلاکت کے منہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ اور پھر اتنا دور جا پڑے گا کہ پھر سیدھے راستہ پر آنا مشکل ہو جائے گا اور اپنے قدموں کو راہِ راست پر چلا کہ اسی میں سلامتی ہے۔ اگر ٹیڑھی راہ پر چلے گا تو گمراہ کہلائے گا ؎

کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند   برفتند و بسیار سرگشتہ اند

(کہ بہت سے لوگ اس ٹیڑھے راستے پر چل کر گمراہ ہو گئے اور ان کو حقیقی راستہ نہ مل سکا) راستہ سیدھا تو ایک ہی ہے لیکن اس کے اردگرد بہت سے ٹیڑھے راستے بھی موجود ہیں۔ جو شخص ان راستوں پر چلے گا وہ اپنے کو منزل مقصود سے دور پائیگا۔ اور جو شخص اپنے کو سیدھے راستے پر چلاتا رہے اور دوسرے راستوں پر ہرگز نہ چلے تو وہ بہت جلدی اپنی منزل مقصود تک پہنچ کر نیک بختوں اور سعادت مندوں میں سے ہو جائے گا۔ سالک کا راستہ سلامتی کا ہے اور ہر قدم پر محتاط اور ہوشیار رہنا ہے۔ تاکہ اس کا قدم کہیں ڈگمگانے نہ پائے۔ اسی لئے سالک لوگ ہر قدم اور ہر دم پر استغفار اور توبہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اور توبہ کے معنٰی ہیں گناہوں سے اطاعت اور اعراض سے اقبال اور غفلت سے ہوشیاری کی طرف رجوع کرنا۔ اور استغفار کے معنٰی طلب ستر کے ہیں۔ یعنی گناہ کرنے سے جو نور غائب ہوا اور اس پر گناہ کی ظلمت سے پردہ ڈالدیا اور دل پر جو سیاہ نقطہ پڑگیا اس کو بذریعہ استغفار خدا سے زائل کرنے کی درخواست کرنا سالک ہمیشہ اور دائمًا اسی فکر میں رہتا ہے اسے اس سے فراغت ہی نہیں ملتی۔ وہ اپنی رفتار سے اور منزل کے

قرب وبعد سے ہمیشہ باخبر رہتا ہے۔ اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص گناہ کر کے استغفار کرتا ہے پھر گناہ کر کے استغفار کرتا ہے حتیٰ کہ دن میں ستر بار گناہ کر کے استغفار کرتا رہتا ہے وہ بہتر ہے اس شخص سے جو گناہ کر کے اس پر مصر رہتا ہے اور استغفار نہیں کرتا تو اس کے دل پر معصیت کی ظلمت کا ایک داغ پڑ جاتا ہے۔ اور اس کی محبت عداوت سے بدل جاتی ہے۔ پھر اس کا علاج اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کہ اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اور اس کا نام فاسقوں وغیرہ میں لکھدیا جاتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ پھر اس کی نفس اور شیطان سے جنگ وجدل کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ہمیشہ ان کے شر میں مبتلا رہتا ہے۔ راستہ ان سے خلاصی پانے کا یہ ہے۔ کہ صدق دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو کر آہ وبکار نالہ و زاری کی جائے اور ہمیشہ خدا تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو کر اللہ کا نام لیا جائے تو اللہ کا نام لینے سے شیطان خود بخود دفع ہو جائے گا۔

اور ذکر کرنے والوں پر شیطان کا غلبہ اور دبدبہ کبھی نہیں رہتا، اور نہ ہی ان لوگوں پر اس کی حکمرانی اور سلطانی چلتی ہے۔ لیکن نفس ایک ایسی بلا ہے جو ذکر اور اللہ اللہ کرنے سے بھی ایک حظ (لذت) کا حصہ حاصل کرتا ہے۔ اور اس سے وہ مخذول اور شکستہ دل نہیں ہوتا، ہاں البتہ استغفار اور اللہ سے استمداد اور استعانت طلب کی جائے تو اس کی شرارتوں سے خود خداوند کریم محفوظ اور مامون رکھتے ہیں۔ واللہ الموفق

مکتوب نمبر ۲۷

بنام نواب فرید مرتضیٰ خاں صاحب

کشف الاستار عن تحقیق الکسب والاختیار

لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔
تحقیق کے راستے پر چلنے والے اور حقیقت کے رازوں کو جاننے والے یعنی اولیائے کرام وصوفیائے عظامؒ جو کام بھی کرتے ہیں اس میں اپنی طاقت اور قوت کو دخیل نہیں سمجھتے وہ صرف عمل اس لئے کرتے ہیں کہ خداوند کریم نے فرما دیا اور اسی نے قوت بخشی ہمیں اپنے ارادے پر ثواب مل رہا ہے۔ اور ان لوگوں کے نزدیک خداوند کریم کی توفیق کے بغیر کچھ بھی نہیں ہونے پاتا۔ اور بزرگوں کا کہنا ہے کہ تیرے اعمال کی نوعیت یوں ہونی چاہیئے کہ کن فی الابتداء کانک قدری وکن فی الانتہاء کانک جبری (یعنی ابتداءً تیرا عمل تیری قدرت سے شروع ہو اور تو سمجھے کہ میں اس کے کرنے پر قادر ہوں اور آخیر میں تیری کیفیت یوں ہو جائے کہ تو مجبور محض ہے۔ اور تیری طاقت اور قدرت سے کچھ نہیں ہو رہا) یا یہ معنیٰ ہیں کہ تو ابتداء میں اپنے کو قدریہ تصور کر اور انتہاء میں جبریہ۔ قدریہ اور جبریہ دو مذہب ہیں۔ قدریہ کا عقیدہ ہے کہ اپنے اعمال کا انسان خود خالق ہے۔ اور جبریہ کہتے ہیں کہ انسان مجبور محض مثل شجر وحجر کے ہے۔ لیکن اہل حق لوگوں کے نزدیک یہ دونوں مذہب باطل ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے لاقدر ولاجبر ولکن امرٌ بین امرین۔ لیکن کہتے ہیں کہ مبتدی کو ابتداً مذہب قدریہ نافع ہے۔ اور مذہب درست اور راہ راست یہ ہے۔ کہ عمل کرے اور اس کی نسبت بھی اپنی طرف کرے لیکن باوجود اس کے اس بات کا بھی یقین رکھے کہ وہ عمل اور اس کا اثر جو وجود میں آئے ہیں وہ سب خدا کے پیدا کرنے اور توفیق سے وجود میں آئے ہیں بندہ صرف کاسب اور عامل ہے۔ نہ خالق اور عمل سبب دخول جنت ہے جس کو اللہ نے پیدا فرمایا نہ علت کہ وہ خود موثر ہے۔ اس کو سبب

عادی کہتے ہیں۔ اور جو چیز اس طرح وجود میں آئے اس پر اثر مرتب ہوتا ہے۔ اگر وہ چیز نہ ہو تو اثر بھی نہ ہو۔ اسی کو اسباب عادی کہتے ہیں اور اس جہان کے جمیع کاروبار واعمال سب کے سب عادی ہی ہیں۔ یعنی عادت اور سنت الٰہی اسی طرح ہے۔ کہ اگر فلاں نے یوں کیا تو یوں ہوگا اور اگر چاہے تو نہ بھی کرے۔ مگر عادت یہی ہے کہ وہ ایسا کرتا ہے مثلاً آگ کو اس نے اس طرح پیدا کیا ہے جیسے معروف ہے لیکن جلانے والے اللہ ہی ہیں۔ اگر سو آگ جمع کی جائے اور وہ نہ چاہے تو ہرگز نہ جلاسکیں۔ خدا تعالےٰ کے چاہنے نہ چاہنے سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے کہ آگ علت ہے جلانے کی اور اس کی طبیعت ایسی ہی ہے۔ یہ فلسفیوں اور دہریوں کا عقیدہ ہے اور مذہب حق یہ ہے کہ جلانے والے حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی ہیں۔ لیکن وہ آتش کے ذریعہ جلواتا ہے۔ تو آگ کو جلانے میں دخل دیدیتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو بغیر آتش کے بھی جلادے اور اگر چاہے تو آتش کے اندر بھی بچادے تو فرق درمیان سبب اور علت کے یہی ہے پس پیدائش اللہ تعالےٰ کی دو قسم پر ہے۔ ایک تو اسباب اسی کو عادت کہتے ہیں۔ اور دوسرے بغیر اسباب کے اس کو خرق عادت کہتے ہیں۔ عادت یہ ہے کہ جب تک آدمی کھائے نہ اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور ایک نہ کھائے اور اس کا پیٹ بغیر غذا کے بھر جائے یہ خرق عادت ہے۔ اور عادت یہ ہے کہ جب تک آدمی راستے پر نہ چلے منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے اور اگر بغیر راستہ چلے اور قدم اٹھائے کوئی منزل مقصود تک پہنچ جائے تو یہ خارق عادت ہے۔ اکثر افعال قبیل اول سے ہیں۔ اور ثانی کا بھی وجود ہے اس پر انبیائے کرام کے معجزات اور اولیائے کرام کی کرامات دلیل ہیں۔ اور اعمال وافعال تمام بندوں کے قدرت الٰہی سے ہوتے ہیں۔ لیکن عمل سبب جزاء ہے اگر عمل نہ کرے تو جزا بھی نہ پائے۔ اور بے عمل بہشت میں نہ جائے یعنی اللہ تعالےٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے۔ جب تک بندے سے عمل ظہور میں نہ آئے اس جزاء کا ترتب بھی خدا کی طرف سے نہ ہو اور اس کو بہشت نہ دے اور اگر چاہے تو اس کو بھی بہشت میں لے جائے اور اگر چاہے تو عمل کرنے والے کو بھی بہشت میں نہ لے جاتے لیکن عادت خداوندی اس طرح ہے کہ ایسا ہرگز نہیں فرماتے۔ کہ بے عمل کو بہشت میں ہرگز نہیں داخل کرتے اور باعمل کو دوزخ میں

نہیں لے جاتے۔ اس جگہ ایک فرق دوسرا بھی پیدا ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کریم ہیں وہ اول کو کرتے ہیں نہ ثانی کو کیوں کہ کام کا یہی ہے نہ کہ ثانی۔ وہ اپنے کرم سے خلاف وعید کر لیتے ہیں نہ خلاف وعدہ وہ کافروں کو ہرگز نہیں بخشیں گے اور نہ ہی ان کو بہشت میں لے جائیں گے یہ اس کا حکم ہے اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں اور مسئلہ قضاء وقدر اور بندے کے مختار ہونے کا غوامض میں سے ہے۔ اس جگہ صرف ایمان لایا جائے اور اس پر مزید بحث فضول ہے۔ اس لئے کہ کوئی عمل اور حقیقت اس مسئلہ کے کشف پر موقوف نہیں عمل اور کوشش کرنا چاہیئے۔ اور رب تعالیٰ کے دربار میں التجاء کرنی چاہیئے تاکہ نور یقین اور اطمینان وسکون حاصل ہو۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ عمل کرنا تو نہی اور امر پر موقوف ہے۔ نہ معلوم کرنے اس راز اور حقیقت کے حدیث میں آتا ہے کہ پروردگار قیامت کے روز اپنے بندوں سے نہی اور امر کے بارے میں سوال کریں گے نہ اپنی ذات اور صفات کے بارے میں ان اوصاف پر ایمان لانا چاہیئے جو شریعت کے اندر موجود ہیں۔ اور وہ صفات جو عقل کے ادراک سے حاصل ہو جائیں اور وہ صفات جو متشابہ ہیں۔ ان کے سمجھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان پر ایمان لانے کے بعد عمل میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔ پھر نور ایمان سے ان اوصاف کا یقین بھی دل میں آجائے گا اور کسی قسم کا کوئی خلجان نہ رہے گا۔ یہ شبہ اور خلجان اس وقت تک دل میں رہتا ہے جب تک نور ایمان حاصل نہ ہو۔ جب نور ایمان آجائے گا تو سب چیزوں پر یقین کامل حاصل ہو جائے گا۔ اور جان لے گا کہ اس جگہ شریعت میں امر ونہی واقع ہوئے ہیں۔ اور تیرے اندر ایک ایسی چیز موجود ہوگی جو معنیٰ امر ونہی کے سمجھے گی اور خود کے اندر ایک ایسی حالت پیدا ہو جائے گی جس سے فعل اور ترک وجود میں آئیں گے اسی کو اختیار بندہ کہتے ہیں۔ اور اس حالت کا وجود بندہ کے اندر ظاہر ہے۔ جیسے کہ سمع وبصر اور باقی صفات یہ تمام یقینیات بلاشبہ معلوم ہیں۔ پھر شک وشبہ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور طلب تحقیق اور اختیار کے معنیٰ اور جبر کے معنیٰ معلوم کرنا اور حیلہ سازی اور بہانہ جوئی کس لئے ہے۔ اور اگر ابھی تک نور ایمان دل میں پیدا نہیں ہوا تو اس کی فکر کرنی چاہیئے اور اس کا غم کھانا چاہیئے ایمان کے حاصل ہونے کے بعد کوئی شبہ اور اشکال باقی

نہیں رہتا۔ ایمان تو ایک کسبی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں بندہ کو دخل ہے اور فکر و نظر تو دلائل اور آیات اسلامیہ میں کرنی چاہیئے نہ کہ شکوک و شبہات میں جو پرخطر راستہ ہے۔ اس جگہ نفع بخش چیز اللہ کے نیک بندوں کی صحبت کو اختیار کرنا ہے۔ لیکن یہ بھی نادر اور کمیاب ہے۔ اس لئے سب سے بہترین راستہ تو اللہ کے دربار میں التجاء و درخواست پیش کرتے رہنا ہے۔ اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنا اور علوم دینیہ سے معلومات حاصل کرنا۔ اور پھر ان علوم میں سے عمدہ علم علم الحدیث ہے۔ اور صوفیائے کرام کے راستہ سے آشنا ہونا جو صاحب صراط مستقیم ہیں۔ اور اس طریقہ کے دواعی کو اختیار کرنا اور اضداد سے اجتناب کرنا واللہ الموفق ومنہ الامداد وھو الہادی لطریق السداد والرشاد وصلے اللہ علیٰ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

مکتوب نمبر ۲۸

بنام نواب فرید مرتضیٰ خاںؒ

ترك الاختيار والتدبير بالاكتفاء بتدبير الخبير

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ اللہ کے سامنے مطالبات کو پیش کرنے والے لوگ دو قسم پر ہیں عادت عامہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں جو بھی آیا وہ اللہ کے سامنے پیش کر دیا قطع نظر اس سے کہ اس میں اللہ کی خوشنودی بھی ہے یا نہیں اور مقید و مشروط کا بھی کوئی خیال نہیں کیا جاتا ۔ اہل معرفت لوگوں کا تو طرز عمل یہ ہے کہ اپنی زبان کو بند رکھتے ہیں اور اپنی کوئی مراد پیش نہیں کرتے صرف اللہ سے اس کی خوشنودی کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ اور اس طرح دعا کرتے ہیں ۔ کہ اے ہمارے پروردگار وہ چیز جس سے آپ راضی ہوں اور وہ چیزیں جن کے اندر ہماری بھلائی مضمر ہو پیدا فرما دیجئے ۔ راہ راست بھی یہی ہے کہ بندہ اپنی کوئی مراد اور خواہش نہ رکھے اور سوال کرنے سے اپنی زبان کو بند رکھے اس لئے کہ سوال اور بندگی دونوں جمع نہیں ہوتی ۔ خواہش تو خواہش مولیٰ کی ہے بندہ کی کیا خواہش ۔ اور اگر باقتضائے بشری یا امتثال امر کی خاطر جو اللہ تعالےٰ نے فرمایا ادعونی الخ دعا کرنا چاہے تو پھر کوئی مخصوص دعا اور حاجت پیش نہ کرے بلکہ مطلق دعائے خیر کرے ۔ اور اگر کسی مخصوص دعا کی ضرورت پڑ جائے تو اس کو بھی اللہ کی خوشنودی سے مقرون کرے ۔ پس بندہ کو چاہیئے کہ تدبیر اور تصرف سے کام نہ لے بلکہ اپنے کو اللہ کی تدبیر اور اختیار میں چھوڑ دے ۔

کارِ خود را بخدا بگذار کہ نمی بینم ازیں بہتر کار

(یعنی اپنے کو خدا کے سپرد کر دے ۔ اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں) اس جگہ تین مقام ہیں ۔ اول ۔ اعلیٰ ۔ وہ یہ ہے کہ ترک کو چاہے اور تدبیر کو ساقط کر دے جو بندہ ہونے کی شرط ہے اور نظر ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی عظمت اور ہیبت پر رکھے اور یہی عارفوں

کا مقام ہے۔ کہ خدا کی عظمت سے مغلوب ہو کر وہ کوئی دم نہیں مارتے اور اپنے گوش و ہوش کو اس کے فرمان و ارشاد پر متوجہ رکھتے ہیں۔ اور زبان کو سوال اور طلب سے روکے رکھتے ہیں۔ اور قصد و ہمت کو امتثال امر پر صرف کرتے ہیں۔ دوسرا مقام مومنین اور ارباب یقین کا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتے ہیں۔ اور اس کے لطف و کرم کو اپنے حال کا وکیل سمجھتے ہیں۔ اپنے تمام کاروبار کو اللہ کے اختیار اور تدبیر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور فارغ البال اور مرفہ الحال ہو کر فراغت اور استراحت کے بستر پر پڑے رہتے ہیں۔ یعنی خدا تعالیٰ بغیر سوال اور طلب کرنے کے ان پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے اگرچہ ان کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت کہ تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاءُ سے خوف و ہراس لاحق ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ان کو اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رہتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تو ویسے ہی کرتے ہیں جیسے بندے کا گمان اور ظن ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہر حال میں مامون رہتے ہیں۔ اور تیسرا مقام یہ ہے کہ تدبیر کو ترک کیا جائے اور تردد و پریشانی کو ختم کر کے صبر و سکون اختیار کیا جائے۔ اس مرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے تجربۂ عقل کافی اور صافی ہے۔

نکتہ:۔ اس جگہ ایک نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ یہ وہم اور گمان نہ ہو کہ جب ترک تدبیر اور اختیار اس راہ کی شرط اول ہے تو التزام وظائف اور عبادات میں سعی و جد و جہد کرنا بھی طریق بندگی کے منافی ہے۔ تو چاہیئے کہ عبادت اور سعی و جد و جہد سلوک کے راستہ میں اور دیگر ضروریات میں کوشش کو ترک کر دیا جائے۔ اور دین و دنیا کے سب کاروبار سے فارغ ہو کر بیٹھ جائیں۔ جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ ہمیں جو تدبیر اور اختیار سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایسی تدبیر اور اختیار جو ہمارے نفس کے اکسانے پر اختیار کیا جائے۔ اور وہ از امور نفسانیہ ہو۔ تدبیر و اختیار تو خود خداوند کریم نے اپنے بندوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ غرضیکہ وہ تدبیر اور اختیار جو خداوند کریم کے احکام کے خلاف نہ ہو ممدوح اور قابل اختیار ہے۔ اصل اپنی خواہشات سے روکا گیا ہے جو شریعت کے خلاف ہوں اور اگر اپنی خواہش اور تدبیر خود شریعت کے منشاء کے عین مطابق ہو تو اس سے

منع نہیں کیا گیا۔ بندہ کے لئے یہی لائق ہے کہ یہ وہی چاہے جس کو اللہ چاہے۔ اگر یہ اس کی خواہش کو نہیں چاہتا تو پھر بندہ نہیں بندہ کو ہر وقت یوں ہونا چاہیئے کہ اگر مولیٰ کہے کہ تو اس چیز کی خواہش رکھ تو وہ اس کی خواہش رکھے اور اگر اللہ کسی چیز سے روک دے تو یہ رک جائے۔ اور اگر امر کرے کہ اس کو کر۔ تو کرنا شروع کر دے اور اگر منع کر دے تو رک جائے جب آدمی اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو خواہش ناخواہش ہوتی ہے۔ اور ناخواہش عین خواہش بن جاتی ہے مشہور بات ہے کہ سلطان العارفین بایزید بسطامیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں جواب دیا کہ میری یہ کیفیت ہو جائے کہ میں کچھ بھی نہ چاہوں۔ اس موقعہ بعض لوگوں نے اشکال پیش کیا ہے کہ بایزید بسطامیؒ کا یہ کہنا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایسی کیفیت اور حالت ہو جائے کہ کچھ بھی نہ چاہوں۔ یہ بھی تو ایک خواہش اور ایک قسم کا چاہنا ہے۔ اس کے جواب میں ابن عطاء اللہ اسکندری کتاب التنویر فی اسقاط التدبیر میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ یہ اعتراض سلطان العارفین پر ایک ایسے شخص کا ہے جو معرفت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ بایزید بسطامیؒ کا یہ چاہنا کہ میں کچھ نہیں چاہتا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ چاہیں۔ تو یہ ان کی کوئی اپنی خواست نہیں۔ بلکہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہیں۔ تو حقیقتہً یہ خواست اللہ تعالیٰ کی خواست ہے۔ نہ کہ بایزید بسطامیؒ کی ان کی خواست کیا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی خواست ہے۔ ان کی خواست تو وہی ہوتی ہے۔ جو اللہ چاہیں۔ اور تدبیر بھی وہی جو اللہ تعالیٰ فرماتے اور چاہتے ہیں۔ ان بندوں کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے شرائع اور احکام متعین فرما دئے ہیں۔ یہ ان پر چلتے رہیں اور انہیں کرتے اور چاہتے رہیں۔ اور اس پر استقامت سے قائم رہیں تو دنیا اور آخرت کی نیک بختی کو پائیں اور اپنے نفس کی تدبیرات اور اختیارات کو ترک کر کے بالکل فارغ ہو کر بیٹھ جائیں میں ان کا پروردگار اور مہربان ہوں انہیں مجھ ہی پر اکتفاء کر لینا چاہئے اور میرے سامنے اپنی تدبیروں کو دخل نہ دیں۔ اور بعضوں کا کہنا ہے۔ کہ یہ بات بایزید بسطامیؒ کے ابتدائی حالات پر محمول ہے۔ اور اب وہ خواستی رکھتے ہیں۔ اور خواست ان کی یہ ہے کہ کوئی خواست نہ رہے، اور خواست ناخواست سے بدل جائے۔ مگر یہ ان بزرگوں کی باتیں ہیں

جو ان کا اپنا ذوق ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے۔ کہ اپنی خواست وہ ناجائز ہے۔ جو شریعت کے خلاف ہو اور اپنے نفس کی پیداوار ہو۔ لیکن وہ تدبیرات جو شرع شریف کے موافق ہوں ناجائز نہیں۔ اگرچہ وہ از قبیل خواستی ہی کیوں نہ ہوں تب بھی ان کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی خواست ہو تو حقیقتہً وہ خواست خواست مولیٰ ہے جو عبودیت کے منافی نہیں بلکہ یہی شان عبودیت ہے۔ قطب الوقت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کا ارشاد ہے کُلّ مختارات الشرع وترتیباتہٗ لیس لک منہٗ شیٔ انما ھو تدبیر اللہ لک فاسمع واطع۔ یعنی وہ ترتیبات اور اختیارات جو شریعت اور خدا تعالیٰ کی قائم فرمودہ ہیں۔ وہ ترتیبات اللہ تعالیٰ کی ہیں جو تیرے لئے قائم کی گئی ہیں ان کو غور سے سن اور اطاعت کر تیرا اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہی ایک اصل اور اساسِ محکم ہے جس پر عبودیت کا کارخانہ موقوف ہے۔ یہ فقہ ربانی اور علم لدنی ہے جس کو یہ نصیب ہو وہ سعادت مند ہے۔ اور جو اس سے خارج ہو وہ بدبخت ازلی ہے اور جادۂ شریعت سے خارج ہے۔ جو عنقریب مصائب کے ہاتھوں اُچک لیا جائے گا۔ اور جو اللہ تعالےٰ کی قائم کردہ ترتیبات اور اختیارات پر چلے گا وہ گمراہ ہونے سے مصئون اور محفوظ رہے پس بندہ کو چاہیئے کہ وہ اپنی خواست اور ارادت سعی اور طلب کو جاری رکھے اور اللہ سے خائف رہے۔ اور حدود شریعت کی رعایت کرے اسی پر چل کر وہ سالک راہِ راست ہو جائے گا۔

۵ راہِ راست رو تا بمنزل رسی

یعنی راہِ راست پر چل تاکہ منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ خواہ فقیر ہو یا امیر اور از زمرۂ ملوک ہو یا مساکین اس کا عمل اور خواست خداوند کریم کے امر و نہی کے موافق ہو تو وہ خداوند کریم کی خوشنودی اور رضا حاصل کرے۔ اس کو ترک مال و منال اور تجرید وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ اگر فقیر ہے تو اس کو صابروں میں اگر غنی ہے تو اس کو شاکروں میں شمار کیا جائے فقیر صابر اور غنی شاکر اپنے یار کو پانے میں برابر ہیں۔ اصل بات تو فرمانبرداری اور اطاعت ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اگر فقیر جادۂ استقامت پر رہ کر صبر نہ کرے تو وہ بھی راندۂ درگاہِ خداوندی ہے۔ اور اگر غنی ہو اور وہ اپنی خواہشات اور شہوات نفسانیہ میں مصروف رہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کی

درگاہ کا مطرود اور مردود ہے۔ اس جگہ پر اس بزرگ کی بات یاد آگئی جنہوں نے فرمایا تھا کہ تمام آدمی چار قسم پر ہیں۔ ملوک دنیا و آخرت۔ فقرائے دنیا و آخرت۔ و فقرائے دنیا و ملوک آخرت۔ ملوک دنیا و فقرائے آخرت۔ ملوک دنیا و آخرت تو وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں بھی عیش و عشرت سے رہے اور آخرت کے بارے میں بے فکر نہیں رہے بلکہ آخرت کے کاروبار میں مصروف رہے جس کی وجہ سے وہ آخرت میں بھی عیش و عشرت سے رہیں گے۔

اور فقرائے دنیا اور ملوک آخرت وہ لوگ ہیں۔ کہ اگرچہ وہ اس جہان میں خوش و خرم نہیں رہے لیکن اپنے صبر اور عبادات کی جزاء میں بہشت پائیں گے اور مقامات عالیہ پر فائز ہوں گے۔ اور دوسرے دو قسموں کو ان پر قیاس کرلیا جائے میں نہیں جانتا کہ میں کس قسم میں داخل ہوں۔ یہ دو قسمیں جن کا ذکر ہوا درجات اور مراتب ان کے بہت ہیں۔ اور میں ان کے جس مرتبہ میں داخل کردیا جاؤں غنیمت ہے۔ تاکہ عاقبت میں دکھ نہ ملے بات بہت طوالت اختیار کرگئی بہرکیف اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ بندہ کی تدبیر اور اختیار طریق مشروع سے محمود ہے۔ اور اسکی وہ خواہش و خواست اور تدبیر و اختیار جو شریعت کے خلاف ہو باطل اور مذموم ہے۔ تو اس کی خواست ایک وجہ سے محمود ہے اور ایک وجہ سے منہی عنہ اور مذموم ہے مذموم اس اعتبار سے کہ اس کا عنوان شان عبودیت کے خلاف ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سطوت و عزت کے منافی ہے۔ اور محمود اس اعتبار سے ہے کہ بندہ تو دعا کرنے کے ساتھ مامور ہے۔ اور توفیق خدا سے ملتی ہے۔ تدبیرات اور ترتیبات جو علیم و خبیر نے واسطے اصلاح حال اور وصول کے بدرجہ کمال اپنے بندوں کے لئے وضع کردی ہیں۔ ان کی مطلقاً نفی کرکے عدم جواز کو راجح قرار دینا جبر و تعطیل ہے۔ اور مطلقاً تدبیرات و ترتیبات پر بھروسہ کرکے انہیں پر اعتماد کرنا اعتزال ہے یہ دونوں طریقے اور نظرئیے باطل اور مردود ہیں۔ اور صحیح اس کے مابین والا راستہ ہے جس کی ہم نے اس سے قبل تشریح کردی ہے۔ اس قاعدہ اور طریقہ پر چلنے سے تدبیرات و اختیارات بسا اوقات مذموم اور باطل ہیں اور بسا اوقات ممدوح اور قابل عمل ہیں۔ اور جو شخص ان دونوں جہتوں کی رعایت نہیں کرتا وہ خطاکار ہے۔

اور راہِ حق کو گم کردہ ہے۔ اکثر اختلاف مذاہب اسی بناء پر مبنی ہیں کہ ایک جہت سے، جائز اور دوسری جہت سے ناجائز ہو جاتے ہیں اصل اس میں یہی ہے کہ جہات کی رعایت کر کے اس معاملہ کی حقیقت معلوم کی جائے۔ یہ عالم بھی ایک حیثیت سے ہست ہے اور ایک حیثیت سے منفی۔ باعتبار ظہور صفات باری تعالےٰ اور خداوند کریم کی قیومیت دائم اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ جو اس عالم میں موجود ہے۔ اس اعتبار اور حیثیت سے یہ جہاں ہستی کے مقام کا متقاضی ہے۔ اور اگر اس کا اعتبار نہ کیا جائے تو نیستی ہے۔ کسی چیز کا مدار کار وجود کی حیثیت پر موقوف ہے۔ اور وضع شرائع وملت اور نظام قوانین وغیرہ ذالك من الآثار والاحکام اسی حیثیت سے ہیں۔ اور وجود کمالات اور معرفت اسمائے الٰہی بھی اسی وجہ پر مترتب ہے۔ اور حقائق واسرار اشیاء کے انوار سے محروم اور زیادہ بے نصیب سوفسطائی سے اور کوئی نہیں ہے۔ جو حقیقت عالم کو وہم وگمان خیال کرتا ہے۔ اور ہر چیز اور ہر حکم کے اندر شک کرتا ہے، حاشا وکلا بناء ہر حکم کی یقین اور اعتقاد پر ہے جب کسی کو یقین نہ ہو تو اس کا کوئی کام حل نہیں ہوتا۔ اور نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اس لئے بے کار ثابت ہوتا ہے۔ یقین سبب اتصال باطن ہے۔ اور سلوک طریق ارشاد وسداد ہے اور آدمی تمام سرگردانی اور بے ثباتی میں مبتلاء ہیں اور دین و دنیا کے کاروبار میں شک کرتے ہیں۔ اور صاحب شک منکر سے بھی زیادہ پریشان ہوتا ہے۔ اگرچہ منکر آدمی طریق صواب سے دور تر ہے۔ اور اسفل درجہ اس کا مقام ہے۔ لیکن اس کو یکسوئی نصیب ہے جس کی وجہ سے پریشان نہیں لیکن صاحب شک کو تو تردد ہے اس لئے وہ پریشانی اور سرگردانی میں مبتلاء ہو کر بہت زیادہ پریشان ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ کے اوصاف لامتناہیہ کو سوچ کر حیرت میں ضرور مبتلاء ہوتا ہے لیکن اس جگہ شک وشبہ کو کوئی راستہ نہیں ملتا کہ جس سے پریشانی لاحق ہو۔ اس لئے کہ حیرت سے شئی کی کنہ اور معرفت معلوم ہوتی ہے۔ اور شک کرنے سے جہالت اور نکبت آتی ہے۔ اور حیرت از قبیلہ حضوری ہے اور شک از قسم غیبوبت، چنانچہ ایک، تو نظارہ محبوب میں حیران ہے۔ اور اس کے جمال وکمال کو بلا حجاب دیکھتا ہے۔

لیکن اس کے کمال کی حقیقت اور کنہ تک رسائی نہیں پاتا۔ اور اس وجہ سے اس کا ادراک نہیں کر سکتا یہ حال مشاہدۂ محبوب سے ہے جو نہایت ہی اچھا ہے۔ ہر دفعہ نظر کرنے سے محبوب کا حسن ایک دوسری حالت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ غرضیکہ ہر نظر میں نیا کرشمہ اور نیا ذوق پاتا ہے۔ بخلاف شکی کے کہ وہ محبوب کے جمال و کمال میں شک کرنے کی وجہ سے تردد میں مبتلاء ہے، ایسے شخص کی ہر نظر میں محبوب محجوب ہوتا ہے اور یہ علم و جہالت کی کش مکش میں مبتلاء ہو کر پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہ ہی علم رکھتا ہے اور نہ ہی جہالت اس کی درمیانی حالت میں پریشان اور سرگرداں پھر رہا ہے۔

بعض لوگوں نے حیرت کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک حیرت محمود۔ دویم حیرت مذموم اور حیرت مذموم کو شک قرار دیتے ہیں۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہم عرض کر چکے ہیں

وصل :۔ یقینیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے۔ کہ ہر شخص کو نیک اور بدعمل کی جزاء و سزاء کا ملنا ضروری ہے۔ خواہ دنیا میں یا آخرت میں لیکن دنیا میں ضروری نہیں اس جگہ استدراج کو دخل ہے جیسے خود خداوند کریم کا ارشاد ہے سنستدرجھم من حیث لا یعلمون دنیا دارِ ابتلاء اور محل فتنہ و بلا ہے۔ اس کے مصائب اور مکروہات ظالموں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ اکثر و بیشتر اوقات اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں کو بھی اس کی مصیبتوں اور آفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی متعدد حکمتیں اور اسرار مضمر ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک بہترین چیز تو یہ ہوتی ہے کہ ان مقبولوں کو ہمت اور سعی کرنے کی توفیق مل جائے اور یہ مزید کوشش کرنے کے عادی بن جائیں اور شوق و محبت تیز تر ہو جائے۔ مشاہدہ اسی بات کا ہے کہ سالکان طریق کے لئے یہ چیز بڑی مفید ہے۔ کہ قوت عمل اور مجاہدہ کی زیادتی سے وہ بڑے مقامات حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی دو رکعت نفل پڑھنے اور کتاب اللہ کے کچھ حصے پڑھنے کو مشکل و دشوار سمجھتا ہے۔ اور ایک آدمی ایسا ہے جو مجاہدہ اور ریاضت کر کے اپنی طبیعت کو اللہ کی عبادت کرنے کا خوگر بنا چکا ہے وہ اگر ہزار رکعت نفل بھی ادا کرے اور قرآن کو ختم کرے تو اس کی طبیعت پر گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ عمل کی جزاء اور صدق نیت کا نتیجہ ہے۔ یہ کثرت عمل جو

دنیا کی جزا دیہے یہ جزائے آخرت ہی ہے جزائے عمل پر اعتقاد و یقین اور ایمان رکھنا چاہیئے۔ اور شریعت کے جمیع اوامر و نواہی اور مخبر صادق کی سب باتوں پر بھی یقین و ایمان رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً اگر ہم فرض کرلیں کہ ایک آدمی کا ایمان سست اور نور یقین ضعیف ہے تو اس کو چاہیئے کہ کثرت سے عمل کرے۔ یہی عمل ایمان کو قوت بخشے اس لئے کہ عمل کرنے سے ایمان کی قوت میں زیادتی لازمی امر ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے لئے لازم ہے۔ کہ نورانیت کا اثر ایک کا دوسرے پر پڑتا ہے۔ عمل ایمان سے قوت پکڑتا ہے اور ایمان عمل سے۔ اور ہر ایک دوسرے کا معاون اور ممد ہے۔ عمل کو ایمانی قوت اور یقین پر موقوف نہ سمجھا جائے۔ جتنی قدر بھی ایمان حاصل ہے اگرچہ تقلیدی ہی کیوں نہ ہو عمل کرنے میں کوشش اور سعی بلیغ کی جائے جس سے قلب میں نورانیت اور ایمان میں تروتازگی پیدا ہو۔ مزید برآں ایمان اس سے قوت پکڑے۔ اور اس عمل سے جو ایمان میں قوت آئی ہے۔ اس ایمانی قوت سے عمل میں قوت پیدا ہوگی پھر اس عملی قوت سے ایمان میں قوت پیدا ہوگی اسی طرح ہر بار ہر دو کی قوت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور ایمان و عمل ایک دوسرے کی امداد اور اعانت کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ایمان کی کیفیت درست ہو کر محبت کا درجہ حاصل کرے۔ پس وہ جو کہا گیا ہے کہ جب یقین حاصل ہو جائے تو ایمان درست ہو جاتا ہے پھر کسی عمل کی ضرورت اور احتیاج نہیں رہتی پھر اگر وہ عمل کرتا ہے۔ تو اس کے اسی عمل سے تفکر پیدا ہوتا ہے اور وہ خطاء و غلطی کا مرتکب ہو جاتا ہے جو فعل جوارح ہے۔ لیکن جن لوگوں کا یہ قول ہے وہ الحاد کے راستہ پر پڑ گئے ہیں۔ اور قرآن کریم کی صریح نص کے خلاف کہتے ہیں۔ جو اللہ کا ارشاد ہے۔ ثم تلین جلودھم وقلوبھم الی ذکر اللہ اہل طریقت کا مسلک یہ ہے کہ محبت جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اسی طرح ایمان و عمل بھی بڑھتے جائیں گے اور نبی علیہ السلام اور قرآن کی اتباع میں بھی اسی طرح اضافہ ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ سید الطائفہ جنید بغدادیؒ ان لوگوں کے بارے اتنی شدت سے یہ فرماتے ہیں۔ کہ جو لوگ عمل کو بیکار قرار دیتے ہیں وہ چور اور زانی سے زیادہ مجرم و خطا کار اور گناہ گار ہیں۔ اور اس طرح ہرگز نہیں ہوتا کہ عارف عمل کو ترک کردے حاشا و کلا تجھ کو انبیائے کرام کے احوال سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ ایمان اور یقین میں ان کی کوئی نظیر نہیں مگر

باوجود اس کے ان پر کتنی مصائب اور آفات آئیں لیکن وہ اللہ کی عبادت میں مصروف و مشغول رہے اور خصوصاً صاحب قاب قوسین او ادنی صلی اللہ علیہ وسلم جو رات کو نماز میں اس طرح کھڑے رہتے تھے کہ پاؤں پر ورم آجایا کرتے تھے اور انبیائے کرام تو دوسروں کو سمجھانے کے لئے آتے تھے کہ تم ہماری اتباع یوں کرو جیسے ہم کر رہے ہیں. جب کہ تشریع انبیائے کرام کی ایسی ہوتی ہے کہ خود کریں تاکہ دوسرے اس کی اتباع کریں اگر خود پر امر فضول ہو تو اتباع کا فائدہ باطل ہو جاتا ہے. پس لازم ہے کہ عمل وہی قابل قبول ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ملتا ہو اور جن لوگوں کا کہنا ہے کہ جب ایمان درست ہو جاتا ہے عمل کی ضرورت نہیں رہتی یہ بات ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے قابل ہے اور واللہ یہ بات بے دین اور ملاحدہ کی ہے جس میں ذرا برابر بھی سچائی نہیں نعوذ باللہ من الکفر والالحاد. ایمان بغیر عمل کے ناقص اور با لعمل کامل ہوتا ہے. اور وہ جو روایت ہے کہ الایمان لا یزید ولا ینقص (یعنی ایمان نہ بڑھتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے) اشارہ اسی بات کی طرف ہے کہ عمل کو ایمان کی حقیقت میں کوئی دخل نہیں اور حقیقت ایمان کی ایک ہی ہے کہ دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کو ایمان کہتے ہیں. اور جوارح سے عمل کرنا اس کی تکمیل اور تتمیم ہے. تاکہ بیرون اور اندرون برابر ہو جائیں پس ایمان میں زیادتی اور کمی نہیں ہوتی لیکن ساتھ کمال و نقصان کے موصوف ہوتا ہے. اور زیادتی تو شئی کی ذات کے حدود میں اور کمی اوصاف میں ہوتی ہے. جیسے کہ آدمی اگر کامل ہو دو آدمیوں سے بلکہ بسا اوقات ایک آدمی کو اور ہزار آدمیوں سے بھی کامل تر ہوتا ہے. اسی طرح ایک کی تصدیق کامل تر ہے دوسرے کی تصدیق سے صفات میں تفاوت نتائج اور ثمرات میں تفاوت کو مستلزم ہے. مثلاً ایک ولی روشن اور تاباں آفتاب کی مانند ہے اور دوسرا چاند یا ستارہ. یا شمع کی مانند ہے. حالانکہ دونوں ولی ہیں مگر ان کے اوصاف میں فرق ہے اس لئے ان کے نتائج اور ثمرات میں بھی فرق ہے. غرضیکہ ایمان میں قوت و ضعف بکمال اور نقصان کے اعتبار سے تفاوت ثابت ہے. اور ظاہر ہے کہ قوت اور کمال عمل سے پیدا ہوتا ہے. اور ضعف اور نقصان ترک عمل سے.

۵ کارکن کاربگذار از گفتار ⁂ کاندریں راہ کار دارد کار

(یعنی کام کر اور باتیں چھوڑ دے۔ اس راستہ میں کام کرنا ہی سود مند ہے) الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے) جو یہاں کرو گے وہی وہاں ملیگا

بیت۔ از مذاہب مذہب دہقاں خوشش است اے مولوی

مذہب دہقاں چہ باشد ہرچہ کاری بدروی

(یعنی سب مذہبوں سے کسان کا مذہب بہتر ہے۔ کہ جو کرتا ہے وہی اٹھاتا ہے)

وصل :۔ اعتقاد نامہ مسلمانی۔ میں لکھا ہے کہ بندہ معصیت کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان کا اعتقاد درست ہو تو اس کو معصیت کے ارتکاب کی بنار پر کافر نہ قرار دیا جائے۔ لیکن ساتھ شرط یہ بھی ہے کہ وہ معصت کو معصیت ہی سمجھے اگرچہ اس کا مرتکب ہے۔ اور حرام کو حرام جانے۔ اور خوف و رجار کے راستہ پر گامزن ہو تو کافر نہیں اور اگر معصیت یا حرام کو حلال سمجھتا ہے تو کافر ہے۔ اور مومن گناہگار ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ اگر خداوند کریم چاہیں تو اس عاصی مومن کو کچھ عرصہ جہنم میں رکھ کر پھر بہشت میں پہنچائیں گے اور اگر چاہیں تو اپنی مہربانی یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے بغیر عذاب دئے بھی جنت میں بھیج دیں گے۔ دوزخ میں عذاب دے کر یا بغیر عذاب دئے جنت میں بھیجنے پر وہ ذات قادر ہے۔ اور علی الاطلاق یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء خداوند کریم کی صفت ہے۔ اور یفعل اللہ مایشاء ویحکم مایرید اس کی شان ہے۔ معنیٰ خدائی اور خداوندی کے یہ ہیں کہ جو چاہیں کریں اور جس کو چاہیں بخشدیں اور جس کو چاہیں عذاب دیں۔ اور کسی کو اس کے حکم میں دخل اندازی کا اختیار نہیں اس کے سامنے کسی کو بولنے اور سوال کرنے کی مجال نہیں۔ اس کے امر و نہی سب حق ہیں اور اس کے وعدو وعید سچے اور اس کے وعدوں میں تخلّف نہیں اسی طرح وعیدیں بھی۔ باوجود اس کے اگر وہ بتقاضۂ عفو و کرم اور درگذر کے نبی علیہ السلام اور نیک بندوں کی سفارش اور شفاعت بھی قبول فرمائے تو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ واثق اور برحق ہے انہیں گناہگاروں اور درماندوں کے بارے میں نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے شفاعتی لاھل الکبائر من امتی اور نبی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اگر میں اپنے اہل بیت کی سفارش نہ کروں تو دوسروں

کی کیسے کروں گا۔ اس کے علاوہ ایک روایت میں آتا ہے کہ پروردگار نے آتش دوزخ کو فاطمہؓ اور اس کی اولاد پر حرام کر دیا ہے۔ اور عجب بات ہے کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں اے بنی ہاشم تم اپنی جانوں کی حفاظت کرو اور اپنے کو دوزخ کی آگ سے بچالو میں دوزخ سے بچانے کا ذمہ دار نہیں۔ یہ سب نبی کریم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور کبریائی کی بنا پر کہا ہے کہ خداوند کریم کی درگاہ میں کسی کو سوال کرنے کی مجال اور اعتراض کرنے کا یارا نہیں اور اس سے جو پہلے گذرا وہ اللہ تعالیٰ کے عفو اور اس کے وعدوں کی بنا پر آپ نے فرمایا کہ وہ بڑے کریم ہیں اس لئے میں سفارش کروں گا۔ اور بزرگوں نے کہا ہے کہ اللہ کے سب نیک بندے اللہ کے حضور میں خوف و رجا اور انس و ہیبت کی وادی میں حیران اور پریشان ہونگے اور اللہ کے سر کو ہرگز نہ پاسکیں گے۔ کسی چیز میں دل نہ لگے گا اور فریاد کرتے رہیں گے اپنے ہونے پر نہ ہونے کو ترجیح دیں گے لیکن یہ سب کچھ ایمان ہے ایمان کا غم کھایا جائے باقی کوئی غم نہیں۔ پھر ایمان جاننا چاہیئے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو بصدق دل ماننا اور اعتقاد رکھنا چاہیئے اور بلاشک و شبہ اس کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ اس کلمہ کا جزوِ اول عظیم اور بزرگ تر ہے۔ اور جزوِ ثانی جامع ترین ہے۔ اس بات پر یقین رکھنا چاہیئے کہ محمد رسول اللہ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اور آپ جو کچھ لائے ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے ہے جو حق اور سچ ہے۔ ان دونوں جزؤں پر یقین رکھنے کا نام ایمان ہے۔ اور اگر ایک آدمی ہزار برس لا الہ الا اللہ کہتا رہے مگر محمد رسول اللہ نہ کہے تو وہ مسلمان نہیں یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تمہارا سب کا خدا اور پروردگار ہوں۔ جو بات میں کہوں اس کو بلا توقف تسلیم کرنا تمہارا فریضہ ہے۔ واقعی بندے کی بندگی اور صدق کا امتحان اسی میں ہے۔ اگر مان لیتا ہے تو عالی مراتب کو پالیتا ہے اور اگر نہیں مانتا تو ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا تھا کہ میں ایک بندے کو پیدا کر رہا ہوں تمہارا امتحان اسی میں ہے۔ کہ تم ایک ہیکل خاکی کو سجدہ کرو جس کے اندر میرا فیض ہے۔ سب نے اپنی ذات کے سر اس کے سامنے جھکا کر اس کو سجدہ کیا۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندہ اور بندگی کیا شی ہیں۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آخر زمانہ میں مرشد کامل کا ملنا امر

مشکل ہوگا اس وقت دیگر عبادتوں اور شرعی احکام کو بجا لانے کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کثرت سے درود پاک کی تلاوت کی جائے۔ جو بلا شبہ بلا احتیاج مرشد خدا تعالےٰ تک موصل اور مقرب ہے۔ بلکہ بعضوں کا تو کہنا ہے کہ سالک کو باعتبار توسل وتقرب کے اشتغال بالصلوٰۃ افضل ہے کہ وہ ہر وقت درود ہی کو تلاوت کرتا رہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ کی راہ کو پانے کے لئے درود سے بہترین اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اور عبادت کے بعد اس درود سے اور کوئی عبادت بالاتر نہیں اور ہر مشکل و دشواری اور تمام حاجتوں کی برآری کے لئے درود شریف سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہر دفعہ آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اتنی طوالت نہ کروں گا مگر جب لکھنے بیٹھوں تو بات سے بات نکل آتی ہے جس سے سخن طوالت پذیر ہو جاتا ہے بہر کیف اس معاملہ میں مجھے معذور تصور فرمایا جائے۔ اس لئے باتیں تو شیریں اور نصیحت آمیز ہوتی ہیں۔ اور قلم شارع عام سے بھٹکتا نہیں اور نہ ہی کہیں لغزش کھاتا ہے۔ اور جو کہتا ہے وہ کتاب مبین کی شرح ہوتی ہے۔ اور الدین النصیحۃ کی باتیں کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وصلے اللہ علی سید الانام الداعی الی طریق الحق والیقین محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

مکتوب نمبر ۲۹

بنام نواب فرید مرتضیٰ خاں

تحقیق الیاس عن قبول ایمان الباس

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ (اے اللہ حق دکھادے اور اس کی اتباع نصیب کر) جاننا چاہیئے کہ علمائے ملت اور آئمۂ دین وشریعت کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ ایمان الیأس غیر مقبول ہے۔ اور بأس کے لغوی معنیٰ شدت اور عذاب کے ہیں بمگر اس جگہ ہماری مراد بأس سے سکرات موت اور آخرت کے احوال کا معائنہ کرنے سے ہے۔ جو موت کے وقت آدمی دیکھتا ہے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ہر کافر و مومن اس وقت اپنی اصلی اور حقیقی جگہ کو دیکھتا ہے۔ یعنی مومن بہشت کو اور کافر دوزخ کو۔ تو کافر اگر ان حالات کو دیکھ کر اس وقت ایمان لائے تو اس کا ایمان معتبر نہیں، ایمان تو غیب کی چیزوں کو بلا دیکھے ماننے اور ان پر عمل کرنے کا نام ہے۔ اور اب وہ چیزیں غیب نہ رہیں لہٰذا اس وقت ان کو ماننے والے کو مومن نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ قیامت کے روز سب کافر اللہ کے دربار میں فریاد کریں گے ربنا ابصرنا وسمعنا فارجعنا نعمل صالحا انا موقنون۔ کہ اے اللہ ہماری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سن لیا کہ جو کچھ تیرے پیغمبروں نے بیان کیا وہ سب برحق ہے۔ اب ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیجئے تاکہ ہم اس پر عمل کریں۔ اور مستحق ثواب کے ہوں۔ لیکن یہ ایمان واعتراف اس وقت کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ اور حدیث شریف میں آتا ہے ان اللہ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر۔ اور غرغرہ کنایہ ہے سکرات موت اور جان کے حلقوم میں پہنچنے سے۔ اور قرآن کریم کا ارشاد ہے فلم یک ینفعھم ایمانھم لما رأوا بأسنا۔ یعنی اللہ کے عذاب اور سختی کو دیکھ کر ایمان لانا سودمند نہیں ہوسکتا۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے ولیست التوبۃ للذین یعملون السیأت حتی اذا حضر احدھم الموت قال انی تبت الاٰن۔ یہ آیت ہمارے دعوے

کی صریح اور صحیح دلیل ہے۔ اس لئے کہ پہلی آیت میں بأس سے مراد قیامت اور سورج کے مغرب کی طرف سے طلوع ہونے کا احتمال ہے۔ اور دوسری آیت میں مفسرین کا اتفاق ہے۔ اور قرآن کے الفاظ بھی صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ موت کے حاضر ہونے کی حالت میں توبہ اور ایمان والیقان کچھ بھی قابل قبول نہیں۔ جاننا چاہیئے کہ ہمارے سابقہ پیش کردہ دلائل سے روز روشن کی طرح واشگاف ہوگیا کہ توبہ حالت بأس میں قبول نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں بعضے علماء کو اختلاف ہے۔ لیکن بأس کی حالت میں ایمان لانا اور کفر سے توبہ کرنا باتفاق اجماع مقبول نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ فرعون کا ایمان بھی مقبول نہیں جو وہ غرق ہونے کی حالت میں لایا تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ بأس حیات ہی میں صادر ہوتی ہے لیکن بحالت مجبوری ہوتی ہے اس میں اختیار کو دخل نہیں ہوتا اس لئے ایسی حالت میں ایمان بالاختیار نہیں ہوگا۔ اور دوسرا مقبول نہیں یہ سب امت کا متفق علیہ مسئلہ ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اسی لئے تو فرعون تمام اہل اسلام کی زبان پر مقبوح و مذموم شمار کیا جاتا ہے اور نیز قرآن کریم کی متعدد آیات بھی اس کی تقبیح وسوءِ مآل کو ظاہر کرتی ہیں۔ جیسے ارشاد ہے۔ فاخذہ اللہ نکال الآخرۃ والاولیٰ اور ایک دوسرے مقام میں ارشاد ہے۔ فاخذناہ اخذاً وبیلا - اور دوسرے مقام میں ارشاد خداوندی ہے۔ واستکبر ھو وجنودہٗ فی الارض بغیر الحق وظنوا انھم الینا لایرجعون۔ تکبر کیا فرعون اور اسکے لشکر نے زمین میں ناحق اور گمان کیا انہوں نے کہ وہ اللہ ذوالبطش اور شدید العذاب کے دربار میں حاضری نہیں دیں گے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام میں ارشاد ہے۔ فاخذناہ وجنودہٗ فنبذناھم فی الیم۔ ہم نے ان کو اپنے قہر و عذاب سے پکڑ لیا پھر ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو غرق کردیا۔ فانظر کیف عاقبۃ الظالمین پس دیکھنا چاہیئے کافروں اور ظالموں کا انجام کار کہ ہم نے ان کو دنیا اور آخرت کے عذاب میں کیسے مبتلا کردیا۔ وجعلنا ھم ائمۃ یدعون الی النار یعنی ہم فرعون اور کفر کے پیشوا اور مقتداء لوگوں کو بلا کر جہنم میں ڈال دیں گے۔ ویوم القیامۃ لاینصرون۔ یعنی قیامت کے روز کوئی کسی کی امداد کرکے کسی کو عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ بلکہ یہ لوگ ابدی عذاب کے مستحق ہیں۔ واتبعنا ھم فی ھٰذہٖ الدنیا لعنۃ

اور دنیا میں اس اور اس کے لشکر پر ہم نے لعنت کر دی۔ ویوم القیامۃ ھم من المقبوحین۔ اور قیامت کے روز وہ اور اس کا لشکر مردود اور ذلیلوں میں سے ہوگا۔ حالت اس کی وہ ہوگی جو دیکھی تو نے اور وصف اس کا وہ ہے جو سنا تو نے ایمان اور کفر کی حالت برابر نہیں ہوتی اگر وہ ایمان پر مرتا تو اللہ تعالےٰ اس کو ان الفاظ سے یاد نہ فرماتے اگر کوئی ان سب آیات کو اس کے دنیاوی حالات پر محمول کرے تو وہ اس آیت کا کیا جواب دے سکتا ہے کہ ویوم القیامۃ ھم من المقبوحین کوئی اہل فہم اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ ان حالات کو اس کے لشکر پر محمول کیا جائے۔ پھر لطف یہ کہ آیات میں لشکر اور فرعون دونوں کا صراحتہً اور قصداً ذکر ہے خلاصہ یہ ہے کہ یہ ہرگز قابل قبول نہیں کہ فرعون اللہ کے نزدیک مسلمان اور پاک و صادق ہے۔ اللہ نے اس کی کسی جگہ پر مدح اور تعریف نہیں فرمائی اور خبر نہیں دی کہ وہ ہمارا بندہ تھا۔ حالانکہ اس نے اپنی تمام عمر تو کفر اور سرکشی میں گذاری تھی پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنا بندہ کیسے فرماتے۔ اور وہ کسی جگہ بھی ایمان کی صفت سے مذکور نہیں صرف اس آیت کے اندر جو ارشاد ہے۔ حتی اذا ادرکہ الغرق قال اٰمنت انہ لا الہ الا الذی اٰمنت بہ بنو اسرائیل وانا من المسلمین۔ اور اس آیت کا مفہوم سیاق وسباق سے واضح اور ظاہر ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور ان کی قوم نے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے بددعا کی تھی جس کے خمیازہ میں اس پر غرق ہونے کا عذاب مسلط کیا گیا اور جب یہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تو اس وقت اپنے ایمان کا اظہار کرنے لگا مگر ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ایمان سودمند نہیں ہوا کرتا۔ یہ بھی جب ایمان کو ظاہر کرنے لگا تو اس وقت عنان زندگی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔ اور کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ اس لئے کہا گیا کہ تو ساری عمر تو کفر اور سرکشی اور میری نافرمانیوں میں گذار چکا ہے اب تو ہم دنیا کو تیرے وجود اور جسم سے نصیحت دینگے اور تجھے رسوا کریں گے۔ جیسے کہ ارشاد ہے۔ فاخذہ اللہ نکال الاخرۃ والاولیٰ ان فی ذالک لعبرۃ لمن یخشیٰ اور فرعون کی عورت نے یہ کہا تھا قرۃ عین لی ولک لاتقتلوہ۔ یہ اس کا محض گمان اور خیال تھا اور خداوند کریم کی اس میں حکمت کارفرما تھی کہ اس حیلہ سے موسیٰ علیہ السلام اس ظالم کے ہاتھ سے نجات پائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی خلاصی کا یہ حیلہ آسیہ رضی اللہ

عنہا کو اللہ کی جانب سے ملہم تھا۔ اور فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کو پالینا کوئی ایسا نہیں تھا کہ اس سے ان کو کوئی دنیاوی فائدہ ہوتا بلکہ اس کے بارے میں بھی ارشاد ہے۔ فالتقطہ لیکون لھم عدوًّا وحزنًا۔ اور ظاہر بات یہ ہے کہ فرعون کو بوقت التقاط قطعًا اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ میرا دشمن ہے۔ لیکن خداوند کریم فرماتے ہیں۔ کہ انجام کار اور مآل کار ان کے التقاط کا نفس الامر میں یہ تھا کہ تاکہ موسیٰ علیہ السلام ان کے دشمن بنیں۔ نیز ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب میدان بدر میں تشریف لے گئے اور آپ کے مقابلہ میں ابوجہل آیا تو آپ نے فرمایا مات فرعون ھٰذہ الامۃ کہ اس امت کا فرعون مرگیا۔ اگر فرعون مسلمان اور پاک و طاہر ہوتا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ السلام ابوجہل کو فرعون سے تشبیہ کیوں دیتے۔ اور ظاہر ہے کہ ابوجہل لعین ازلی جہنمی ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ تشبیہ باعتبار علو اور استکبار کے ہے جو فرعون میں بحالت حیات پائی جاتی تھی۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ شریعت میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی کہ توبہ کے بعد اللہ یا اس کے رسول نے اس کے سابقہ کردار کی بناء پر کسی ظالم کو اس سے تشبیہ دی ہو اور خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت کے ابتدائی حالات میں متعدد روسائے قریش ایسے تھے جو فسق وفجور اور آپ کے ستانے میں مصروف رہے اس کے بعد جب دولت اسلام و ایمان سے مشرف ہوئے اور ایمان و اسلام پر ان کا خاتمہ ہوا تو شریعت نے ان کے سابقہ حالات کو مذمت اور تشنیع وغیرہ سے ہرگز ذکر نہیں فرمایا۔ اور فرعون کے بارے میں تو قرآن کریم میں کثرت سے مذمت وارد ہے۔ اور مشائخ میں سے کسی ایک نے بھی فرعون کو اسلام و ایمان کی طرف منسوب نہیں کیا۔ البتہ شیخ محی الدین ابن عربی نے فرعون کے مومن ہونے کی اپنی کتاب فصوص میں تصریح کی ہے۔ مگر وہ روایت فرعون کے ایمان بأس پر محمول کی جائے گی۔ اس لئے کہ شیخ نے اپنی مایۂ ناز کتاب فتوحات مکیہ میں اس کی مذمت کرتے ہوئے اس کی صاف تصریح فرمادی ہے کہ دوزخ کے کئی درجات ہیں اور ان درجات میں سے ایک درجہ فرعون اور ہامان جیسوں کا ہے۔ اور ان کی کتاب فصوص کی روایت کے بارے میں علمائے کرام نے ایک اور تاویل بھی فرمائی ہے۔ کہ اس روایت میں قرآنی آیت حتی اذا ادرکہ الموت الخ کی تحقیق ہے نہ بیان مذہب اور مذہب ان کا وہی ہے

جس کی تفصیل شرح وبسط کے ساتھ فتوحات میں موجود ہے۔ اور اگر فصوص میں واقعی انہوں نے اپنے مذہب کو بیان کیا ہے تو بڑی حیرت کی بات ہے۔ جو ان کے تغافل پر محمول کی جائے۔ اس لئے کہ وہ معصوم نہ تھے غیر انبیاء سے چوں کہ غلطی کا صدور رہو نا قرین قیاس ہے۔ اس لئے یوں کہا جائے کہ ابن عربی اس معاملہ میں سخت غلطی کے شکار ہو گئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائیں۔ اور ان جیسے بزرگوں کی تقلید و اتباع ضروری نہیں ہوتی بلکہ تقلید و اتباع تو اہل حل وعقد و اہل فتویٰ حضرات کی جاتی ہے۔ نیز ایسی غلطیوں کے ارتکاب سے ان لوگوں کی شان میں تنقیصی کلمات سے زبان کو روکا جائے اور معاملہ خدا کے سپرد کیا جائے۔ نیز شیخ فتوحات میں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مخلد فی النار نہیں ہیں اور کوئی آیت ان لوگوں کے مخلد فی النار ہونے پر موجود نہیں اور فرماتے ہیں کہ وصول نار مستلزم عذاب نہیں۔ یہ بھی ان سے زبردست غلطی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات موجود ہیں جو ان کے مخلد فی النار ہونے کی تصریح کرتی ہیں۔ و فی العذاب ھم خالدون اور سورت فرقان میں ہے ویخلد فیھا مھانا اور سورت الم تنزیل السجدہ میں ہے۔ وذوقوا عذاب الخلد اور سورت زخرف میں ہے۔ ان المجرمین فی عذاب جھنم خالدون۔ علاوہ ازیں فتوحات شیخ فرعون کے اشد کفر کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ ان متضاد اقوال کو دیکھ کر عقل عجیب کش مکش میں مبتلا ہوتی ہے۔ کہ ایسے بڑے بزرگ سے ان غیر ذمہ دارانہ باتوں کا صدور کیسے ہوا۔ آخر کار معاملہ خدا کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ کہ اللہ ہی جانتے ہیں شیخ کی ان باتوں کا مقصد اور مفہوم کیا ہے۔؟ شیخ ابن حجر مکی اپنی کتاب زواجر میں فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا۔ کے تحت علمائے امت کا اجماع فرعون کے کفر پر نقل کرتے ہیں۔ نیز بر تقدیر تنزل اگر ہم یہ مان لیں کہ فرعون اللہ پر ایمان رکھتا تھا تو مومن اور مسلمان ہونے کے لئے صرف اتنی بات تو کافی نہیں؟ جب تک کوئی اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس کے رسول کو رسول تسلیم نہیں کرے گا وہ ہرگز ہرگز مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ فرعون اپنی تمام عمر موسیٰ علیہ السلام سے مجادلات کرتا رہا پھر وہ کیسے مسلمان ہوسکتا ہے۔ اور بعض صوفیہ ایمان بأس کے صحیح ہونے کے قائل ہیں۔ اسی لئے وہ فرعون کی تکفیر سے کف لسانی کرتے ہیں مگر یہ سب

لوگ راہِ راست سے بہت دور ہیں۔ اور ان سے اس معاملہ میں غلطی ہوگئی ہے۔ البتہ اس غلطی پر ہم ان کی تنقیص و توہین کرنے سے کفِ لسانی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ کوئی نبی نہ تھے جو گناہوں سے معصوم ہوتے وہ ہم جیسے انسان تھے اس معاملہ میں قرآن و حدیث پر نظر نہ کی ہوگی اور ایک دوسرے کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے نقل کرتے رہے۔ لہٰذا ابن عربی ہوں یا دیگر صوفیائے کرام ان کی بات دلیل و حجت نہ قرار دی جائے ہمارے لئے دلیل و حجت صرف ادلۂ اربعہ ہیں۔ اور ان میں فرعون کے کفر کی تصریح و تشریح موجود ہے۔

یہ ترجمہ ہے ابن حجر کی کتاب زواجر کا۔ واللہ اعلم باالبواطن والسرائر والصلوٰۃ والسلام علےٰ محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین +

مکتوب نمبر ۳۰

اپنی بیماری کے وقت لکھا

وجود الفناء فی احدیۃ الذات بالغیبۃ عن جمیع الجہات

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ مدت بہت طویل اور لمبی گذر چکی ہے۔ مگر ابھی تک جلوہ محبوب کا نصیب نہ ہوسکا۔ اور اس سال تو محبوب کے امتحان و ابتلاء کا عجیب رنگ ہے۔ کہ میں اپنی بیماری و خواری میں سرافگندہ ہوں اور اس کی ہیبت اور سطوت سے نہ بیٹھنے کی سکت ہے اور نہ ہی اٹھنے کی طاقت۔ طبیعت کے سکون اور آرام سب کافور ہوچکے ہیں۔ اور مشکلات طبیعت سے خوگر ہو گئے ہیں۔ اے میرے اللہ ؟۔ آخر یہ حقیر و فقیر قوم عاد و ثمود سے تو نہیں جو اس طرح باد صرصر اور قہر و غضب سے عالم نیست کی راہ اختیار کرے۔ میں امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف تحیۃ) سے ہوں میں تو آپ کے فضل و رحمت پہ امید رکھے بیٹھا ہوں۔ اور آپ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل و رحمت کا وعدہ بھی ہے۔ پھر یہ گرفت اور سختی کیوں اور کس لئے ہے۔

نہیں نہیں میں غلطی کر گیا یہ تو سب محبوب کی محبت کے کرشمے ہیں۔ اگرچہ صورتاً سختی ہے مگر معنیً یہ سب آسانی ہی آسانی ہے۔ مقصود ان سختیوں سے تعرّف اور تربیت ہے یعنی لوگ اس بات کو جان لیں کہ ایک عالم ایسا بھی ہے۔ کہ اس جگہ سوائے عجز و انکساری کے چارہ نہیں۔ اس بات کی شرح بہت طویل ہے۔ سو اس کو بیان کرتا ہوں۔ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہیں۔ صفت[۱] جمالی۔ صفت[۲] جلالی۔ با لفاظ دیگر لطف کی صفت اور قہر کی صفت۔ ہر ایک کو ان دونوں میں سے کبھی ظاہر کرتا ہے۔ اور کبھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ کبھی لطف ظاہر کرتے ہیں۔ اور نعمت و راحت بخشتے ہیں۔ اور اس کے ضمن میں قہر کو پنہاں رکھتے ہیں۔ عامۂ مخلوق کی عموماً اور کفار کی خصوصاً یہی حالت ہے۔ اور کبھی قہر کو ظاہر کر کے بلا و محنت میں مبتلا کرتے ہیں۔ اور اس کے ضمن میں لطف و رحمت کو پنہاں رکھتے ہیں۔ اور یہ حالت ان لوگوں کی ہے جو اللہ کے دوست اور مقرب

ہیں۔ اللہ کے کارخانہ کا یونہی معاملہ چل رہا ہے کسی کو طاقت اس بات کی نہیں جو سوال کر سکے کہ فساق و کفار اور عامۂ مخلوق پر یوں الطاف کیوں اور خاص الخاص لوگوں پر یوں شدائد کیوں ؟۔ مقصود تو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت تب ہوتی ہے جبکہ انسان اپنی ذات کو پہچان لے کہ میں کیا ہوں۔ پھر انسان پر جو افتادیں اور نوازشیں ہوتی ہیں وہ دو قسم پر ہیں۔ اولاً اللہ کے بعض احکام بسا اوقات آدمی کی خواہش اور آرزو کے موافق ہوتے ہیں۔ ان کو عرف عام میں بخشش اور عطا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور دوئم وہ احکام جو انسانی خواہشات کے خلاف ہوتے ہیں ان کو لوگ منع اور خدا کی عدم رضا پر محمول کرتے ہیں۔ اور عطاء کے اندر خداوند کریم کے جود و کرم اور فضل و احسان کو مشہود گردانتے ہیں۔ اور منع و عدم رضا میں خدا کے قہر و جبر سطوت و عظمت۔ جلال و ہیبت کو دیکھتے ہیں لیکن اصل مقصود تو اللہ کی معرفت ہے جیسے کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اور وہ ان دونوں میں حاصل ہے۔ بلکہ خدا کی معرفت اس کے قہر و جبر میں اتم و مکمل ہوتی ہے۔ اور آدمی اپنی ہستی کو بھول کر خداوند کریم کی ہستی اور ذات و صفات پر نظر رکھتا ہے۔ اور اگر عطاء و بخشش ہو تو اس میں بھی یہی ہوتا ہے۔ غرضیکہ مآل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ بات دراصل یہ ہو رہی تھی کہ اللہ کا لطف کبھی ظاہراً نظر آتا ہے اور کبھی نہیں۔ لیکن لطف نہانی حقیقی محبوب کا حقیقی موصل اور نزدیک تر کرنے والا ہے۔ اور یہ اپنے خاص اور مقرب بندوں پر فرماتے ہیں۔ حقیقۃً عطاء اور بخشش یہی ہے۔ اور ظاہری لطف تو بیگانوں پر ڈالتے ہیں۔ وہ حقیقۃً لطف نہیں بلکہ ان لوگوں کو ڈھیل دینا اور استدراج ہے۔ اور جو بھی محبوب کی طرف سے ملے وہ عطاء و بخشش ہے۔ اور ہر دو صورتوں یعنی قہر و لطف میں اس کا شکر واجب ہے۔ جبکہ یہ مقام بلند ہو اور بشریت کے ہاتھ اس تک پہنچنے کی رسائی نہ رکھتے ہوں تو صبر کر کے خاموشی سے بیٹھ جانا چاہیئے اور دم ناراضگی کا نہ مارا جائے۔ جاننا چاہیئے کہ خداوند کریم دائماً اپنی تمام مخلوق پر لطف فرماتے رہتے ہیں اور اگر وہ محض قہر کرنے پر آجائیں تو کسی کو بچنے کی طاقت نہیں۔ خدا اپنے قہر محض سے بچائے۔ کائنات عالم کا وجود اور قیام خداوند کریم کے لطف و کرم پر دال ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی کسی مصلحت کی بناء پر کسی خاص وجہ سے کسی پر قہر فرماتے ہیں۔ کبھی درخت پھل دیتا ہے۔ تو کبھی اس

کے پتے تک گر جاتے ہیں۔ یہ لطف وکرم اور قہر وجبر کا امتزاج کسی خاص حکمت سے ہوتا ہے۔ اور اسی پر کارخانۂ عالم کا قیام ہے۔ خدا کا قہر اور کرم دائم اور لازم ہیں اور سب مخلوقات کو شامل ہیں۔ اس لئے بعض عارفوں نے کہا ہے۔ کہ دوزخیوں پر اللہ کا لطف ہوگا یعنی اگرچہ وہ عذاب میں مبتلا ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اس عذاب سے سخت عذاب بھی تو دے سکتے ہیں مگر اپنے لطف سے ان پر اس سے سخت عذاب کو مسلط نہیں فرماتے۔ لغۃً لطف رفق اور نرمی کو کہتے ہیں۔ اور اس کی ضد قہر و درشتی و سختی ہے۔ اور رحمت کی ضد غضب ہے۔ رحمت محل محبت و رضا پر آتی ہے تو تکلیف اٹھ جاتی ہے اس جگہ عذاب کیسے آسکتا ہے۔؟ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد۔ قل فلِمَ یعذ بکم۔ بذنوبکم اس کی دلیل ہے۔ اور لطف کرنا خدا پر لازم اور واجب نہیں وہ کبھی عدم رضا کی صورت میں بھی نرمی فرماتے ہیں۔ اور مادۂ غضب بھی موجود ہوتا ہے۔ اور اس کی رحمت دنیا میں عام ہے۔ اور آخرت میں اسکی رحمت خاص ہو کر محض اہل بہشت پر محدود رہے گی جیسے ارشاد ہے۔ ففی رحمۃ اللہ ھم فیھا خالدون یہ آیت مخالفت کرتی ہے ان لوگوں کی جو دوزخیوں کو بھی مرحوم کہتے ہیں۔ اور اللہ لطیف بعبادہٖ۔ عام ہے مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے۔ لیکن یہ رحمت خاص ہے۔ اللہ نے مومنین کے علاوہ اور کسی کو رحمت سے خطاب اور یاد نہیں فرمایا۔ اور جو لوگ رحمت کو بھی عام قرار دیتے ہیں ان کی دلیل رحمتی وسعت کل شئی ہے۔ مگر اس آیت میں حقیقی رحمت مراد ہی نہیں بلکہ نتیجۂ رحمت اور اس کے توابعات مراد ہیں۔ اس لئے کہ ایک دوسرے مقام میں ارشاد ہے۔ عذابی اصیب بہٖ من اشاء لیکن اس اختلاف کو اگر نظر عمیق سے دیکھا جائے تو صرف نزاع لفظی ہی نظر آتا ہے۔ مقصود تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف خفی اور جلی اپنے بندوں پر ہے۔ اور سررشتۂ مصلحت اس کے دست قدرت میں ہے۔ اس دنیا میں اس کی نعمت کا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ ہر ایک کو اس کی استعداد اور لیاقت کے موافق دربار خداوندی سے قسمت ملتی ہے۔ اگر کوئی عیش و راحت میں ہے تو یہ بھی اسی کا لطف ہے۔ اور اگر کوئی فقر و فاقہ کی افتادوں میں مبتلا ہے۔ تو یہ بھی اس کا لطف ہے جو اس کو اس کی لیاقت کے موافق دیدیا گیا ہے۔ اور اس کے اس ابتلا میں ہزاروں حکمتیں مضمر ہیں جس کو پردۂ حجاب میں رکھا گیا ہے۔ اور مآل کار یہ ابتلاء اس مبتلاء کے حق میں

مفید اور بہتر ہو گا ۔

صد ہزاراں طفل سر بریدہ اند　　تا کلیم اللہ صاحب دیدہ شد

جبکہ اس کے رحمت و کرم کے خوانِ بے کراں سے اس فقیر کو بھی اپنے نصیب اور قسمت کا نوالہ مل چکا ہے۔ تو بحکم۔ اما بنعمۃ ربک فحدث کے تحت اس کو بیان کرتا ہوں۔ جاننا چاہیئے کہ خداوند کریم کا قہر اور اس کے غضب کی صرصر صبر و سکون اور پائے استقلال کو اس طرح متزلزل کر دیتے ہیں۔ کہ اگر کسی کو مدت حیات معلوم ہو تو وہ جینے کی بجائے موت کو ترجیح دے اور اگر خداوند کریم کا لطف دستگیری نہ کرے اور قوت نہ بخشے تو انسان پارہ پارہ اور دست بریدہ ہو جائے۔ اور اگر اس کے انوار کا وقوع ظہور پذیر نہ ہو اور ظلمات سے طبیعت کا دور کرنا نہ ہو تو مصائب میں عدم وقوع اور آلام سے نجات غیر ممکن اور محال ہو جائے۔ الحمد للہ ابتدائی حالات میں نورانیت جمال محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد سے روح کی غذاء دیدار محمدی تھا جس کی کیفیت یہ تھی کہ دنیا اور کائنات نظروں میں ہیچ تھی اور قوت جسمانی تازہ ہو گئی تھی۔ اور میری غذا فقر و فاقہ کے سوا اور کچھ نہ تھی اور آخر کار خداوند کریم کی دستگیری سے سب کچھ کافور اور غائب ہو گیا۔ اور اللہ نے ایسی حالت سے مشرف فرمایا جو بیان کرنے سے خارج ہے اور نہ میں اس کے بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ اس کی ذات ہر ایک سے مخفی ہے۔ اور جو مکشوف اور عالم ظہور میں لوگوں کو نظر آتا ہے۔ وہ صفات باری تعالیٰ ہیں۔ نہ خدا کی حقیقت اور عین۔ اس کی ذات وراء الوریٰ اور جمیع ادراکات سے منزہ اور جو کچھ دل پر وارد ہو ان سب چیزوں سے پاک ہے۔ خدا کی شناسائی تو صرف اسماء و افعال اور صفات سے ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی حقیقت بھی کسی کو معلوم نہیں۔ اگر اس جگہ کوئی سوال کرے کہ جب اللہ کی ذات ادراک اور رویت سے وراء الوریٰ ہے۔ اور کسی کی آنکھوں میں یہ طاقت نہیں کہ وہ خداوند کریم کی ذات کا دیدار کر سکے تو یہ آنکھیں عالم آخرت میں اللہ کو کیسے اور کیوں دیکھیں گی۔ جواب اس کا یہ ہے۔ کہ آخرت پر دنیا کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اس لئے کہ اس جہان میں آنکھوں پر ایک حجاب اور ظلماتی پردہ ہے۔ اور آنکھوں کی قوت مدرکہ جمیع جہات سے محبوس اور محصور ہے۔ اور عالم آخرت

میں اس کے سب پردوں اور جمیع ظلمات کا ارتفاع ہو جائے گا جس کی وجہ سے آنکھوں میں ایک ایسی قوت نمایاں ہوگی جس کی وجہ سے وہ خدا کی ذات کا دیدار کر سکیں گی۔ اور یہ جہاں اس کی قوت نہیں رکھتا۔

وصل:۔ اے قلم رک جا تو اپنی جولانی میں کہاں سے کہاں چلی گئی۔ تو اپنے رخ کو اپنے مقصد کی طرف مبذول کر کیا تجھے خبر نہیں کہ نقارۂ کوچ بجنے والا ہے جو نقارۂ غازی سے سخت ہے۔ اپنی زاد راہ اور توشۂ سفر کی تیاری کر۔ وہاں تو سوائے نیکیوں اور اعمال صالحہ کے اور کچھ کام آنے والا نہیں۔ یہ چند روزہ کی مہلت سفر کمانے اور آخرت کے لئے جمع کرنے کو دی گئی ہے۔ اس کو اگر غفلت میں گذار دیا تو سوائے حرمان کے اور کچھ نصیب نہ ہوگا۔ یہ عمر مفت کی ہاتھ لگی ہے۔ اس کی قدر کی جائے اور اپنے تمام معاملات کو تقدیر الٰہی کے سپرد کیا جائے۔ اس لئے کہ جفّ القلم بما ھو کائن کہ قلم ہر ہونے والی چیز کو لکھ کر خشک ہو چکی ہے۔ ہوگا وہی جو منظور خدا ہوگا۔ تجھے اپنی ہمت اور ارادہ کا ثواب ملے گا۔ الحمد للہ علیٰ کل حال واعوذ باللہ من حال اھل النار

وصلی اللہ علےٰ رسولہ محمد والہٖ واصحابہٖ اجمعین

مکتوب نمبر ۱۳۱

اپنی بیماری کے وقت تحریر فرمایا

سلوک طریق التعلیم ببیان حقیقۃ الرضاء والتسلیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ خدا تعالیٰ کی نعمتیں بندوں پر اس قدر اور اتنی ہیں کہ ان کو شمار کرنا کسی کے بس میں نہیں اور ان سب نعمتوں میں سے محبوب اور مرغوب نعمت عافیت اور تندرستی ہے۔ اس لئے کہ جب انسان تندرست ہوگا تو اس سے خیر اور بھلائی کا بھی صدور ہوگا غرضیکہ جمع افعال و اقوال متعلق ہیں تندرستی سے یہ علیحدہ بات ہے کہ انسان اپنے اختیار سے پھر اس تندرستی کو غلط طریقہ پر استعمال کر کے عذاب کا مستحق بنتا ہے۔ دنیا کے اندر جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب تندرستی ہی پر موقوف ہے۔ لیکن ایک جماعت دنیا میں ایسی بھی ہے کہ ان کے نزدیک مرض و صحت۔ مصیبت و راحت۔ نیست و ہست برابر ہیں۔ اور عافیت و تندرستی کے معنیٰ ان کے نزدیک یہ ہیں۔ کہ انسان کو جو اللہ سے تعلق ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے قلب سکون میں رہتا ہے اس کا نام عافیت اور تندرستی ہے جس چیز سے دل خدا کے ساتھ آرام پائے اس کو عافیت کہتے ہیں۔ اس میں بلا و نعمت سب برابر ہیں۔ اگر دل بلا اور مصیبت سے راحت و سکون پائے تو یہ عافیت ہے۔ اور اگر کسی کا دل عیش و عشرت سے آرام پکڑے تو اس کی یہی عافیت ہے۔ غرضیکہ عافیت کا مفہوم ظاہری جسم کی توانائی اور اس کے حالات کا صحیح ہونا نہیں بلکہ عافیت سے مراد سکون قلب ہے وہ خواہ کسی چیز سے حاصل ہو۔ اور اس گروہ کے نزدیک مقصود اصلی وصل باری تعالیٰ ہے۔ اور باقی سب ہیچ اور کچھ نہیں خدا کا وصل ہو تو بھوک۔ اور فقر و فاقہ مصائب و آلام میں انہیں راحت محسوس ہوتی ہے۔

وصل:۔ مصیبتوں پر صبر کرنا۔ اور قضاء پر راضی رہنا دو مقام ہیں۔ اور مسلمانوں پر ان دونوں کی پابندی واجب ہے۔ اور فرق صبر اور رضا میں یہ ہے۔ کہ صبر میں تلخی

اور ترشی ہے۔ کہ طالب پر مصائب اور آلام آتے ہیں ان پر تحمل کرکے بڑی شدت اور سختی سے اپنے اوپر قابو پاتا ہے۔ اور جب صبر کا خوگر ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت صبر اس کی عادت بن جاتا ہے۔ اور بنسبت پہلے کے اب اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنی پہلی حالت سے ترقی کرکے رضا میں داخل ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ ابتدائی تلخیوں کے تحمل کا نام صبر ہے۔ اور جب عادت بن جائے تو یہی صبر رضا ہے۔

اور رضا تو سکون و آرام کا نام ہے۔ اس کے راستہ میں کوئی تکلیف نہیں بعضے بزرگوں کا کہنا ہے۔ کہ جب عارف مقام رضا تک پہنچ جاتا ہے۔ تو وہ مصیبتوں میں حلاوت اور شیرینی محسوس کرتا ہے۔ اور مقام رضا بہت بلند و بالاتر مقام ہے۔ سلوک کے اندر اس سے بالاتر اور بلند اور کوئی مقام نہیں اس جگہ بزرگوں نے ایک نکتہ بیان کیا ہے۔ کہ رضا قلب کے احوال میں سے ہے۔ اگر قلب برقرار ہے۔ اور اس کو سکون حاصل ہے۔ تو اس سے رضا حاصل ہو۔ اگرچہ اس کا جسم اور نفس اضطراب میں مبتلا ہو۔ اور اس اضطراب کا دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ بھی تو محبوب کا فعل ہے۔ اور محبوب کا فعل ہر حالت میں محبوب ہوتا ہے۔ اس سے راحت و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ نہ کہ اضطرار جیسے کہ کسی کو اگر محبوب تلوار مارے تو اگرچہ تلوار کے اثر سے جسم متاثر ہوگا مگر اس کی تکلیف دل پر اثر انداز نہ ہوگی اور محب کو محبوب کے اس فعل سے راحت محسوس ہوگی اس لئے کہ یہ فعل باعث عنایت اور التفات ہے۔ اور مثل مشہور ہے۔ کل شئی من الملیح ملیح ۔ کہ محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے۔ ایک حالت تو سکر و استغراق کی ہے۔ جو مست اور مجذوب قسم کے بزرگوں پر طاری ہوتی ہے۔ اور صبر رضا اور اس کی امثال یہ مقام ہوشیاروں اور بیدار مغز بزرگوں کا ہے۔ اور ان لوگوں کو اہل تمکین کہتے ہیں۔ رہے مجانین اور مجاذیب ان کو یہ کمالات نصیب نہیں ہوتے۔ اسی لئے عقلاء بزرگوں کا مقام مجذوب بزرگوں سے بالاتر اور بلند ہے۔ اور شیخ عبد القادر جیلانی رح کا ارشاد بھی یہی ہے۔ عقلمند بزرگ مجذوب سے بہتر ہیں۔ اور ان بزرگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ کہ ان کے تمام قوی اور جوارح پر خداوند کریم کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے ان کے سامنے مال و اہل و عیال خدا کے مقابلہ میں ہیچ ہوتے ہیں۔ اور نبی علیہ السلام کے ارشاد سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں۔ اللھم اجعل

حبك احب الی من نفسی و اهلی و مالی و من الماء البارد الی العطشان
کہ اے اللہ اپنی محبت میں مجھے یوں محو کر دے کہ میرے نزدیک تیری محبت
میرے نفس میرے اہل و مال اور شیریں پانی سے زیادہ ہو جائے اس سے
معلوم ہوا کہ محبت یہاں تک پہنچ جائے جیسے کہ سخت پیاسے کے سامنے شیریں
پانی ہو اس وقت وہ اس کے پینے میں غیر مختار رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کے
اندر اللہ کی محبت سرایت کر جائے۔ پھر اس غلبۂ محبت کی وجہ سے جب لوگ بے اختیار
ہو کر خلاف شرع کرتے ہیں تو ان کو شرعاً ماخوذ قرار نہیں دیا جائے گا مگر یہ حالت
بھی مجذوب قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اور اہل تمکین اور عقلاء قسم کے بزرگ
ہر معاملہ میں منتظم ہوتے ہیں۔ وہ ایسی صورت میں بھی کوئی خلاف شریعت
فعل نہیں کرتے وہ تو ہر حالت میں شریعت کی پابندی اور اس پر مضبوطی سے
قائم رہنے کو مقدم سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم باوجود اس
بات کے کہ سب مدارج پر فائز تھے آپ سے کوئی بات خلاف شرع سرزد نہ
ہوئی۔ ان بزرگوں میں سے جس کو نبی علیہ السلام سے جتنی نسبت ہوگی اتنا ہی وہ
باعتبار افعال کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہت رکھے گا۔ اور اس
میں اسی قدر نبی علیہ السلام کا پرتو و عکس موجود ہوگا۔ بات کہیں اور نکل گئی عرض
تو اپنی ناتوانی اور وحشت و حیرانی کر رہا تھا۔

باوجود ضعف اور پیری کے عجیب قسم کے امراض میں مبتلا ہوں۔ اور
نقاہت اتنی بڑھ گئی ہے۔ کہ قریب ہے کہ سکون قلب اور فراغت بال ختم ہو جائے
اور فرستادۂ خداوندی پیام اجل لے آئے۔ اس حقیر کے ضعف کی اصل وجہ یہ ہے
کہ تمام عمر مشقت اور ریاضت میں گذری ہے۔ لیکن اپنی ہر حالت پر خدا کا شکر اور
اسی کی تعریف ہے۔ اس کے دربار میں بجز صبر و رضا کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اب
تو صرف کوچ کرنے کی ندا اور آواز کا منتظر ہوں۔ بحمد اللہ منادی کی نداء کے
سلسلہ میں من کل الوجوہ ہوشیار اور ہمہ تن تیار ہوں۔ مگر انسان ہونے کی
وجہ سے تغافل اور تکاسل کا بھی شدید خطرہ ہے۔ ہماری مثال تو اس لشکر کی سی ہے
جن کو سلطان و حاکم کی جانب سے حکم کوچ ملتا ہے۔ وہ اپنے سامان اور زادِ راہ کو اکٹھا

کر کے تیار ہو جاتے ہیں کہ فوراً حکم ملا کہ ابھی ہمارے دوسرے حکم تک انتظار کیا جائے۔ اس حکم کے ملتے ہی وہ غافل ہو گئے۔ کوئی اپنی خوش گپیوں میں مصروف ہے تو کوئی خوابِ غفلت میں محو۔ اچانک ان کو دوسرا حکم ملا کہ فوراً کوچ کرو مگر وہ تو اپنی غفلت میں مصروف ہیں۔ اس لئے کچھ نہ کر پائے۔ یہی مثال ہماری ہے کہ باوجود اس بات کو جانتے ہوئے کہ اس عالم سے کوچ کر کے ایک دوسرے عالم میں جانا ہے، مگر اس لشکر کی مانند کوئی خواب غفلت میں محو ہے تو کوئی خوش گپیوں میں۔ جب اچانک کوچ کا پیام ملے گا تو محض خالی ہاتھ ہوں گے۔ دل اس دنیائے فانی میں نہ لگایا جائے۔ اس لئے کہ پھر کس منہ سے آخرت میں جانا ہوگا۔ دل تو اس عالم سے لگایا جائے جس کے اندر ہمیشہ عیش اور عیش ذوق اور ذوق سرور اور سرور موجود ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ عاقبت بخیر باد ⁂

مکتوب نمبر ۳۲

اپنی علالت کے وقت تحریر فرمایا

مشاھدۃ الابرار بین التجلی والاستار

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس زمانہ کے اندر نفع بخش چیز کتب بینی ہے۔ جو نصائح اور تہذیب جیسے عمدہ موضوعات پر تحریر کی گئی ہوں۔ جن نفوس اور افراد کے اندر استعداد اور لیاقت ہے۔ ان کے ایمان کو تر و تازہ کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ ایمان کا ایک ہی حالت پر برقرار رہنا محال ہے۔ کبھی اس میں تازگی اور گاہے مردنی چھا جاتی ہے۔ اسی لئے ارشاد جدّدوا ایمانکم بذکر لا الٰہ الا اللہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کہا کرتے تھے کہ ہم باہم دیگرے بیٹھ کر لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کر کے ایمان کو تر و تازہ کیا کریں۔ اگرچہ ایمان اپنی جگہ قائم اور ثابت ہے۔ اور اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہلتا۔ لیکن اللہ کے ذکر اور اس کی توحید سے اس کے اندر ایک تر و تازگی سی پیدا ہوتی ہے۔ اور اندرون سے بیرون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور آتش شوق میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

پھر اس کے اندر اختلاف ہے کہ عارف کو خداوند کریم کی ذات کا شہود دائمی ہے یا عارضی بعضے کہتے ہیں کہ دائمی اور ابدی ہے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ عارضی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں ؎

حافظ دوام وصل میسر نمی شود　　شاہاں کم التفات بحال گدا کنند

(کہ اے حافظ وصل باری تعالیٰ ہمیشہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ بادشاہ گداگروں پر کم التفات کیا کرتے ہیں) اور ان کا کہنا ہے کہ مشاہدۃ الابرار بین التجلی والاستار اسی کو کہتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ عارفوں کو وصل دائمی میسر ہوتا ہے۔ اور اسی کی طرف نبی علیہ السلام کے قول میں اشارہ ہے لی مع اللہ وقتٌ دائمٌ مستمرٌ۔ لیکن بعض کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حال پر دوسروں کو قیاس کرنا مناسب

نہیں، خدا کو نبی علیہ السلام کی مانند اور کوئی نہیں پہچانتا۔ وہ تو خلوت میں جانتے ہیں اور بقیہ تمام مخلوق باہر سے جانتی ہے کہ وہ خدا ہیں۔ اور بندہ طالب ہے۔ اور مطلوب محب ہے۔ اور محبوب شاہد ہے اور مشہود قاصد ہے۔ مقصود ہر ایک کا خدا ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لیکن طالب و مطلوب۔ محب اور محبوب کے عنوانات میں یقینی طور پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ طالب کون اور مطلوب کون یا محب کون اور محبوب کون۔ لیکن دوئی کو ترک کیا جائے قصہ کوتاہ یہ ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اور ید اللہ فوق ایدیھم اس سے زیادہ کیا کہوں۔ کفر حقیقی سینہ کے اندر اس بیان کے اس طرح مضمر ہے کہ اگر اس کو بیان کروں تو ہزاروں لوگوں کے ایمانوں میں تردد اور شک پیدا ہو جائے اور اس کے اسرار کو پردہ میں رکھنا مناسب ہے۔ اگر کہوں تو وہی بات جو مفید ہو اور وہ یہی ہے کہ جمال محمدی کو قبلۂ محبت قرار دیا جائے اور ظاہر و باطن کو اس طرح متوجہ کیا جائے کہ تیری ذات اس کی ذات میں اور محبت میں فانی ہو جائے۔ اور اسکی ذات کے علاوہ تیرا اور کوئی مطلوب و مقصود نہ رہے۔ اور جس طرح آپ نے ارشاد اور احکام صادر فرمائے ہیں ان کی پیروی اور اتباع کی جائے۔ اور دین حق کے علاوہ جو چیز ہو اس سے اجتناب اور پرہیز کیا جائے۔

سچی بات تو وہی ہے جس کو دین اسلام نے پیش کیا اور راستہ سیدھا وہی ہے جس کی نشاندہی اسلام نے کی۔ اس کے علاوہ باقی سب راستے ٹیڑھے ہیں۔ جن پر چلنے والے منزل مقصود تک رسائی نہیں پاتے۔ اگر عمل میں کوتاہی ہو تو اعتقاد کمزور نہ ہونا چاہیئے اور خداوند کریم سے ہمیشہ امید و بیم رکھ۔ نہ تو بالکل بے امید ہونا چاہیئے۔ اور نہ ہی بالکل نڈر اور بے خوف۔ بلکہ ایمان تو نام ہے خوف و رجاء کا اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ یہ ایک باریک بات ہے اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

خلاصۂ احوال یہ ہے۔ ہر حال میں اللہ کی ذات کا شکر ہے۔ والحمد للہ علی کل حال و اعوذ باللہ من حال اھل النار لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ والعاقبۃ بالخیر ۞

مکتوب نمبر ۳۳

بنام نواب مرتضیٰ خاںؒ صاحب

التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علےٰ الخلق اللہ

لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ احکام خداوندی کی تعظیم اور مخلوق خدا پر شفقت مسلمان کے پرواز کرنے کے یہ دو بازو ہیں ان دونوں بازوؤں کو مستحکم اور ان دونوں پر مضبوطی سے عمل کرنے کے بغیر مقام قرب اور رضائے مولیٰ نصیب نہیں ہوتی۔ سالک لوگ جو خدا کے مقرب بنتے ہیں۔ وہ بھی نتیجہ ان دونوں بازوؤں پر عمل کی قوت کا ہے۔ جتنا کوئی ان پر عمل پیرا ہوگا اتنا ہی اس کو قرب و وصل نصیب ہوگا۔ اگر عمل زیادہ تو قرب و وصل بھی زیادہ اگر عمل کمزور تو قرب و وصل بھی ناقص۔

ہم نے ان دونوں عملوں کو بازوؤں سے اس لئے تشبیہ دی ہے۔ کہ سالک لوگ ان پر عمل کرنے کے بعد ایک پرندہ کی مانند ہو جاتے ہیں اور ان کو پر لگ جاتے ہیں جس سے وہ سریع الاثر پرواز کر کے خداوند کریم تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اور ایک لمحہ اور ساعت میں اتنی مسافت طے کر لیتے ہیں کہ دوسروں کو اس کے طے کرنے میں ایک طویل زمانہ صرف کرنا پڑتا ہے ؎

مردانِ حق بہ بالِ محبت چو بر پرند　　　اول قدم بکنگرۂ عرش جاکنند

(یعنی اللہ والے محبت کے دل سے جب پرواز کرتے ہیں۔ تو پہلے ہی قدم سے عرش معلیٰ پر پہنچ جایا کرتے ہیں) پھر صفت اول (تعظیم لامر اللہ) کی رعایت بہت ضروری امر ہے۔ یہ بازو اور پر مثل دائیں بازو کی ہے۔ یا مثل دائیں ہاتھ کی ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بہت قوت ملتی ہے۔ بلکہ اسی پر سب امور کا دارومدار ہے۔ اگر یہ نہیں تو سب مجاہدے اور ریاضتیں رائیگاں اور برباد ہیں۔ اگرچہ شفقت علےٰ خلق اللہ بھی بہت بالا مقام رکھتا ہے اور اس سے بھی خداوند کریم کی رضا اور قرب حاصل

ہوتا ہے۔ مگر یہ امر اور باز و مثل امر اول کی نہیں۔ امر اول پر تو دین و ملت کا دار مدار ہے۔ اور کوئی چیز اور کوئی کام اس کے علاوہ باعث سرخروئی نہیں۔ اور یہ نام ہے شریعت کے امر و نہی کے امتثال کا کہ جہاں شریعت نے حکم دیا کہ اس کام کو کرنا ہے تو اسے کیا جائے اور جس سے منع کر دیا اس سے اجتناب اختیار کیا جائے اس اعتبار سے اسلام کی بنا کے دو رکن ہوئے۔ اول اوامر پہ امتثال۔ دوئم نواہی سے اجتناب۔ پھر ممنوعہ اشیاء سے باز رہنے کو صوفیائے کرام تصوف میں اہم اور ادخل قرار دیتے ہیں۔ اگر نواہی سے اجتناب نہ کیا جائے تو سلوک اور تصوف کے میدان میں اترنا اور قدم رکھنا بیکار ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کہ ایک حکیم مریض کو کہے کہ تو فلاں فلاں چیز کو استعمال نہیں کر سکتا اگر ان چیزوں کے استعمال کرنے سے رک جائے اور حکیم کے فرمان کے مطابق پرہیز کرے تو بہت جلد شفا پائے اور اگر بد پرہیزی میں مبتلا رہا اور حکیم کے حکم کی برابر خلاف ورزی کرتا رہا تو سب دوائیں بے سود ثابت ہونگی۔ اور کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوگا۔

اسی طرح تصوف کے میدان میں نواہی سے اجتناب امر لابدی ہے۔ اگر پرہیز کرتا رہا تو امید ترقی ہے ورنہ ہزار ہا مجاہدے اور ریاضتیں بیکار ہوں گی اور ان سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ یہ ریاضتیں اور مجاہدے فریب شیطانی ہوں گے جس سے سوائے غرور و نخوت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ کے اوامر کی تعظیم منحصر ہے۔ امتثال اوامر و نواہی میں یعنی اللہ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو کیا جائے اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔ اور جو لوگ اللہ کے مقرب اور مقبول ہیں اور شریعت کی ترویج میں لیل و نہار مصروف و مشغول ہیں ان کی عظمت قدر کا خیال رکھتے ہوئے اہل بدعت کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ بلکہ ان کو دشمن قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ وہ نبی علیہ السلام کے دشمن ہیں اور شریعت کی ترویج کرنے والے اور متبع سنت لوگ ان کا احترام کیا جائے اس لئے کہ وہ نبی علیہ السلام کے دوست ہیں اور مشہور ہے کہ دوست کا دوست، دوست ہوتا ہے اور دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے۔ اس پر عمل کرنے کا نام اسلام اور مسلمانی ہے۔ اور باقی دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور محرمات و غیر مشروع اشیاء میں نیت کو دخل نہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کو بُرا نہیں جاننا چاہیئے کیا خبر کہ اس کی نیت کیا تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی نیت نیک ہو مگر ان لوگوں کو خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ کسی پر نیک و بد کا حکم لگانا تو شریعت پر موقوف ہے جس کو کرنے کا حکم شریعت نے دیا اس کا کرنے والا نیک ہے۔ اور جس سے شریعت نے منع کیا اس ممنوع فعل کو کرنے والا بُرا ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے۔ کہ نیکی وہ ہے جس کو شریعت نیکی قرار دے۔ اور بُرائی وہ ہے جس کو شریعت بُرا کہے۔ اس کے اندر عقل کو دخل نہیں ہے۔ اس مقام پر اگر کوئی اعتراض کرے کہ نیکی اور بدی کا توقف شریعت پر نہیں بلکہ یہ ہر دونوں عقلاً معلوم ہوسکتی ہیں۔ مثلاً۔ عدل۔ جود۔ سخاوت۔ تلقین اچھے کام ہیں اور یہ عقل سے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح ظلم ستم۔ چوری۔ زنا۔ وغیرہ کو بھی عقل بُرا قرار دیتی ہے۔ لہٰذا ان کا توقف شریعت پر اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اولاً اس بات کو سمجھ لیا جائے کہ نیکی اور بدی سے مراد کیا ہے۔ اس کے بعد واضح ہو جائے گا کہ نیکی اور بدی کا توقف شریعت پر ہے نہ کہ عقل پر۔ نیکی اور بدی دو طرح کی ہوتی ہے نیکی ایک تو وہ ہے جس کو کرنے سے آدمی لوگوں کی مدح اور ثناء کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اس فعل سے اس کو یا اور لوگوں کو فائدہ ہوا ہو اور برائی وہ ہے جس کے کرنے سے کسی کو نقصان پہنچا ہو اور وہ شخص لوگوں کی نظروں میں مخدوش و مذموم اور قابل ملامت شمار ہوتا ہو۔ اس قسم کی نیکی اور بُرائی کا توقف عقلاء اور حکماء کی عقول پر موقوف ہے۔

لیکن جس نیکی اور بدی سے ہم محبت کر رہے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ نیکی وہ ہے جس کے کرنے والے کو آخرت میں ثواب اور برائی وہ ہے جس کے مرتکب کو آخرت میں عقاب و عذاب ملے۔ اس نیکی اور بُرائی کی معرفت شریعت کے بغیر نہیں ہوسکتی اور اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ جیسے رمضان میں کھانا کھانے اور پانی پینے کو عقل جائز رکھتی ہے مگر شرعاً پانی پینے کھانا کھانے سے رک جانے کا نام نیکی اور اس کے خلاف کا نام برائی ہے اسی طرح عید کے کھانے پینے سے رکنا شرعاً جائز نہیں۔ غرضیکہ یہ سب امور ایسے ہیں جن کی معرفت صرف شریعت ہی سے ہوتی ہے عقل ان کے نیک اور بُرے ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتی۔ اس مقام پر ایک اور نکتہ سمجھ میں آیا جس کو بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ سب کمالات اور حسنات کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک نیت صحیح۔

دوئم عمل صالح۔ اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں تو بہت مفید ہوں۔ اور آدمی کا اسلام اور مسلمانی کمال وارتقاء تک پہنچ جائے۔ اور نیت صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو کام کرے وہ محض خدا کی رضامندی اور آخرت میں ثواب کی امید کے لئے کرے۔ اور یہ بات اکثر طور پر درویشوں اور فقیر منش قسم کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ حتی کہ وہ لوگ جو ملنگ اور آتش پرست ہیں۔ جو دنیا ہی میں عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور بحکم حدیث نبوی ؐ لعن اللہ الناظر والمنظور کے تحت ملعون ہیں۔ اور اعتقاد فاسد رکھتے ہیں۔ لیکن وہ نیت درست رکھتے ہیں۔ اور عمل صحیح وہ ہے۔ جو اللہ کی مرضی کے موافق اور شریعت و دین کے ارشاد کے تابع ہو۔ وہ مجاہدے اور ریاضتیں جو حکم شریعت کے موافق ہوں اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اور سود مند ثابت ہوتے ہیں۔ شاید یہاں آپ اس خلجان میں مبتلا ہوں کہ مجاہدہ اور ریاضت کیا چیز ہے۔ سو اس کو بھی بیان کرتا ہوں کہ مجاہدہ اور ریاضت کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے نفس کو زبردستی اور سختی سے اللہ کے احکام کا فرمانبردار بنا دینا۔ اور نیت صحیح بغیر عمل صحیح کے کارگر اور سودمند نہیں ہوتی۔ جیسے کہ عمل صالح بغیر نیت صالح کے قبول نہیں بلکہ مردود ہے۔ غرضیکہ عمل اور نیت دونوں کے اخلاص کا مجموعہ سود مند اور کارگر ہے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک میں خرابی ہوئی تو دونوں بیکار؟

ہمارے اوپر گذرے ہوئے بیان کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مجاہدہ اور ریاضت اگر شریعت کے مطابق نہ ہو تو بے اثر ہے یعنی مجاہدے اور ریاضت سے جو نور ایمان اور آخرت کا ثواب وغیرہ وغیرہ امور مرتب ہوتے ہیں۔ خلاف شرع مجاہدہ سے نہیں ہوں گے۔ جیسے کہ بعض جوگی اور اہل کہانت لوگ ہیں کہ وہ مجاہدات کرتے ہیں۔ وہ سب بے سود ہیں اس لئے کہ موافق شرع شریف نہیں۔ البتہ ان سے بعض خوارق عادات ظاہر ہوتی رہتی ہیں جو نیک اور بزرگ ہونے کی دلیل نہیں۔ ان لوگوں کی تعظیم اور تکریم نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ لوگ مسلمانی راستہ سے پھرے ہوئے ہیں۔

اور جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اس پر مسلمانی کو اپنانا اور اس پر عمل کرنا لازمی ہے۔ اور جو اسلام کے راستہ پر چلتا ہے اس کے اندر اگر ہزار عیب بھی ہوں تو بھی چشم پوشی سے کام لیا جائے۔ اور اس کی عزت و احترام کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اس لئے کہ

اس کی عزت حقیقت میں اسلام کی عزت کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ ہر کلمہ گو قابل احترام اور تعظیم ہے۔ اگرچہ وہ ہزار ہا گناہوں کی آلودگیوں میں ملوث ہو۔ اس لئے کہ اس کے ایمان کی نسبت درست ہے جو ایک دن گناہوں پر غالب آئے گی۔ اور سب گناہ ترک ہو جائینگے یا معافی مانگنے سے یا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کرنے سے۔ اور نبی علیہ السلام کی ذات سے ضرور دوستی رکھی جائے۔ اس لئے کہ کریم لوگ دوستی اور آشنائی کا ضرور خیال رکھتے ہیں۔ اور ایمان بہت بڑی دولت ہے اس کو حقیر نہ سمجھا جائے قطب الوقت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایمان کا اثر ظاہراً نظر آئے تو وہ سب گناہوں کو چھپا دے۔ اور انہیں کا ارشاد ہے کہ مسلمان کا اکرام کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ وہ عاصی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس کو نیکی کے اپنانے اور برائی کے چھوڑ دینے کا امر کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے۔ اور فاسقوں کی صحبت اور مجلس سے اجتناب اختیار کیا جائے۔ لیکن تکبر کی نیت سے محض اپنے کو بچانے کی خاطر یہ ہے ایمان کی حقیقت اور اور اصل۔ اور باقی سب فرع۔ اور اگر نور ایمان، نور اطاعت کے ساتھ جمع ہو جائے تو وہ نورٌ علیٰ نور یھدی اللہ لنورہٖ من یشاء۔

کلام بہت دور و دراز نکل گئی آخر میں اسی شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

بس کنم مرزیرکاں را ایں بس است — بانگ دو کردم اگر در دہ کس است

اللہ تعالیٰ سب لوگوں کے دنیا اور آخرت کے سب نیک ارادے پورے فرمائے۔ اور ہر مصیبت سے محفوظ رکھے کیوں کہ اس کی ذات تو ہر چیز پر قدرت تامہ رکھتی ہے۔ وصلے اللہ علے محمد والہٖ واصحابہٖ اجمعین ؛

والعاقبۃ بالخیر

مکتوب نمبر ۴۳

درباب اللہ بندہ

ھدایۃ الانام الی التمسک بالشرائع والاحکام

لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل (یعنی اللہ تعالیٰ حق بات فرماتے ہیں اور وہی راستہ دکھاتے ہیں) مقصد تک پہنچنے کے لئے دو چیزوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ انکے بغیر منزل مقصود تک رسائی نہیں ہوسکتی اول راستہ کی پہچان۔ دوسرا اس راستہ پر چلنا اور چلنے کا طریقہ معلوم ہونا۔ سلوک کے راستہ پر چلنے والے کے لئے بھی ان دونوں چیزوں کو جاننا ضروری ہے۔ اور راہِ سلوک تو ایک کھلا اور واضح راستہ ہے۔ اور حقیقت میں سلوک تو ایک اور منزل و مقصود کے راستہ پر چلنے کی روش اور طریقہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ یہ راستہ سیدھا ہے یا ٹیڑھا۔ اور اس کے راستہ میں آفات ہیں یا نہیں اور وہ راستہ بنصِ قرآن عبادت ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ان ربی وربکم فاعبدوہ ھٰذا صراطٌ مستقیم۔ اور عبادت کے اقسام بے شمار ہیں اور ہر ایک قسم منزل مقصود تک پہنچانے والی ہے۔ اگر کوئی شخص ان اقسام کے علاوہ کسی اور عبادت پر عمل کرے گا تو وہ گمراہی اور الحاد کے راستہ پر چلنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اور اس عبادت کی روش و طریقہ نبی علیہ السلام نے بیان فرمایا جس پر ہزارہا لوگ عمل کرکے خدا رسیدہ بن گئے۔ اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ سب گمراہی و ضلالت اور محل خوف وخطر ہے ؎

کسانے کہ زیں راہ برگشتہ اند ۔۔۔ برفتند وبسیار سرگشتہ اند

(یعنی جو لوگ اس راستہ سے پھرے ہوئے ہیں۔ وہ دوسرے راستوں پر چل کر بہت حیران و پریشان گھوم رہے ہیں) سالک لوگوں کی آفت اس راستہ سے ہٹ جانے میں ہے۔ جیسے کہ آجکل کے جاہل صوفی شریعت کے راستہ سے پھرے ہوئے بہت سے مخترعہ اور مبتدعہ راستوں کو اختیار کرکے عامل علی الشریعۃ کے بایں الفاظ

مذاق اڑاتے ہیں۔ کہ یہ نماز روزہ تو عورتوں کا کام ہے۔ اور مردوں کے کام اس کے علاوہ
ہیں جو ہم کرتے ہیں۔ یہ شریعت کے کھلے دشمن ہیں جن کو معلوم نہیں کہ اس نماز و روزہ اور
شریعت کی متعینہ عبادات کے فوائد اور نتائج کیا ہیں۔ اور یہ لوگ نہیں جانتے کہ انبیاء کرام
عموماً اور نبی علیہ السلام خصوصاً مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے دنیا میں بھیجے گئے۔
اور مکارم اخلاق کی تتمیم و تکمیل تو راہ راست کو اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔
اگر انبیائے کرام کے فرمائے ہوئے اور متعین کردہ اعمال و افعال موصل و مقرب الی اللہ
نہیں تو پھر کونسا ایسا راستہ ہے جو موصل بن سکے۔ انبیاء کی شان و عظمت جب
سب مخلوق سے اعلیٰ ہے تو ان کے احکام بھی سب سے اعلیٰ اور اولیٰ۔ اور جو لوگ
انبیاء کے احکام کی خلاف ورزی کر کے دوسروں کے راستوں کو اختیار کرتے ہیں۔
وہ حقیقت میں انبیائے کرام کی عظمت کے منکر ہیں۔ چوں کہ انبیائے کرام کے
فرمودات کا ذکر شروع ہوگیا ہے اس لئے مناسب ہے کہ ان کے فرمودات پر
عمل کرنے کے شرائط بھی عرض کرتا جاؤں۔ سو انبیاء نے جن افعال و اعمال کے کرنے
کا حکم دیا ہے ان کو اسی تفصیل سے کیا جائے جس تفصیل سے وہ منقول ہیں۔ اور اس کا
دوسرا نام احسان ہے جس کی تفصیل خود فرمان نبوی میں موجود ہے الاحسان ان تعبد ربك
كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك (یعنی احسان اپنے رب
کی اس طرح عبادت کرنے کا نام ہے کہ گویا تو اپنے رب کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ درجہ
حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ تجھے تیرا رب دیکھ رہا ہے) اس راستہ کی
رہنمائی سلوک ہی کر سکتا ہے۔ اور بعض لوگ جن کے اعتقاد سست اور غلط ہوتے
ہیں۔ وہ سلوک کا نام لے کر غلط کاریوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور دنیا و آخرت میں
خسران و حرمان پاتے ہیں۔ وہ شریعت کی اصطلاح میں ڈاکو اور لٹیرے ہیں خود
بھی راہ مستقیم سے برگشتہ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے ہر حال میں
پرہیز و اجتناب ضروری ہے۔ وہ شریعت کے رموز اور نکات سے واقف نہیں اسی
لئے لن ترانیوں کے مرتکب ہو کر شریعت کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ
آخرت کی راحت شریعت پر عمل کرنے سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ جیسے کہ ارشاد
خداوندی ہے کہ جزاءً بما كانوا يعملون۔ (کہ اہل بہشت کو یہ بلند مقامات

اسی لئے ملے ہیں کہ انہوں نے دنیا میں عمل نیک کئے)

اے میرے عزیز؟ حاصل اس جہان میں ایمان و عمل کا مجموعہ ہے جو دل کو روشن اور منور کرتا ہے۔ اور اسی کے ذریعہ آدمی بہشت پاتا اور آخرت کی غیر محدود نعمتوں سے مالا مال ہو کر خدائے بے مثل کا دیدار کرتا ہے۔ اور جو لوگ ان چیزوں کی طلب بغیر عمل کے کرتے ہیں ان کے دلوں میں ایک رہزن اور جہالت کا دیو مسلط ہے جو ظلمت اور گمراہی کے گڑھے کی راہنمائی کر رہا ہے۔ اور انہیں لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے۔ خسرالدنیا والاٰخرۃ ذالک ھوالخسران المبین (یعنی یہ لوگ دنیا اور آخرت میں خسارہ پانے والے ہیں اور یہی ظاہری ٹوٹا ہے) یہ لوگ نہیں جانتے کہ نورانیت ایمان عمل ہی سے بڑھتی اور پروان چڑھتی ہے۔ یعنی عمل سے ایمان بڑھتا ہے جیسے کہ ایمان سے عمل میں ترقی ہوتی ہے۔ گویا کہ دونوں کا تعلق لازم و ملزوم کا ہے۔ حقیقت میں تصدیق ایک نور ہے۔ جب اس کا اظہار زبان سے ہوتا ہے تو اقرار ہے۔ اور جب اس کا اثر جوارح پر پڑتا ہے تو عمل کی شکل میں متشکل ہو کر نورٌ علی نور یھدی اللہ لنورہٖ من یشاء کا مصداق بن جاتا ہے اولاً تو اسی اجمالی تشریعی و تقلیدی ایمان سے عمل شروع کیا جائے۔ اور پاؤں کو مضبوطی اور استحکام سے اسی پر ثابت رکھا جائے یہاں تک کہ سب وجود نورانی ہو جائے۔ اور تقلید کی ظلمت تحقیق کے نور سے متبدل ہو جائے۔ بات طویل ہوگئی عرض یہ کر رہا تھا کہ ہادی اور معلم شارع ہے۔ اور جو اس نے تعلیم اور تلقین کی ہے اس کو سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے اور اگر اس ہادی کے علاوہ اور کوئی شخص کوئی بات کہتا ہے۔ اگر اسی کی بات اور اسی کا عمل ہے تو مبارک اور باعث التقویت ایمان ہے۔ ورنہ اس کو پھینک دیا جائے۔ اگرچہ اس کی باتیں موتیوں کی مانند ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ وہ شارع کے خلاف ہیں جو آخر کار وبال جان بنیں گی۔ اس بات کو خوب ذہن نشین کر لیا جائے۔ کہ زائد اعمال یعنی نوافل وغیرہ خداوند کریم کی حضوری و قرب کا ذریعہ ہیں۔ اور سب سے زیادہ آدمی کو اللہ کے نزدیک کرنے والی نماز ہے۔ اور اسی نماز سے عالی مراتب ملتے ہیں اور یہی نماز نبی علیہ السلام کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اگرچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دائم الوصال اور رب ذو الجلال کے قرب میں ہمیشہ رہتے تھے۔ مگر آپ کو جو نماز میں قرب اور وصال نصیب ہوتا

تھا۔ وہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ اور بقیہ سب وصالوں سے جداگانہ شان کا حامل ہوتا تھا۔ اسی لئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ اقرب من یکون العبد الی ربہٖ وھو ساجدٌ۔ (یعنی آدمی اللہ کے نزدیک تر اس وقت ہوتا ہے جب اس کی جبینِ نیاز دربار خداوندی میں سجدہ ریز ہوتی ہے) نماز کو معراج قرار دیا ہے۔ جو ہر نمازی کو اس کے مراتب اور درجات کے اعتبار سے نصیب ہوتی ہے۔ اس مکتوب کی ابتدا میں کاتب خود حیران ہوتا ہوگا کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے لیکن جب کاتب اس مکتوب کے آخر پر پہنچے گا تو اس کے دل میں نماز کا شوق موجزن ہوگا۔ الامور مرھونۃ باوقاتہا کے تحت اسی پر اکتفا کرتا ہوں اور بس۔

وصلے اللہ علے السید السند والنبی الکریم الممجد محمد والہٖ وصحبہٖ اجمعین
والعاقبۃ بالخیر

مکتوب نمبر ۳۵

درباب اللہ بندہ

تنبیہ اولی الالباب بالمواظبۃ علی الادعیۃ والاحزاب

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ شہیر فی الآفاق خواجہ نصیر طوسیؒ نے الشیخ العالم العارف صدر الدین قونوی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ سے بذریعہ مکتوب یہ درخواستؒ التماس کی کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتلا دی جائے جس کے کرنے سے میں اللہ کا مقرب ومحبوب بن جاؤں شیخ صدر الدینؒ نے چند وظائف تحریر کر دیئے اور فرمایا کہ ان پر مداومت کرنے سے آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ جب وہ خط خواجہ نصیر الدین صاحب کو ملا تو انہوں نے اس بات کو بُرا مانا اور شیخ کی جانب ناراض ہو کر لکھا کہ ایسے ورد و وظائف تو ان لوگوں کو بتلائے جاتے ہیں جو ابھی طالب العلم ہوں میں تو شریعت کے احکام کے رموز و اسرار جانتا ہوں۔ اور علوم و معارف میں موشگافیاں کرتا ہوں میری جانب ایسے ورد وغیرہ تحریر کرنے کا کیا مطلب۔

خواجہ کو شیخ نے بوالپسی جواب دیا کہ اصل طریقہ یہی ہے اس میں مبتدی اور منتہی کا کوئی امتیاز نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جیسا کسی کے لئے مناسب سمجھتے تھے علاج فرمایا کرتے تھے۔ ہم سب اسی گھر کے خوشہ چیں اور خادم ہیں۔ ہمیں بھی انہیں کی اتباع کرنے میں نجات وفلاح ہے۔ اس راہ میں محض عقل و علم سے کام نہیں چلتا ؎

بعمل کار برآید بسخن دانی نیست

(یعنی عمل کرنے سے مقصد حاصل ہوتا ہے سخن دانی سے نہیں)

مقصود اس حکایت اور تمہید سے یہ ہے۔ کہ دعا ایسی مانگی جائے اور ورد و وظیفہ ایسا کیا جائے جو وقت اور مصلحت کے مطابق ہو جس کے کرنے سے وقتی شر دور ہو جایا کریں۔ اور جن سے جمعیت قلب حاصل ہو مشائخ

اسی کی تلقین کرتے ہیں اللہ تعالےٰ ہم کو مشائخ کی محبت اور اتباع سے مشرف فرمائیں۔ اور غیروں کی پیروی کرنے سے محفوظ رکھیں۔ (اب ہم ذیل میں چند وظائف اور ان کے خواص لکھتے ہیں جو مجرب اور بہت مفید ہیں)

اوّل ۔ افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیرٌ با لعباد۔ اس کو اگر کوئی شخص کثرت اور مداومت سے پڑھتا رہے۔ وہ دشمنوں کے شر اور حاسدوں کے حسد سے محفوظ و مامون رہے۔ اور اس کی تاثیر پر خود قرآن منطوق ہے۔ ارشاد ہے۔ فَوَقٰہُ اللہ سیأت مامکروا وحاق باٰل فرعون سوء العذاب۔ اصل اس کا یہ ہے کہ اس آیت کے اندر فرعونیوں اور قبطیوں کا تذکرہ ہے۔ کہ جب فرعونیوں نے یہ طے کیا کہ ہم قبطیوں کا استیصال کر کے رہیں گے تو قبطیوں نے افوض امری الخ کے تعویذ لکھ کر اپنے پاس رکھے جس کی برکت سے اللہ تعالےٰ نے انہیں نجات دی اور فرعون اور اس کی آل غرق و تباہ ہوگئی۔ اگر کوئی شخص اس آیت کو روزانہ دس بار یا دس سے لے کر سو تک اس نیت سے پڑھے کہ اللہ تعالےٰ اس کے لئے آسانی میسر فرمائیں تو اس کے لئے بھی مفید ہے۔ مگر اس کو یاد رکھیں کہ اس کی تعداد سو سے زیادہ تک پڑھنے کی ضرورت نہیں اس کے اندر ہی اندر جتنا چاہے پڑھ لے۔ مگر دس سے کم نہ ہو۔

دوئم۔ لاالہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔
اس کی خاصیت کا ذکر خود قرآن میں ہے فنجیناہ من الغم وکذالک ننجی المومنین۔ کہ اصل اس کا حضرت یونس علیہ السّلام کا واقعہ ہے کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں محبوس ہوگئے تھے اس وقت انہوں نے یہ کلمات کہے تھے۔ اللہ نے ان کلمات کی برکت سے انہیں اس مصیبت سے نجات عنایت فرمائی۔ اور اگر وہ ان کلمات کو نہ کہتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے جیسے کہ ارشاد ہے فلولا انہٗ کان من المسبحین للبث فی بطنہٖ اِلیٰ یوم یبعثون۔

لاالہ الا انت۔ کے اندر تو سر توحید اور عظمت الٰہی کا بیان ہے۔ اور

انی کنت من الظالمین۔ کے اندر عجز بندہ کا شہود اور بیان عبودیت ہے۔ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی آدمی ان کلمات کو ایک لاکھ بار پڑھے تو اس کی سب مصیبتیں دور ہو جائیں اور منزل مقصود تک بآسانی رسائی پائے۔ لیکن یہ طریقہ جس کو ہم اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس میں تعداد کا تعین نہیں۔ جب یہ دعا ہے۔ تو دعاؤں کے بارے میں شارع سے کوئی عدد متعین نہیں جتنی طاقت و وسعت ہو اتنی بار پڑھیں۔ نتیجہ خود قرآن میں موجود ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم ۰

مکتوب نمبر ۳۶

درباب اللہ بندہ

استیناس انوار القبس بشرح دعاء انس رض

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ بسم اللہ علیٰ نفسی و دینی بسم اللہ علیٰ اھلی و مالی وولدی بسم اللہ علیٰ ما اعطانی اللہ اللہ ربی لا اشرک بہٖ شیئاً اللہ اکبر اللہ اکبر واعز واجل واعظم مما اخاف واحذر عز جارک وجل ثناءک ولا الٰہ غیرک اللّٰھم انی اعوذبک من شر نفسی ومن شر کل شیطانٍ مرید ومن شر کل جبارٍ عنید فان تولوا فقل حسبی اللہ لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم وان ولییّ اللہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین۔

یہ دعا حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی ہے۔ جنہوں نے نبی علیہ السّلام کی دس برس خدمت کی اسی لئے خادمِ رسول ص سے معروف و مشہور ہیں۔ حضرت انس رض کی والدہ کی درخواست اور التماس پر نبی علیہ السلام نے ان کو یہ دعا بتائی تھی جس کی برکت سے ان کے مال و اولاد اور عمر میں اور دین و دنیا میں برکت تھی۔ یہاں تک کہ حضرت انس رض کی عمر ایک سو برس سے زیادہ تھی۔ اور ان کی صلبی اولاد کی تعداد ایک سو سے متجاوز تھی۔ تہتر بیٹے اور باقی بیٹیاں۔ اور باغات و بستان بڑی کثرت سے تھے۔ یہ حال تو ان کی دنیاوی زندگی کی خیر و برکت کا ہے۔ اور اُخروی عیش و راحت کا تو بیان ہی کیا۔ جلال الدین سیوطی رح جو حدیث کے بڑے علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب جمع الجوامع میں حضرت انس و حجاج بن یوسف کی ملاقات اور ان دونوں کے مابین ایک مکالمہ کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ ایک دن حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس بیٹھے

تھے حجاج بن یوسف نے اپنے نوکروں کو چار سو مختلف الاقسام گھوڑوں کے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ جب گھوڑے آ گئے تو حجاج بن یوسف نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا تو نے ایسی دولت اپنے صاحب یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس دیکھی تھی۔ مقصود یہ تھا۔ کہ یہ دولت مجھے نصیب ہوئی ہے تم لوگ اس سے محروم تھے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں نے نبی علیہ السلام کے دربار میں اس سے بھی بہتر گھوڑے اور مالِ دنیا دیکھا اور نبی علیہ السلام کو یہ فرماتے بھی سنا ہے۔ کہ جو لوگ گھوڑوں کی حفاظت اور ان کی نگہداشت کرتے ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔ اول۔ وہ جو گھوڑوں کو پالتا ہے۔ تاکہ ان سے جہاد کرے اور دشمنانِ اسلام کو ان گھوڑوں کی مدد سے تباہ کرے تو اس کے نامۂ اعمال میں ان گھوڑوں کے بول و براز کا ثواب بھی لکھا جاتا ہے۔ اور دوسری قسم ایسی لوگوں کی ہے۔ جو گھوڑوں کو پالتے ہیں تاکہ ان کو اپنی ضروریات میں استعمال کریں اور تیسری قسم ان لوگوں کی ہے۔ جو گھوڑوں کو اس لئے رکھتے اور پالتے ہیں تاکہ لوگ یوں کہیں کہ فلاں کے پاس اتنے اور ایسے گھوڑے ہیں۔ اس شخص کی جگہ دوزخ ہے۔ (اتنی بات بیان فرمانے کے بعد اب حضرت انس حجاج سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں) کہ اے حجاج تیرے گھوڑے اسی تیسری قسم میں داخل ہیں۔ جب حجاج نے اتنی بات سنی تو حضرت انس پر غضبناک ہو گیا اور کہنے لگا۔ کہ اگر تو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت اختیار نہ کی ہوتی اور مروان الحکم تیری سفارش نہ کرتے تو میں تجھے ایسی سزا دیتا کہ تجھے یاد رہتی۔ حضرت انس رضؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم تو مجھے ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا اس لئے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسی دعا سیکھی ہوئی ہے جس کی برکت سے مجھے کوئی گزند نہیں پہنچایا جا سکتا۔ حجاج ان کلمات کی ہیبت سے لرز گیا اور جب اس کا غصہ ختم ہوا تو کہنے لگا کہ مجھے آپ وہ کلمات سکھا دیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تو اس کا اہل ہی نہیں لیکن جب آپ کا نزع کا وقت قریب آیا تو ایک خادم جو آپ

کی دس برس سے خدمت سر انجام دے رہا تھا اس کو بلایا اور کہا کہ میں نے نبی علیہ السلام کی دس برس خدمت انجام دی تو مجھے نبی علیہ السلام نے ایسے کلمات سکھا دئے جس کی برکت سے دنیا کی سب افتادوں سے مصئون و محفوظ ہوں۔ تو نے میری دس برس تک خدمت کی لہٰذا میں تجھے وہ کلمات سکھاتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے یہ کلمات اپنے ایک خادم کو سکھا دئے۔

ان کلمات کے کہنے سے ہر شخص محفوظ رہ سکتا ہے۔ اور دین و دنیا کی بھلائی تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ واللہ اعلم

مکتوب نمبر ۳

در باب اللہ بندہ

تجلیۃ القلوب بقدس الملکوت بشرح دعاء القنوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ قنوت بمعنٰی دعاء طاعت۔ سکوت وقیام وغیرہ کے آتا ہے۔ اور ہر ایک معنٰی اس دعاء کے لئے مناسب ہے۔ البتہ اس کے پڑھنے کے طریقہ اور آداب میں اختلاف ہے۔ مگر مناسب ترین یہی طریقہ ہے کہ ہر جملہ کو واؤ کے ساتھ پڑھا جائے اللّٰھم انا نستعینك (اے اللہ ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں) اللّٰھم یا اللہ کے معنٰی میں آتا ہے۔ انا نستعینك میں خداوند کریم سے مدد کا مطالبہ ہے۔ اس لئے کہ دنیا اور آخرت کے سب کاروبار اس کی مدد اور توفیق پر ہی موقوف ہیں۔ اگر اس کی مدد شامل حال نہ ہو تو بڑے بڑے لوگ بیکار ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ کسی نے کہا ہے ؎

جو ہوا ہوا کرم سے تیرے جو ہوگا کرم سے تیرے ہوگا۔ مترجم ۱۲

سوال ۔ دعا تو ایک مانگ رہا ہے۔ اور صیغہ جمع کا استعمال کر رہا ہے۔ تو جواب اس سوال کا یہ ہے۔ کہ دعا اگرچہ ایک ہی مانگ رہا ہے مگر مدد کی تو سب کو ضرورت ہے۔ اس لئے صیغہ جمع بولا گیا۔ ونستغفرك (ہم تجھ سے بخشش مانگتے ہیں) یعنی جو ہم سے گناہ ہوئے ان کی معافی اور آئندہ نیکیوں کی توفیق چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ عبادت استغفار کے بغیر میسر نہیں ہوتی۔ استغفار اللہ کی رحمت کے نزول کا سبب ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی مجلس کے اندر ستر بار اور کبھی کبھی سو سو بار استغفار کرتے تھے۔

فائدہ :۔ استغفار کا وظیفہ مشائخ رحمہم اللہ سے اس طرح منقول ہے۔ کہ ہر روز ستر بار یوں پڑھا جائے۔ استغفر اللہ العظیم الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ

اور اگر اس طرح کہے تو بھی بہتر ہے۔ اللّٰھم اغفرلی وتب علیّ انک انت التواب الغفور۔ ونؤمن بک کہ ہم تجھ پر ایمان لاتے ہیں۔ اس دعاء کے اندر اظہار ایمان ہے۔ جیسے حدیث میں آتا ہے جدّدوا ایمانکم بقول لا الٰہ الا اللّٰہ۔ صحابہ کرام رضوان اللّٰہ علیہم جب ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے تھے تو تجدید ایمان کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے اندر ایک قسم کی کہنگی اور پژمردگی کا آجانا بعید نہیں اس کو ذکر اللّٰہ سے دور کیا جاسکتا ہے۔ ونثنی علیک الخیر۔ ہم تیری ثناو تعریف کرتے ہیں اور سب نیکیاں تیری ہی طرف منسوب ہیں۔ ونشکرک ولا نکفرک ہم تیرا شکر کرتے ہیں۔ اور کفران نعمت نہیں کرتے۔ اس لئے کہ سب کچھ آپ کا عطاء کردہ ہے۔ ہمیں یہی لائق ہے۔ کہ ہر وقت تیرے شکر گزار بندے رہیں۔ ونخلع ونترک من یفجرک۔ اور ہم جدا ہوتے ہیں اور چھوڑتے ہیں اس کو جو تیرا نافرمان ہو۔ اس لئے کہ فاجر آدمی خدا کا دشمن ہے۔ اور دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے لہٰذا ایسے آدمی سے متارکت اختیار کی جائے۔ البتہ کوئی شخص ایسے آدمی سے ملاقات اس نیت سے کرے کہ اس کی اصلاح ہو جائے تو اس کا حکم جداگانہ ہے۔ اللّٰھم ایاک نعبد۔ اے اللّٰہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں یعنی جب ہم نے تیرے فاجروں اور نافرمانبرداروں سے خُلع اور متارکت کر لی تو اب تیرے ہی دربار کے بندے ہو کر تیری ہی عبادت میں مصروف ومشغول ہیں۔ ہمیں تیرے سوا کسی سے کوئی غرض نہیں نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ ولک نصلی و نسجد۔ تیری رضا اور خوشنودی کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں سب عبادات میں سے چوں کہ نماز افضل اور اقرب ہے اس لئے عبادت کے بعد خصوصاً صلوٰۃ کو ذکر کیا گیا اور پھر صلوٰۃ کے ساتھ سجدہ اس لئے لایا گیا کہ یہ نماز میں اقرب اور افضل ہے جیسے کہ حدیث میں آتا ہے اقرب من یکون العبد الی ربہٖ وھو ساجدٌ، والیک نسعیٰ ونحفد تیری طرف ہم سعی کرتے ہیں اور تیری خدمت کرتے ہیں۔ نحفد حفد سے ہے جس کے معنیٰ خدمت کرنے کے ہیں اور حافد خادم کو اور محفود مخدوم کو کہتے ہیں۔ اور عمل میں تیزی و شتابی کے معنی بھی آتے ہیں۔ ونرجو رحمتک ونخشیٰ عذابک (ہم تیری رحمت کی امید رکھتے ہیں اور تیرے عذاب

سے ڈرتے ہیں۔) امید اس لئے رکھتے ہیں کہ تیرے اوپر کسی کا حق تو واجب نہیں ثواب دیں تو محض آپ کا فضل ہوگا اس لئے اس فضل کی امید رکھتے ہیں۔ اور اگر عدل کریں تو ہمارے اعمال ایسے کہاں کہ نجات ملے اس صورت میں تو عذاب متعین ہے۔ بربنائے ایں تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ان عذابك بالکفار ملحق۔ اور بیشک عذاب تیرا کفار کو ملنے والا ہے۔ لفظ ملحق کی حاء پر فتحہ اور کسرہ ہر دونوں درست ہیں۔ اور فتحہ احسن ہے۔ معنیٰ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہیں۔ اور کتب حنفیہ میں دعاء قنوت کے علاوہ یہ دعاء بھی مذکور ہے جس کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بتلایا تھا۔ اللّٰھم اھدنا فیمن ھدیت وعافنا فیمن عافیت وتولنا فیمن تولیت وبارك لنا فیما اعطیت وقنا شرما قضیت۔ انك تقضی ولا یقضیٰ علیك انہٗ لا یذل من والیت و لا یعز من عادیت والمھتدی من ھادیت تبارکت ربنا وتعالیت یا ذالجلال والاکرام اغفر وارحم وتجاوز عما تعلم انك انت الاعز الاکرم۔ وصلی اللہ علی محمد النبی الامی وآلہ واصحابہ وذریاتہ وازواجہ اجمعین

مکتوب نمبر ۳۸

درباب اللہ بندہ

تحصیل البرکات ببیان معنی التحیات

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ التحیات للّٰہ۔ تمام عبادات قولیہ۔ والصلوات تمام عبادات فعلیہ والطیبات تمام عبادات مالیہ اللہ کی ذات کیلئے ہیں۔ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہونے کا یہ طریقہ ہے۔ کہ حاضر ہونے والا اولاً سلام کرتا ہے۔ ثانیاً تعریف۔ ثالثاً اپنے عجز و انکسار کا اظہار۔ رابعاً اپنی طاقت اور بساط کے موافق کوئی تحفہ پیش کرتا ہے۔ امام محی الدین نووی ؒ مسلم شریف کی شرح میں لکھتے ہیں کہ التحیات کے معنیٰ سلام۔ اور ملک و بقاء کے ہیں پھر تحیات جمع کیوں لایا گیا اس لئے کہ سب تحفے جو اللہ کی ذات کے لائق ہیں اسی کے لئے ثابت ہیں۔ اس لئے کہ وہ سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اور علامہ کرمانی صحیح بخاری کی شرح میں فرماتے ہیں۔ کہ التحیات ان الفاظ مخصوصہ کو کہتے ہیں جو رعایا ملاقات کے وقت اپنے بادشاہ کو کہتے ہیں۔ معنیٰ یہ ہوئے کہ تعظیم کے تمام اقسام و انواع اللہ کی ذات کیلئے مخصوص ہیں اور کوئی اس میں شریک نہیں اسی طرح الصلوات جمع ہے صلوٰۃ کی جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ نماز کے جمیع اقسام خواہ فرائض ہوں یا از قسم واجبات ولنوافل سب اللہ کے لئے ہیں۔ اور الطیبات جمع طیبۃ کی جس کے معنیٰ اعمال صالحہ کے ہیں۔ یعنی جمیع اعمال صالحہ خدا ہی کے دست قدرت میں ہیں۔ یہ تمام معنیٰ درست اور مناسب مقام ہیں۔ السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ سلامتی ہو تجھ پر اے نبی اور اللہ کی رحمت و برکت۔ اگر کوئی سوال کرے۔ کہ اس جگہ خطاب تو حاضر کے صیغہ سے ہے۔ اور نبی علیہ السلام حاضر (ناظر) نہیں تو پھر اس کا مطلب کیا ہوگا جواب اعتراض کا یہ ہے۔ کہ اصل میں ورود اس کلمہ کا شب معراج

میں ہوا ہے۔ اور اس وقت نبی علیہ السلام کے لئے خداوند کریم نے صیغہ حاضر سے خطاب فرمایا تھا۔ انہیں الفاظ کو بعینہٖ رکھا گیا ہے۔ اور مراد خطاب سے نبی علیہ السلام کا حاضر ہونا نہیں۔ اسی اشکال کی وجہ سے بعض صحابہ کرام نے نبی علیہ السلام کی رحلت کے بعد ان الفاظ کو ترک کر دیا تھا۔ مگر جب صحیح وجہ سمجھ میں آگئی تو انہیں الفاظ کو مناسب سمجھا گیا۔ (اس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رح نبی علیہ السلام کے حاضر و ناظر ہونے کے قائل نہیں ورنہ اس توجیہ کی ضرورت ہی نہ تھی از مترجم ۱۲) السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین۔ سلامتی ہو اللہ کی ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ اشهد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔ پہلے تو خداوند کریم کی خدائی کی شہادت ہے۔ اور پھر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت وعبودیت کی بعض روایتوں میں وحدہٗ لا شریک لہٗ کے الفاظ بھی آتے ہیں جو بلا شبہ درست اور صحیح ہیں لیکن صحیح روایتوں میں جو الفاظ موجود ہیں وہ وہی ہیں جو ہم عرض کر چکے۔ اور یہی مذہب احناف ہے۔ ان الفاظ کو تشہد کہتے ہیں۔ اس کے بعد درود شریف پڑھا جائے جو حنفیوں کے نزدیک سنت اور شافعیوں کے نزدیک فرض ہے۔ کیفیت اس کی احادیث میں مختلف صیغوں اور لفظوں سے آئی ہے۔ لیکن اس طرح پڑھ لینا کافی ہے۔ اللھم صلّ علیٰ محمد وعلیٰ اٰل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم۔ انک حمیدٌ مجیدٌ (وفی نسخۃٍ) اللھم بارک علیٰ محمد وعلیٰ اٰل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم انک حمیدٌ مجیدٌ۔

اس درود شریف کے الفاظ کے اندر یہ اعتراض ہے۔ کہ نبی علیہ السلام کے درود شریف کو ابراہیم علیہ السلام کے درود پر رحمت سے تشبیہ دی گئی گویا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود رحمت مشبہ ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام پر درود رحمت مشبہ بہ اور یہ قاعدہ ہے کہ مشبہ بہ۔ مشبہ سے قوت اور فضیلت میں زیادہ ہوتا ہے۔ اگر اس جگہ ایسا ہے۔ تو وہ درست نہیں اس لئے کہ جیسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سب انبیاء سے افضل ہیں اسی طرح آپ سے متعلقہ اشیاء بھی سب انبیائے کرام سے متعلقہ اشیاء سے افضل ہیں۔ اس کے بہت سے جواب ہیں جو رسالہ جذب القلوب

کے اندر تفصیلاً مذکور ہیں۔ اس درود شریف کے بعد ماثورہ دعاؤں میں سے جو دعا پسند آئے پڑھ لی جائے۔ اور ماثورہ دعاؤں میں سے ایک یہ ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر کے التماس پر تعلیم فرمایا تھا۔ رب انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفر لی مغفرۃً من عندك وارحمنی انك انت الغفور الرحیم۔ دوسری دعا یہ ہے۔ اللّٰھم انی اعوذبك من فتنۃ عذاب القبر ومن فتنۃ عذاب النار ومن فتنۃ المسیح الدجال ومن فتنۃ المغرم والماثم ومن فتنۃ المحیا والممات واعوذبك من الفتن ماظہر منھا وما بطن اللّٰھم اغفرلی ماقدمتُ وما اخرتُ وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اعلم بہ منی ۔ اور یا یہ پڑھے۔

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ اور یہ دعا جامع ومانع ہے۔ اس میں دنیا اور آخرت کی سب بھلائیاں پائی جاتی ہیں۔ فقط۔

مکتوب نمبر ۳۹
بنام شیخ نورالحق
تثبیت الفواد بتصور عظمۃ رب العباد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ اللّٰھم صغر الدنیا باعیننا وعظم جلالك فی قلوبنا۔ (اے رب ہمارے ذلیل کر دے ہماری نظروں میں دنیا کو اور اپنی ذات کو ہمارے دلوں میں باعظمت بنا دے) جب انسان خدا تعالیٰ کی برتری اور عظمت کا تصور کرتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر کسی کو نہیں پاتا اور ارتجالاً یوں کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وھو العلی العظیم۔ اور جب انسان اپنی حقیقت اور وجود پر نظر ڈالتا ہے۔ تو تصور کے سیل رواں میں اپنی ہستی اور وجود کو فناء اور نیست کی دنیا میں گم کر دیتا ہے۔ اس حقیر کی کیفیت یہ ہے۔ کہ میں نے ایک روز اپنی ذات کے بارے میں سوچا کہ میں کیا ہوں ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ میں نے اپنے وجود کو عالم فنا میں پایا۔ اس لئے معلوم ہوا کہ آدمی کا وجود فانی اور کسی کام کا نہیں اصل تصور تو خداوند کریم کی ذات میں کرنا چاہیئے۔ جب انسان اس کی ذات پر اپنی تمام توجہات کو مرکوز کرتا ہے۔ تو وہ اندھیروں سے نکل کر اجالے اور پستی سے نکل کر علو اور بلندی کی منازل کو طے کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اس احکم الحاکمین کے دربار میں اس کے سوا کہنے کے چارہ کار نہیں۔ اللّٰھم انی اصبحت مرتھنا بعلمی واصبح امری بید غیری فلا فقیرٌ افقر منی ان کلمات مذکورہ کو کبھی ان کلمات کے بعد پڑھا جائے واذا اصبح امری بیدك فلا غنی اغنیٰ منی۔ اس تصور کے بعد ایک نورانیت اور انبساط پیدا ہوگا جس کو پیغمبر خدا نے بکمال احسن بیان فرمایا ہے۔ کہ پھر تجھ پر یہ بات روشن ہو جائے گی کہ سب دنیا اس شاہنشاہ کی گداگر اور نوکر ہے اور وہ اپنی بخشش وکرم ہر ایک پر غریب ہو یا امیر برابر اور مساوی طور پر فرماتے رہتے ہیں۔ اور وہ جن وانس کا فریاد رس۔ زمین و آسمان کا بادشاہ۔ ملک اور ملکوت کا حاکم و فرماں روا ہے پھر ان انوارِ ولایت

کو اللہ تک دسترس رکھنے والوں کے اندر دیکھ اور عوام الناس سے مستغنی ہو کر خدا کی رضا جوئی میں مصروف ہو جا۔ اب میں اپنے مطلب کی طرف آتا ہوں اور وہ یہ ہے۔ کہ انسان اپنے وجود کو دوئی سے موصوف نہ کرے بلکہ تو من شدم اور من تو شدم کا معاملہ ہے یعنی اللہ اور بندے کے درمیان ایک نسبت خالق و مخلوق کی ہے اس نسبت کو خیال کر کے وہ اپنے اندر دوئی نہ آنے دے اور اپنے کو غیر تصور کر کے اللہ سے دور نہ ہو جائے۔ بلکہ ہر وقت اللہ کی محبت کا جام ہاتھ میں لے کر ہر صبح و مسا اس سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ اور جب تیرا دل خدا کی عظمت اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت و الفت سے لبریز ہو جائے گا تو پھر کسی اور دروازے پر جانے کا آپ کے دل میں وسواس بھی پیدا نہیں ہو گا۔ اگر آپ مقام شہود اور عظمت کبریا کے متلاشی ہیں تو اس کی امید رکھ کر عمل پیہم میں کوشاں رہیں۔ اس دربار میں سب کچھ ہے۔ ادھر کمی نہیں کمی تو طلب کرنے والوں کی ہے۔ بقول اقبال ؎

ہم تو مائل بکرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے راہ روِ منزل ہی نہیں

(از مترجم فاضل ۱۲)

پھر عرض کرتا ہوں کہ وقت کو ضائع نہ کیا جائے۔ اور جمعیت خاطر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اور فرصت و فراغت کو غنیمت جان۔

اور اس کی ذات ستودہ صفات سے امیدوار رہ کر یہ دعا پڑھا کر یہ دعا حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ (جو اس امت کے پہلے قطب ہیں) کو سکھائی۔

اللھم اقذف فی قلبی رجاءك واقطع رجائی عمن سواك حتی لا ارجو احدًا غیرك۔ بے ساختہ یہ کلمات ذہن میں آ گئے جن کو قلم نے اچک لیا۔ شاید یہ کلمات متضمن خیر ہوں

وباللہ التوفیق والعاقبۃ بالخیر

مکتوب نمبر ۸

بنام شیخ نورالحقؒ

دفع الکسل بالمواظبۃ علی العمل

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ اے نفس تو اعمال کو بجالانے میں غفلت سے کیوں کام لے رہا ہے۔ اور ہمیشہ سستی اور تکاسل کیوں کر رہا ہے۔ خدا کا نام لے کر کمربستہ ہو کر کھڑا ہو جا اور سستی و تکاسل جیسی سب کمزوریوں کو اپنی ذات سے دور کر۔ تو اور تیری ذات کچھ نہیں تیری ذات میں شرف و عظمت تو محض خداوند کریم کے احکام بجالانے میں ہے۔ جو اللہ کا ارشاد و حکم ہو اس کو بجالانے میں دیر نہ کر وہ تیرے اندر جو جنبش اور حرکت پیدا کریں تو اسی طرح جنبش اور حرکت کر۔ اگر تو اپنے اعمال اور عبادات پر نظر غامض کر کے دیکھے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیرے اعمال کسی کام کے نہیں جب حقیقت اعمال ایسی ہے تو پھر ان پر ناز کر کے سستی کرنے کا کیا مطلب۔ اور اگر اعمال درست بھی ہوں تب بھی تو کسی پر احسان نہیں کر رہا محض اپنی ہی ذات کے فائدہ کیلئے سب کچھ کر رہا ہے۔ اعمال نیک کر کے خدا اور اس کے رسول یا دوسری مخلوق پر احسان کیوں جتلاتا ہے۔ یہ عادت تو مذمومہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم بایں الفاظ کرتا ہے۔

یمنون علیک ان اسلموا قل لا تمنوا علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم وان ھدٰکم

(یعنی یہ لوگ اسلام لانے اور مسلمان ہو جانے کا آپ پر احسان جتلاتے ہیں ان سے فرما دیجیے کہ تمہارا اسلام لانا ہم پر کوئی احسان نہیں بلکہ تم پر خدا کا احسان ہے جس نے تمہیں ایمان کا راستہ دکھا دیا) تیرے عمل میں مخلوق کو کیا فائدہ کہ اس پر احسان جتلا کر ناز کرتا۔ اگر کوئی شخص اپنے فائدہ کی خاطر کوئی کام کرے اور پھر دوسرے پر احسان جتلائے یہ اسکی خام خیالی اور بداندیشی کا نتیجہ ہے۔ میں اس سے مزید ترقی کر کے عرض کرتا ہوں۔ کہ تو نے تو اپنی تمام عمر میں کوئی کام بھی خدا کے لئے نہیں کیا۔ سب کاموں کو اجرت پر کر رہا ہے۔ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ انہیں اعمال پر دنیا و آخرت کی بھلائی کی

امید رکھے بیٹھا ہے۔ کمائی اور کسب کر کے تو اپنی آخرت کا توشہ اور زاد جمع کر رہا ہے پھر خدا پر کیا احسان ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے ان احسنتم احسنتم لانفسکم (اگر تم نیکی کر رہے ہو تو وہ تمہارے لئے ہے)، تو بندگی اور دعاو آرزو کر کے خداوند کریم سے دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا مطالبہ کرتا ہے یہ بندگی کا طریقہ نہیں ہے۔ بندگی تو یہ ہے کہ تو سب کام محض خدا کی خوشنودی کے لئے کرتا رہے۔ اس پر راحت ملے یا مصیبت اس کی پرواہ نہ کرے۔ تیری مثال تو ان دنیا داروں کی سی ہے جو دنیا کے کام کر کے اپنی زندگی گذارنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں بلکہ تو ان سے بھی زیادہ حریص ہے۔ اس لئے کہ وہ دنیا کے کام کر کے دنیا ہی کے اسباب جمع کرتے ہیں اور تو عمل کر کے دنیا و آخرت دونوں جہان کے اسباب کی خواہش رکھتا ہے سستی کرنا بیکار بات ہے۔ اور باوجود سستی کے پھر ناز کیوں؟ اور کس پر کرتا ہے۔ خداوند کریم کی عنایت فرمودہ فرصت کو غنیمت جان کر بڑی تیزی کے ساتھ عبادات میں منہمک ہو جا۔ اور اس بات سے ڈرتا رہ کہ خدا تجھے بیکار نہ بنادے۔ اور ان لوگوں سے ہمیشہ گریز اور پرہیز کرتا رہ جن کے قلوب کو دنیا نے اپنی محبت سے مسخ کر دیا ہے۔ اور وہ گناہوں کے اندر ملوث ہو کر اپنی اخروی زندگی کو خراب کر رہے ہیں اگر تو بھی ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنے لگا تو اللہ تعالیٰ تیرے نام کو سعادت مندوں کی فہرست سے نکال دیں گے۔ تجھے چاہیئے کہ اپنی ذات میں خدا کی نعمتیں دیکھے اس لئے کہ انسان کے اپنے وجود ہی میں اللہ تعالیٰ کی ہزارہا نعمتیں مضمر ہیں (جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون کہ تمہارے نفسوں میں اللہ کی آیات اور نشانیاں موجود ہیں اگر تم غور سے دیکھو) انہیں نعمتوں کا خیال کر اور عمل میں مشغول ہو پھر اس عمل میں خود بخود اضافہ اور ترقی ہوتی رہے گی بہترین ترقی یہی زیادتی عمل ہے جس کو اہل سلوک طلب کرتے ہیں۔ قیامت کے روز جب تو اس عمل کے نور کو اپنے اندر دیکھے گا تو حسرت اور افسوس کرے گا کہ کاش میں اس سے بھی زیادہ عمل کرتا اور دنیا میں ایک ساعت فارغ نہ بیٹھتا مگر اس وقت یہ تاسف اور حسرت کارگر نہ ہوگی۔ دنیا تو کام کی جگہ اور آخرت کی کھیتی ہے یہاں تو فصل کی جاتی ہے اور آخرت میں اسے کاٹا جائے گا۔

یہ بات اپنے گوش ہوش سے سن لے کہ ہر عمل ایک نور رکھتا ہے۔ اگر اس عمل کو ترک

کیا جائے تو اس کا نور ختم ہوجاتا ہے۔ اور خصوصاً فرائض وواجبات اور سنن موکدہ ان کا نور اتم اور اکمل ہے۔ اللہ کی مہربانی اور عنایت کا ہمیشہ خیال رکھ اور ان اعمال کی بجا آوری کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اور اپنے سب اعمال خدا کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے کر خدا کی عادت یہی ہے کہ آخرت کی سب نعمتیں اعمال صالحہ ہی پر موقوف ہیں۔ اس میں ذرا برابر بھی تخلف نہیں یعنی خدا جس کو نوازتے ہیں عبادت اور اطاعت ہی سے نوازا کرتے ہیں۔ اگر ترک عبادات کا سبب کسل اور سستی ہے۔ تو ایک ساعت صبر کر اور جوانمردی سے کھڑا ہوکر اپنے بستر استراحت کو ترک کر اور ثابت قدمی سے عبادات میں مصروف ہوجا۔ اور اگر تو اپنے بستر استراحت پر یونہی آرام کرتا رہا تو پھر کچھ بھی توفیق نہ ہوگی اس لئے کہ اس وقت تیرا ساتھی اور ہم آغوش شیطان ہے۔ وہ تجھے کہاں جانے دے گا۔ اگر کھڑا ہوکر وضو کرے اور ذکر باری تعالیٰ میں منہمک ہوگا تو شیطان راہِ فرار اختیار کرے گا۔ پھر تیرا سب وجود نورانی ہوجائے گا۔ اور اگر سستی کا سبب طعام اور کھانے کی کثرت ہے تو اس میں کمی کردے۔ اور اگر سستی کا سبب نیند کا غلبہ ہے۔ تو نیند از قسم مرگ وموت ہے۔ اور مرگ وموت سے تجھے بھاگنا چاہیئے ایسی موت پر تو راضی کیوں ہے۔ اور اپنے کو مردوں میں کیوں شمار کرتا ہے۔ اور اگر سستی کا سبب ضعف ایمان اور فتور فی الاعتقاد ہے۔ تو ایک ساعت خدا کے ذکر میں مشغول ہوکر دیکھ یہ سب بداعتقادی پارہ پارہ ہوجائے گی۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ کوئی چیز مداومت اور استقلال سے زیادہ موثر نہیں ہے۔ اسی چیز کو مضبوط ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے پھر دیکھ سستی اور کاہلی سب ھباءً منثوراً ہوجائے گی پھر خصوصاً فرض پر مداومت اور جب اس کی توفیق ہوجائے تو پھر تہجد بھی بہت موثر ہے۔ اس وقت میں خداوند کریم کی خصوصی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ آدمی جو مانگے وہی ملتا ہے۔ غرضیکہ جو عمل کیا جائے اسے بڑی خوبی اور بہترین طریقہ سے کیا جائے۔ اور جو عمل کرے اس وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ شاید میرا آخری یہی عمل ہے۔ اس کے بعد شاید میں کوئی اور عمل نہ کرپاؤں۔ غرضیکہ تجھے ہر معاملہ بڑی ہوشیاری سے کرنا چاہیئے۔ اس باب میں اور کیا لکھوں اتنا ہی کافی ہے۔ صلی اللہ علی محمد والہ اصحابہ واتباعہ ھداۃ طریق الحق ومحی علوم الدین ۔تمت

تکملۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احکام و عبادات اور تسبیحات وغیرہ کے اندر جو عدد کی مقدار ہے۔ وہ اپنے اندر متعدد اسرار کو متضمن ہے۔ لیکن ان کا صحیح راز و سر شارع کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ اور نہ ہی اس کی کنہ کو پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح چالیس کے عدد میں بھی کمال درجہ کی خاصیت اور اثر ہے۔ جو دوسرے اعداد میں نہیں۔ مثلاً۔ حدیث میں ہے۔ خمرت طینۃ ادم اربعین صباحًا۔ دوسری روایت میں ہے بعثہ اللہ علی راس اربعین سنۃً۔ اور قرآن کریم میں ہے تمّ میقات ربہ اربعین لیلۃً۔ اور اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ من حفظ علی امتی اربعین حدیثًا۔ اور من ادرك صلوٰۃ الجماعۃ اربعین صباحًا۔ یہ سب دلائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کے عدد میں ایک خاص تاثیر ہے۔ جو دوسروں میں نہیں۔ میں نے بھی اسی مناسبت سے چالیس مکتوب لکھ دیئے ہیں۔ اور جو اس سے زائد ہیں ان کو علیحدہ لکھ رہا ہوں۔ اگر وہ بھی چالیس ہو جائیں تو نورٌ علیٰ نور اور اگر چالیس تک نہ پہنچ سکیں تو ان چالیس کا تکملہ اور تتمیم ہی سہی۔ اور عنوان قائم کرنے میں کاتب کو اختیار ہے۔ اگر وہ چاہے تو آنے والے مکتوبات کو پہلے مکتوبات سے ملا کر لکھے یعنی اکتالیس۔ بیالیس وغیرہ۔ اور اگر چاہے تو ان کو علیحدہ عنوان دے کر ایک سے شروع کر دے۔ اور مقصود ہر دو نوں عنوان سے ایک ہی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مکتوب نمبر ۱۴۱

بنام شیخ نورالحقؒ

تنویر القمر لیلۃ البدر فی تصویر معنیٰ شرح الصدر

اللہ ورسولہ ۔ فمن شرح اللہ صدرہٗ للاسلام فھو علی نور من ربہ (پس جس شخص کا سینہ اسلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے کھول دیا ہو پس وہ اپنے رب کے نور پر ہے) جان لینا چاہیئے کہ شرح صدر اللہ تعالیٰ کی بخششوں اور عنایتوں میں سے ایک بخشش ہے۔ اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخصوص کیا ہے۔ اور سورت الم نشرح لک صدرک الخ کے اندر اسی احسان کا اظہار ہے۔ اور اس جگہ شرح صدر سے مراد توسیع اور تفصیح صدر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدر شریف میں اتنی فراخی اور وسعت فرمادی کہ اس کے اندر خداوند کریم کی توحید اور انوار و معارف علوم اور شریعت کے جمیع نشیب و فراز بھر دیئے گئے ہیں۔ اور ظلمت جہل کو دور کر دیا ہے۔ اور وحی کی لقاء میں تیسیر کردی گئی ہے۔ اور نبوت کے اس بار کو اٹھانے کا تحمل ہو گیا جس سے پشت کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا جسے بارے میں ارشاد ہے ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظھرک ۔ قال اللہ تعالیٰ افمن شرح اللہ صدرہٗ للاسلام فھو علیٰ نورٍ من ربہ ۔ کہ جس کسی کا اللہ سینہ کھول دیتے ہیں وہ اسلام کے قبول کرنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کرتا پھر اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو اپنے نور سے بھر دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ چوں کہ خود نور ہیں اس لئے اس بندے کے دل میں خدا تعالیٰ ہوتے ہیں یعنی اس کا قلب خدا تعالیٰ کے عشق سے لبریز ہوتا ہے۔ نیز نور سے مراد نور توحید اور نور ایمان ہے۔ کہ جب بندہ کے دل میں نور توحید اور نور ایمان موجزن ہوتا ہے۔ تو اس کے دل میں فرحت و سرور کی کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ اور جب وہ نور غائب ہو جاتا ہے تو دل سختی اور مشقت میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔ جیسے کہ نبی کریم صلے اللہ

علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اذا دخل النور فی القلب انفسح و انشرح قالوا یا رسول اللہ ما علامۃ ذالک النور قال الانابۃ الی دار الخلود والتجافی عن دار الغرور	کہ جب نور ایمان دل میں داخل ہوتا ہے تو دل فراخ اور کشادہ ہو جاتا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اس نور کی علامت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کی علامت یہ ہے کہ بندہ آخرت کی طرف متوجہ رہے اور دنیا سے جو دار غرور ہے اعراض کرے۔

اسی لئے بزرگوں کا کہنا ہے کہ عاشق کا نفس ناطقہ نور ہے۔ وہ اندرونی اور بیرونی چیزوں کو محسوس کرتا ہے۔ اور جس طرف توجہ کرتا ہے۔ نور ہی نور پاتا ہے۔ اور جب نفسِ ناطقہ تاریک ہو جاتا ہے تو وہ ہر جگہ ظلمت ہی ظلمت محسوس کرتا ہے اور اس کا دل ظلمتوں کی آماجگاہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اور نور حسی ہو خواہ عقلی وہ باری تعالیٰ کے نور کا پرتو اور عکس ہے۔ اس لئے کہ خود ارشاد باری تعالیٰ ہے اللہ نور السموات والارض اسی لئے اس نور کا ہر نور میں پرتو ہے۔ چونکہ ہر نور کا مبدأ نور باری تعالیٰ ہے۔ اسی بناء پر طالبان حق اپنے مربی اور منعم حقیقی کو دوست رکھتے ہیں ؎

چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم ۔ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نور کا ظاہر ہونا دل کی فرحت اور انشراحِ صدر کا سبب ہے۔ اور دوسرا شرح صدر کا سبب علم ہے۔ جس دل کے اندر علم جاگزیں اور جس صدر میں علم رونق افروز ہوتا ہے اس صدر کا ہر گوشہ زمین و آسمان کی وسعتوں سے وسیع تر ہوتا ہے۔ اور جتنا علم بڑھتا رہے گا اتنا ہی شرح صدر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور میری مراد علم سے ہر علم نہیں۔ بلکہ وہ علم مراد ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث ہے۔ اور انبیاء کی میراث علم کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوا کرتی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی قدر ہے

ان الانبیاء لم یورثوا درھمًا ولا دینارًا وانما ورثوا العلم	کہ انبیائے کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ تو علم کا ورثہ چھوڑ کر اسی کا وارث بناتے ہیں۔

لیکن ایک دراز زمانہ سے موہومات فلسفیہ کو علم میں داخل کر لیا گیا ہے جس نے دین اسلام کی فضاء کو تاریک بنا دیا ہے اور ایک طائفہ گم کردہ راہ ایجاد ہوا ہے جس پر جہل کا اطلاق بہت مناسب ہے۔ جس نے اسلام کے بہت سے بنیادی اور اساسی مسائل کو اپنے رنگ

میں بیان کرکے اسلام سے کھلی بغاوت کا ثبوت دیا ہے۔

حکمت یونانیاں پیغامِ نفس است وہوا　　　حکمت ایمانیاں فرمودۂ پیغمبر است

(یعنی اہل فلسفہ کی دعوت توان مسائل کی طرف ہے جو نفس اور خواہش سے اختراع کردہ ہیں۔ اور اہل اسلام ان مسائل کی طرف دعوت دیتے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ہیں) اے اللہ ہم ایسے علم سے پناہ مانگتے ہیں جو سودمند نہ ہو اور ایسے دل سے بھی پناہ مانگتے جو تیرا باغی ہو کر خوفزدہ نہ ہو۔ علم دین تو اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اور محبت حق کو شرح صدر میں بہت دخل ہے۔ اور علم چوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اسلئے جس کے اندر علم ہوگا اس کے صدر میں وسعت کا ہونا لازمی امر ہے۔ اور محبت حق بھی ایک قسم کی قید ہے۔ کہ اپنے وجود کو محب۔ محبوب کے دست قدرت کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور جو شخص محبت کے جال میں مبتلا ہو وہ محبوب کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا اس لئے اس کے صدر میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور بے محبت مثلِ شترِ بے مہار ہے اس کے صدر میں وسعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ تو اپنے نفس وہوا کا بندہ ہے۔ اور نفس وہوا کی اتباع سے تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ شرح صدر کے اسباب میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اور ایک سبب شرح صدر کا مخلوق خدا پر احسان کرنا بھی ہے۔ اور احسان جس قدر ممکن ہو کیا جائے مال سے تو ظاہر ہے۔ کہ جب ایک آدمی اپنے مال کو مخلوق خدا پر تقسیم کرتا ہے تو اس کے ہاتھ میں وسعت ہے۔ ہاتھ کی وسعت صدر کی وسعت پر دال ہے۔ یعنی جس کے صدر و سینہ میں وسعت ہوگی اس کا ہاتھ بھی وسیع ہوگا، اور جس کا ہاتھ کوتاہ ہوگا اس کا سینہ بھی کوتاہ ہوگا۔ اور سخاوت کا اللہ کے نزدیک بہت بڑا درجہ ہے اس سے دنیا و آخرت کی عزت اور سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اجر و ثواب وعزت و جاہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور احسان کے طریقوں میں سے ایک طریقہ تعلیم علم دین اور ہدایت راہِ حق میں مصروف ہونا ہے۔ اس سے تقویت اور تائید دین کی ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن پر لوگ رشک۔ غبطہ اور حسد کرتے ہیں۔ ایک مال جس کو اللہ کی راہ میں بندوں پر خرچ کیا جائے۔ اور دوسرا علم ہے کہ دین حق کے طالبوں کو پڑھایا جائے۔ اور شرح صدر کے اسباب میں سے ایک سبب شجاعت ہے۔ شجاعت سب خوبیوں کا سرچشمہ اور سب

نیکیوں کی مصدر ہے۔ اس لئے کہ ہر نیکی کو قوت اور مردانگی ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

اور شرح صدر کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے۔ کہ اپنے دل کو صفات ذمیمہ اور عادات شنیعہ مثل کبر و عجب۔ حسد و کینہ سے پاک کیا جائے۔ اس لئے کہ ان سب عادتوں سے دل میں ظلمت اور کدورت پیدا ہوتی ہے جس سے دل تنگ اور ضیق ہوتا ہے۔

جاننا چاہیئے کہ صدر اور قلب صوفیائے کرام کی اصطلاح میں دو عالم ہیں۔ ایک میں وسعت اور فراخی ہے۔ اور دوسرے میں اس کی نسبت کم وسعت ہے۔ جیسے کہ گھر میں ایک صحن اور دوسرا صحن کی فضا اور وہ ماحول جو اس کے ارد گرد ہے۔ جب گھر روشن ہوتا ہے تو اس روشنی سے سب گھر جگمگا اٹھتا ہے۔ اور اگر اس کی وہ روشنی گل کر دی جائے تو سب ماحول تاریکی کی لپیٹ میں آکر تاریک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عالم ملکوت کی چیزیں اولاً قلب پر اترتی ہیں پھر اس کے انوار و اسرار صدر پر اثر کرتے ہیں جس سے صدر منور اور روشن ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کو فتوح الغیب کی شرح میں زیادہ بسط و وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ان شئت فارجع ہم نے جو کچھ پہلے عرض کیا اس کا ملخص یہ ہے۔ کہ شرح صدر کے اسباب یہ ہیں۔ نور ایمان۔ نور توحید۔ نور علم۔ نور محبت۔ نور ذکر۔ نور احسان۔ نور شجاعت۔ نور طہارت قلب۔ اور ان سب صفات کا مجموعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہے۔ پھر آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پھر ان کے متبعین سب اپنی اتباع کے اندازہ سے شرح صدر سے حصہ پاتے ہیں یعنی جس کو نبی علیہ السلام اور صحابہ کرام کی متابعت زیادہ نصیب ہوگی اس کا شرح صدر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور جس کی متابعت کم اس کا شرح صدر بھی کم ہوگا۔ اور جو شخص وہاں قدم رکھے جہاں آپ نے قدم رکھا تو بے شک وہ شرح صدر میں وہ مقام حاصل کرے جو آپ کو ہوا۔ اگرچہ پھر اس مقام میں بھی تفاوت ہوگا کیوں کہ غیر نبی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

وصلی اللہ علی سیدنا المصطفیٰ الامین محمد والہ وصحبہ واتباعہ اجمعین ھذا طریق الحق ومحی علوم الدین۔

مکتوب نمبر ۴۲

بنام شیخ نور الحق رحمہ اللہ

تدقیق البیان فی ایجاب الشکر المزید واستلزامہ بحصول المحبۃ والتوحید

اللہ و رسولہٗ: زبان حال اور قال سے خداوند کریم کی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔ اور اس شکر گزاری کا فائدہ خود شاکر کو پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس پر کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی اللہ کسی کا محتاج ہے کہ کوئی اس کو فائدہ پہنچا سکے۔ فائدہ تو صرف شاکر ہی کی ذات کو ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ ومن یشکر فانما یشکر لنفسہٖ ومن کفر فان اللہ غنی حمید (یعنی جو شکر کرتا ہے وہ اپنی ذات کے لئے کرتا ہے اور جو کفران نعمت کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے بے پروا ہیں) یہ بھی اللہ کی رافت و رحمت کا کمال ہے کہ وہ شکر کرنے سے نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی رحمت بہانہ تلاش کرتی رہتی ہے۔ مزید غور کیا جائے تو شکر کرنے کی توفیق بھی تو اسی نے عنایت فرمائی ہے۔ اور اپنی توفیق سے نوازنے کے بعد ارشاد ہے کہ شکر کرنا تمہارا کام اور اس کے نتائج و ثمرات میں اضافہ کرنا میرا کام اور اجر و ثواب دینا میرا کام۔ ان سب چیزوں سے اللہ کا مقصود اپنی قدرت کاملہ کا ظاہر کرنا ہے کہ دیکھو میں نے اپنے بندہ کو مٹی سے پیدا کیا اور نفس خاک میں کوئی قدرت نہیں مگر پھر میں نے اس مٹی کے پتلے کو ایسی ایسی نعمتوں سے نوازا کہ جن کو دیکھ کر یہ خود حیران رہ جاتا ہے۔ اور اگر بندہ ان افعال کی نسبت اپنی طرف کرے تو سب اعمال و افعال مردود ہو جاتے ہیں۔ اور اگر عمل کرے اور اس میں توفیق کی نسبت اللہ کی طرف کرے تو ممدوح و منظور اور موجب تعظیم و تکریم ہوتے ہیں۔ اس سے ذرا ترقی کر کے عرض کرتا ہوں کہ جب بندہ اللہ کا شکر گذار ہوتا ہے۔ تو اللہ اس کے شکر گذار ہوتے ہیں جیسے خود ارشاد باری ہے فان اللہ شاکرٌ علیم۔ انہ غفورٌ شکورٌ اور شکورٌ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ جب بندے کا شکر سبب مزید نعمت کا ہے۔ تو خداوند کریم کا شکر سبب مزید محبت

اور عنایت کلا ہے۔ کہ اس سے بندہ کی خداوند کریم سے محبت اور اطاعت میں مضبوطی اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اللہ اور بندے کا تعلق یوں ہو جاتا ہے۔ یحبھم ویحبونہ کہ اللہ ایسے شکر گذاروں سے محبت فرماتے ہیں اور یہ لوگ اللہ سے اور اسی محبت اور یگانگت کا نام توحید ہے۔ اس سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ توحید غلبہ محبت اور ظہور یگانگت کا نام ہے۔ اس طرح کہ محب کی نظروں میں سوائے محبوب کے اور کوئی نہ سما سکے۔ اور بعض ارباب تمکین کا کہنا ہے کہ توحید شہودی ہوتی ہے نہ وجودی یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر یہ خاصیت رکھی ہے کہ یہ جس سے محبت کرتا ہے۔ وہ چیز اس پر جب غلبہ کرتی ہے تو یہ عین وہی چیز بن جاتا ہے۔ اور محبوب کے علاوہ مابقیہ سب چیزیں اس کی نظروں سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ اس کو شہود کہتے ہیں۔ میں اپنی قلم کی جولانی میں بہت دور نکل گیا۔ اصل بات شکر کی کر رہا تھا۔ یہ بات مسلمات میں سے ہے۔ اور مزید برآں اس پر نص بھی موجود ہے۔ کہ شکر کرنے سے خدا کی نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا شکر اس لئے نہ کرے کہ نعمتوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ اگرچہ یہ بات شرعاً ممنوع نہیں۔ مگر اہل تصوف اور سالک لوگوں کا عقیدہ اور یقین ہے کہ ہر حال میں خداوند کریم پر نظر رکھی جائے۔ کیوں کہ جب اللہ کی ذات کی خوشنودی اور رضا حاصل ہو جائے تو سب چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہ مشہور ہے کہ من لہٗ المولیٰ فلہٗ الکل (کہ جس کے اللہ ہو گئے اس کا سب کچھ ہو گیا)، اس لئے کہ نعمت اور ہے اور خدا تعالیٰ اور ہیں۔

اور جو شخص محض حصول نعمت کی خاطر شکر گذار ہے۔ وہ طالب حق نہ ہوا بلکہ وہ طالب نعمت ہے۔ اس لئے شکر محض خدا کی رضا جوئی کی خاطر کیا جائے۔ اور اس کے ضمن میں نعمتیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ جیسے کہ ایک شخص کسی بادشاہ سے کچھ زمین طلب کرتا ہے۔ اور دوسرا بادشاہ کی رضا ان دونوں میں فائدہ میں وہ ہے۔ جس نے بادشاہ کی رضا طلب کی۔ اس لئے کہ جب اس سے بادشاہ راضی ہے تو جو چاہے اس سے لے لے۔ بلکہ اس کو چاہنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی خود بخود بادشاہ اس کا خیال رکھے گا۔ اور جس نے کچھ زمین پر اکتفا کیا وہ اس شخص کے مقابلہ میں خسارہ میں رہا۔ یہی نسبت بندہ کو خداوند کریم کی ذات سے ہے۔ کہ اگر بندہ اللہ

سے اس کی ذات کے علاوہ کسی اور چیز کو لے کر اسی پر اکتفاء کر لیتا ہے۔ تو وہ اس شخص کی نسبت خسارہ میں ہے جس نے اللہ سے اللہ کی ذات اور اس کی رضا کا مطالبہ کیا۔ اس لئے کہ جب اللہ بندے کے ہو گئے تو سب چیزیں بندہ کی ہیں۔ اور اللہ کی نعمت کے شمار میں عدد کو دخل ہے وہ عدد اگرچہ بے شمار ہو اور اللہ تعالےٰ کی ذات میں عدد اور شمار کو دخل نہیں۔

والعاقبۃ بخیر

مکتوب نمبر ۴۳

بنام شیخ نورالحقؒ

تحقیق الدعا والاستمداد بلسان القال والحال والاستعداد

اللہ ورسولہٗ۔ دعا ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے انسان کی زندگی کے اکثر کٹھن مرحلے حل ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ہر وقت خداوند عالم کی درگاہ میں دعا مانگتے رہنا چاہیئے۔ پھر اگر کوئی سوال کرے کہ انسان کے مقدرات تو روز اول سے تقدیر میں لکھے جاچکے ہیں۔ دعا کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ تو چاہیئے کہ دعا ہرگز نہ کی جائے جب کہ اس سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا تو جواب اس سوال کا یہ ہے کہ تقدیر برحق ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ ہماری تقدیر میں بعض ایسے امور بھی مندرج ہوں جن کا حل تقدیر میں دعا ہی لکھا ہو اس لئے دعا سے اجتناب اور احتراز حماقت سے خالی نہیں بلکہ اس کا التزام خیروبرکت سے خالی نہیں۔ اس موضوع پر بزرگانِ امت نے متعدد کتب تحریر فرمائی ہیں تفصیل ان میں موجود ہے۔ اس لئے میں اس کی تفصیلی بحث کی طرف نہیں جاتا البتہ جو بات یہاں عرض کرنے کی ہے وہ یہ ہے۔ کہ مومن کو اصل حکم ایمان لانے کا ہے۔ اور جتنے امور شرعیہ ہیں ان کا امتثال کیا جائے۔ پھر ان احکام کے علل عقل میں آئیں یا نہ آئیں اس سے سروکار نہ ہو۔ بلکہ میں اس سے ترقی کرکے عرض کروں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جب آدمی ایمان لے آئے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کی عقل میں کوئی بات نہ آئے ایمانی قوت میں ایک ایسی تاثیر ہے کہ اس کے حامل کو سب امور روز روشن کی طرح واضح ہوجاتے ہیں اور وہ بلاچون چرا ان پر عمل پیرا رہتا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے ارشاد ہو کہ ہر چیز میری پیدا کردہ ہے تو ہم آمنا وسلمنا کہیں اور اگر ارشاد ہو کہ تمہارے تمام افعال تمہارے قبضہ اور اختیار میں ہیں تو اس کا جواب بھی آمنا وسلمنا سے دیں اور اگر ارشاد ہو کہ تمام نیک کام میری طرف سے ہوتے ہیں اور بُرے کام تمہاری طرف سے تو اس کا جواب بھی باس الفاظ دیں والخیر کلہ بیدک والشر لیس منک

(کہ اے اللہ بھلائی کا صدور تیری جانب سے ہے اور برائی تیری طرف سے نہیں) اس کا نام بندگی اور ایمان ہے۔ اور باقی سب جہالت اور جنون ہے ؎

مزن ز چون و چرا دم کہ بندۂ مقبل   قبول کرد بجان ہر سخن کہ جانان گفت

(یعنی اللہ کے مقبول بندے اس کے سامنے چون و چرا نہیں کرتے۔ مقبول اور بزرگ لوگوں کا طریقہ تو یہ ہے کہ جو دلبر کہے اس کو قبول کیا جائے) اس جہاں میں تو اس قدر سمجھنا کافی ہے۔ کہ اپنی عقل و فہم کو اوامر و نواہی کے تابع کر کے خاموشی اختیار کی جائے۔ اور اس سے دعا کر اور اس کی اجابت کی امید رکھ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کے قبول کرنے کا باین الفاظ وعدہ فرمایا ہوا ہے۔ واسألوا اللہ من فضلہ۔ ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین۔ عن عبادتی سے مراد اس جگہ دعا ہے۔ اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کی حد ہو گئی کہ طالبوں کو ارشاد ہے کہ مجھ سے مانگو؟ میں دوں گا۔ تمہارا کام ہے مجھ سے مانگتے رہنا اور میرا کام ہے نوازتے رہنا۔ تم میری درگاہ میں آہ و بکاء کرو میں تمہاری کلفتوں اور تکلیفوں کو دور کردوں گا۔ اور یہ دعا تو انبیائے کرام اور ان کے متبعین اور پیروکار لوگوں کا کام ہے۔ اور یہ لوگ کھاتے۔ پیتے۔ سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے سفر اور حضر میں اللہ سے دعاء کرتے رہتے ہیں۔ اور ہر کام کے لئے ایک مخصوص دعاء کرتے ہیں۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر حالت کی دعاؤں کو علمائے محدثین نے ضبط کیا اور لکھا ہے۔ بندہ کی ذات کے لائق تو دعاء کرنا اور مانگتے رہنا ہے۔ اس لئے کہ یہ چار صفتوں سے موصوف ہے۔ فقر۔ ضعف۔ عجز خواری اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ میں چار صفتیں ہیں۔ غنا۔ قوت۔ قدرت۔ عزت اور بزرگوں کے نزدیک بندہ کے اوصاف اللہ کی صفتوں کا پرتو اور عکس ہیں یعنی بندہ کے اندر جب اس کی اپنی صفات کا تحقق اور ثبوت بطریق اکمل ہو جاتا ہے تو پھر خدا تعالےٰ کے انوار و صفات کا اثر اس کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اور جب انسان ان چار صفتوں کا خیال رکھتا ہے تو اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شمار ہونے لگتا ہے اور اللہ کے اوصاف اسکے اندر روشن ہوتے ہیں۔ یعنی اس کی تاریکی روشنی سے بدل جاتی ہے۔ اللہ کے اوصاف کا اس کے اندر اثر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ العیاذ باللہ وہ خود خدا کے اوصاف سے موصوف ہو جاتا ہے۔ یا اللہ اپنی صفات سے اپنے بندہ میں حلول کر لیتے ہیں اور پھر وہ بندہ اللہ

کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے حاشا و کلا اللہ کی صفات ہرگز ہرگز کسی میں منتقل نہیں ہوتیں اور کسی دوسری جگہ حلول نہیں کرتیں۔ بلکہ اللہ کی صفات کا عکس اور پرتو بندہ پر پڑتا ہے جس سے اس کی ظلماتی صفات انوار و تجلیات سے بدل جاتی ہیں (جیسے امام رازی ؒ انسان کی تحقیق فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ انسان۔ مجموعة اعدام مع عکوس ملکات کا نام ہے کہ اللہ کی کوئی صفت بھی انسان میں نہیں یہ اللہ کے مقابلہ میں معدوم محض ہے البتہ اللہ کے ملکات کا اس پر پرتو اور عکس پڑتا ہے از مترجم بندہ محمد فاضل عفا اللہ عنہٗ) بندہ کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ اللہ کے دربار میں سوال و دعا کرتا رہے۔ اس لئے کہ اللہ رب العالمین ہے پھر سوال ہوتا ہے کہ بندہ خدا سے کیا طلب کرے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا کہ اللہ سے عافیت کا سوال کر اس لئے کہ عافیت محبوب ترین چیزوں میں سے ہے۔ اہل عرف کے نزدیک تو عافیت صرف تندرستی کو کہتے ہیں لیکن اخص الخواص کے نزدیک عافیت کا مفہوم عام ہے جو سب ظاہری اور باطنی نعمتوں کو شامل ہے۔ یعنی عافیت دنیا اور آخرت کی سب آفات سے محفوظ و مامون رہنے کا نام ہے۔ اور اخص الاخص لوگوں کے نزدیک عافیت سکون قلب اور تعلق مع اللہ کا نام ہے۔ اور عام لوگوں کے نزدیک عافیت تندرستی اور لذات و مال و منال کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ سب لوگوں پر مہربانی فرمائیں اور جمیع احوال میں عافیت سے رکھ کر ظاہری و باطنی حسی اور عقلی نعمتوں سے مالامال فرمائیں اور تمام لوگوں کی تمام مشکلوں کو حل فرمائیں۔ اور انجام تمام کاموں کا خیریت سے ہو۔ آمین ✣

مکتوب نمبر ۴۴

بنام شیخ نورالحقؒ

طی لسان القلم ببیان لاراحۃ الافی القدمِ العدم

اللہ ورسولہ۔ میں اپنے حالات کو کیا لکھوں۔ اس کمزور اور ضعیف کی جان پر اتنے غم و رنج پڑے ہیں کہ راحت وخوشی سب غائب ہوگئے اور مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ اس کا علاج کیا ہے۔ البتہ قلم اس کے علاج کو جانتا ہے اور اس کے ہاتھ میں اس کا علاج ہے لیکن وہ بھی اس نسخہ کی ترکیب سے عاجز ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آدم زاد کے لئے یہ دنیا راحت و آرام کی جگہ نہیں۔ اور اگر کوئی آرام اور راحت کو چاہتا ہے تو وہ اپنی ذات کو معدوم کردے۔ اور عالم نیست کے منازل طے کرے اس لئے کہ اُس جہان میں کوئی ارادہ اور خواہش باقی نہیں رہتی اور ظاہر ہے کہ رنج وغم تو ارادوں کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے لاحق ہوتے ہیں جب کوئی ارادہ اور خواہش ہی نہ رہے گی تو غم بھی نہ آئے گا۔ لیکن اگر کوئی سوال کرے کہ خواہشات اور ارادوں کو ترک کرکے نیستی کا ارادہ کرنا بھی تو ایک خواہش اور ارادہ ہے تو جو مقصد ہے وہ تو اس سے بھی حاصل نہیں تو اس کا جواب رسالہ ترک تدبیرو اختیار میں شافی اور وافی دیا گیا ہے۔

اور بزرگوں کا کہنا ہے کہ لاراحۃ الافی القدم اولعدم۔ مراد عدم سے وہ حالت ہے جو انسان کی پیدائش سے قبل کی ہے یعنی جب انسان وجود میں نہیں آیا تھا اور جب یہ وجود میں آیا تو مصائب و آلام کی سلاسل میں مقید اور محبوس ہو کر رہ گیا۔ لیکن اے عزیز؛ اعدام کو بھی آرام نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی جوش وخردش سے خداوند کریم کے ارشاد کن فیکون کا انتظار کررہے ہیں کہ کب ارشاد ہو اور ہم وجود میں آئیں۔ پھر بزرگان ملت نیستی اور عدم کی تین علامتیں بیان کرتے ہیں اول فناء از خلق کہ وجود و عدم۔ مدح وذم۔ منع وعطاء مساوی ہوجائے۔ دوئم۔ فناء از ہوائے نفس۔ کہ نفس ظاہر و باطن میں شریعت

کے احکام کا تابع ہو جائے۔ اس لئے کہ حدیث میں آتا ہے لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ۔ اور سوئم۔ فنا، از ارادہ۔ کہ کوئی ارادہ اور آرزو خداوند کریم کی ذات کے شہود کے علاوہ نہ رہے غرضیکہ فناء سے مراد یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن اپنی آرزوؤں کو ختم کرنے میں ابتداءً احکام شرعیہ کی ضرورت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی تجویز سے شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کر گزرے۔ اس بات پر ایمان اور یقین رکھنے کے باوجود میں حیران ہوں کہ یہ کیفیت کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ سب چیزیں مجھے محالات میں سے نظر آتی ہیں۔ اس لئے میں نا امید ہوں۔ مگر باوجود نا امید ہونے کے خداوند کریم کی ذات سے امید وابستہ ہے۔ کہ شاید وہ اس عقدہ کو اپنے فضل و کرم سے حل فرما دیں آج نہیں تو کل سہی بس یہی امید لئے بیٹھا ہوں۔ اور فردا سے میری مراد قیامت کا دن ہے۔ اور یہی فردا امید کا آخری درجہ ہے۔ اور ابتداء اس کی ہر اس سانس سے شروع ہو جاتی ہے۔ جو اس زندگی میں لیا جاتا ہے۔ اور اس دم اور سانس کے آخر سے روز قیامت حشر و نشر شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد بہشت میں داخلہ ہوگا یہ ایسی نہایت اور انتہاء ہے کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہنا ہوگا پس طالب ہمیشہ اسی کی امید رکھتا ہے۔ اس میں نا امیدی کہاں ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ طالب کے لئے نا امیدی امر محال ہے۔ تو ان بزرگوں کی باتوں پر کیسے عمل کروں جو کہتے ہیں کہ نا امیدی اور نیستی اصل الاصول ہے۔ اس لئے میں یونہی کہوں گا کہ میرا درد ازلی اور ابدی ہے جس کا علاج کہیں موجود نہیں۔

اس لئے آہ و بکا اور واویلا اختیار کیا جائے شاید خداوند کریم مدد دستگیری کرے اور یہ عقدہ حل ہو جائے۔ جس سے اس ابدی اور ازلی درد سے خلاصی اور نجات نصیب ہو۔ اور عاقبت کی انشاء اللہ خوشی نصیب ہو۔

مکتوب نمبر ۴۵

بنام شیخ نورالحق ؒ

اظہار الحسرۃ والاستبعاد بتقصیر النفس فی اصلاح المبدأ والمعاد

اللہ ورسولہ۔ یہ حسرت نامہ بندۂ مہجور و مبعود کا ہے جو نیستی اور فناء کی سلاسل میں مقید و محبوس ہے اور جس کے راستہ میں تردد اور پریشانی حائل ہے۔ اگر ایک ساعت بھی فناء اور نیستی سے رہائی پالوں تو اپنی جان کو خلوت اور وحدت سے آرام دوں۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز میں راحت و آرام نظر نہیں آتا۔ غفلت اور سستی کی خدا سے پناہ مانگ اور اس کو ترک کردے تاکہ آرام پائے۔

عزیز من ؒ۔ اپنی زندگی اور وجود کا کارخانہ تو ختم ہوچکا ہے۔ اور حوصلہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس لئے مخلوق سے اختلاط اور صحبت کو دل نہیں چاہتا گویا کہ میری کیفیت نیم مردہ کی سی ہے لا یموت ولا یحییٰ جس کو نہ زندوں میں اور نہ ہی مردوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ جب میں ایسی مشکلوں سے دوچار ہوں تو راحت و آرام کہاں سے نصیب ہو۔ اور نظر عمیق کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہو کہ خاتم ان ہی حالات کی فرع ہے۔ اس پر نظر کرتا ہوں تو دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک غم واندوہ اور دوسرا خوشی وراحت۔ اگر بجانب اندوہ اور غم چلے گئے تو خوشی ہرگز ہرگز نصیب نہ ہوگی اور اگر بجانب خوشی چلے گئے تو فارغ بیٹھیں گے جس سے سب غم اور اندوہ ختم ہوجائیں گے غرضیکہ اپنی کیفیت یہ ہے کہ غم اور خوشی امید و بیم کی کش مکش میں مبتلا ہوں اور آخر اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ دنیا کی زندگی تو اندوہ اور بیم کا نام ہے۔ جب آخر دم ہوگا تو خوشی اور امیدواری نصیب ہوگی۔ لیکن ایک مشکل اس دنیا کے کارخانے میں انسانی طبائع کے لئے یہ ہے۔ کہ باوجود اس بات کے کہ انسانوں کو ایقان و ایمان ہے اور ہر خیر اور برائی کو اچھی طرح جانتے ہیں مگر جب عمل کی باری آتی ہے۔ تو غفلت سے کام لیکر نفس اور شیطان کے متعین کردہ راستوں کو اختیار کرتے ہیں۔ اور خدا کے احکام پر

عمل نہیں کرتے۔ اور نفس و شیطان کی چالوں میں پھنس کر سب جانا نہ جانا کر دیتے ہیں اور جو یاد ہے اس کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور بالفرض اگر عمل بھی کیا جاتا ہے تو وہ خلوص اور صدق سے خالی ہوتا ہے۔ اور اگر عمل میں خلوص بھی آجائے تو پھر اور ہزاروں خطرات راستے میں حائل ہو جاتے ہیں جیسے مشہور ہے کہ المخلصون خطرٌ عظیمٌ کہ مخلص لوگوں کے لئے بڑے بڑے خطرات ہیں جب یہ راستہ اس طرح پُر خطر ہے تو اس کو کس طرح عبور اور طے کیا جاسکتا ہے سبیل اس کی یہ ہے کہ اس راستہ میں دیکھے نہ دیکھے چلتا رہے اور راستہ میں جو سختی اور نرمی دشواری و آسانی آئے اس سب کو برداشت کرے جب صبح ہوئے پھر دیکھ کہ میری زندگی کی کشتی کس کنارے پہنچ چکی ہے۔ اور راستہ میں خداوند کریم کی توفیق کا مطالبہ کرتا رہے۔ اور شریعت کے جو اصول ہیں ان کے نقش پا کو مشعل راہ بنائے

لیک بپائے تو رود ہر کہ رود بکوئے تو

(یعنی جو اپنے محبوب کے گلی کوچوں میں جانا چاہے وہ اپنے محبوب کے نقش پا کو مشعل راہ بنائے) جب اس طور پر تو اپنے راستہ کو عبور کرے گا جب صبح ہو گی تو اپنے رب کے جمال کو بلا پردہ مشاہدہ کریگا۔ اور ہر چیز کی حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ اور ہر چیز اس کے نور کے پرتو سے روشن ہو جائے گا

ہر سرّ کہ بتاریکی شب پنہاں بود در پرتو روئے او عیاں بنماید

(یعنی رات کی تاریکیوں کے سبب جتنی چیزیں مستور اور پوشیدہ تھیں وہ سب تیرے چہرے کے پرتو سے ظاہر ہو گئیں) اگر تیرا مقصد کام کرنا ہے تو اس بیان کردہ راستہ سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں اور اگر محض حیلہ گری اور بہانہ جوئی ہے تو اس کا راستہ دوسرا ہے اللہ ربی و ربکم فاعبدوہ ھٰذا صراطٌ مستقیمٌ۔ لیکن اس زمانہ میں تو لوگوں کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ ہے اور اکثر لوگ اس سے غافل ہیں بلکہ سب دنیا کو کہوں تو مبالغہ نہیں ہو گا جو اپنی خواہشات نفسانیہ کا شکار ہو کر اس بات کو قطعاً نہیں جانتے کہ ان کو کس راہ پر چل کر منزل مقصود تک پہنچنا ہے لیکن ایک دن آنے والا ہے جس میں سب کرتوت ظاہر جائینگے

فسوف تریٰ اذا انکشف الغبار افرسٌ تحت رجلک ام حمار

(یعنی عنقریب تجھے معلوم ہو جائے گا جب غبار وغیرہ ختم ہو جائے گی کہ تو گھوڑے پر سوار ہے یا گدھے پر) سلوک کے کارخانہ کی بناء فنا میں مضمر ہے جس کی تفصیل یوں ہے۔ اولاً تو اس طرح

ہوجا کہ مخلوق کو نفع و نقصان میں دخل انداز نہ سمجھ اور کسی کی تعریف سے خوشی اور برائی سے افسوس نہ کر (اس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں فناء از خلق کہتے ہیں) اور دوئم فناء نفس ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنے نفس پر اس طرح قابو پالے کہ ہر معاملہ میں وہ شریعت کی راہوں پر چلنے کا عادی ہوجائے اور سوئم فناء آرزو ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تیری کوئی آرزو اور خواہش نہ رہے۔ لیکن ان سب کا مرکز فنائے نفس ہی ہے جب یہ حاصل ہوجائے تو سب حاصل ہوجاتی ہیں غرضیکہ خلاصہ تمام فناؤں کا فنائے نفس ہے۔ جیسے سلطان العارفین بایزید بسطامیؒ کے بارے میں مشہور ہے۔ کہ وہ ایک دفعہ اللہ تعالے کی دربار میں پہنچے مگر ان کے پہنچنے پر اندر جانے کے راستے بند کردئے گئے۔ آپ نے چیخنا چلانا شروع کردیا اور عرض کیا کہ اے الٰہ العالمین مجھے باہر کیوں روک دیا گیا ہے۔ تو جواب میں اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا دع نفسك و تعال۔ یعنی اپنے نفس کو چھوڑ دے اور آجا۔ اتنی بات سمجھنے کے بعد اس بات کو ذہن نشین کرلیا جائے کہ نفس کو چھوڑنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی صفات کو چھوڑ دیا جائے جو بغض۔ عداوت۔ ریا۔ کینہ۔ حسد۔ ناز و نخوت وغیرہ ہیں۔ اس لئے کہ یہ سب تاریکی ہیں اور جب تاریکی آتی ہے تو نور و روشنی خود بخود غائب ہوجاتی ہے۔ اور جب تاریکی جاتی رہتی ہے تو روشنی آتی ہے۔ جیسے ارشاد ہے اللہ ولی الذین امنوا یخرجھم من الظلمات الی النور۔ اللہ نور السموات والارض۔ فنائے نفس کا یہ مطلب ہے نہ وہ جیسا کہ آجکل بے دین لوگ کہتے ہیں کہ ہمہ اوست۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس کا نام توحید رکھتے ہیں اور شریعت کے اوامر و نواہی کا ذرہ برابر خیال نہیں کرتے۔ اور جو ان کے دل میں آئے بکتے رہتے ہیں۔ اور جو چاہتے ہیں کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے کو درویش اور صوفی بھی کہتے ہیں۔ اللہ ہر مومن کو ان لغویات سے محفوظ رکھے۔ یہ فنائے نفس نہیں بلکہ اتباع نفس ہے۔ اور اس کو صوفیت کا نام دینا محض دھوکہ ہے یہ لوگ بڑی گمراہی کے مرتکب ہیں ان ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد باری ہے الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا۔ اس زمانے میں ہر شخص نفس کے فریب میں آکر اپنے گمان و خیال پر راضی اور مغرور ہے۔

علماء کو اپنے علم اور عمل پر۔ امراء کو مال و منال پر۔ درویشوں کو حقائق و معارف پر

زاہدوں کو زہد ریاضت پر۔ عابدوں کو طاعت و اطاعت پر اور اغنیاء کو جود و سخاوت پر اور فقراء کو صبر و قناعت پر ناز ہے۔ یہ سب اگرچہ نیک و پسندیدہ ہے۔ لیکن ان میں اگر ذرا سی نفس کی آمیزش ہوگئی تو سب کا سب غارت اور برباد ہوجائے گا۔ اگر ان سب اوصاف کے حامل میں عجب وغیرہ پیدا ہوجائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ وہ استغفار اور توبہ کرے اور اپنے نفس پر مزید ریاضت اور مجاہدہ کا بار ڈالے۔ اس سے وہ ظلماتی کیفیت ختم ہوکر نورانی حالت سے متبدل ہوجائے گی جیسے منقول ہے کہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس اللہ روحہٗ نے اپنے وقت کے کسی شیخ طریقت سے یہ سوال کیا کہ حضرت ایسی صورت حال کے اندر مجھے کیا کرنا چاہیئے جبکہ عمل کرتا ہوں تو ریاء آجاتی ہے۔ اور اگر ترک کرتا ہوں تو بیکار بیٹھنا پڑتا ہے جس کو پسند نہیں کرتا انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا اعملوا و استغفروا۔ کہ عمل کے اندر مصروف رہو پھر اگر عمل کرتے وقت کوئی ناجائز بات صادر ہوجائے تو اسکے لئے استغفار کرو خصوصاً فرائض و واجبات کہ ان کو ادا کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ اگرچہ اس کے اندر نفس کی دخل اندازی بھی سرایت کر جائے۔ اور عجب و ریاء بھی آجائیں یہ معنیٰ ہیں اس قول کے جو بزرگوں سے منقول ہے کہ فرائض کے اندر ریاء کو دخل نہیں۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اس جہان میں کام کرنے کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ اور اس کی جزاء دوسرے جہان میں عنایت فرمائیں گے یہ جہان کھیتی کرنے کا ہے اور وہ جہان اس کھیتی کے کاٹنے کا ہے۔ جیسے ارشاد نبوی ہے الدنیا مزرعۃ الاخرۃ۔ کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

از مذاہب مذہب دہقان خوش است اے مولوی ✣ مذہب دہقان چہ باشد ہرچہ کاری بدروی

اور حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل کی جزاء دنیا میں بھی ہے۔ اور ہر وہ چیز جو آدمی کو خوشی۔ غمی۔ نیکی اور اندوہ وغیرہ پہنچتی ہے۔ وہ اس کے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور بہترین جزاء جو دنیا کے اندر طالبوں کو مطلوب ہوتی ہے۔ وہ توفیق عمل طلب صدق۔ انشراح صدر۔ فراخی وقت نورانیت باطن اور بیداریٔ دل وغیرہ ہے۔

والعاقبۃ بالخیر

مکتوب نمبر ۴۶

بنام شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

حُرْقَۃُ الْجَنَانِ بِتَمَنِّی الْکَشْفِ وَالْعَیَانِ

اللہ ورسولہٗ، متعدد بار قلب و جگر میں اس بات کا جوش آیا۔ کہ دل کی چیزوں کو ظاہر کروں اور اپنی طاقت سے جتنا ظاہر کرسکتا ہوں ظاہر کروں۔ مگر اس خیال کو آئے ابھی ایک ساعت نہ گذرتی کہ کوئی دوسرا کام پیش آجاتا اس میں مصروف ہوا تو وہ جوش و خروش دب جاتا جس سے وہ سب چیزیں ذہن سے نکل جاتیں۔ اور اگر وہ نہ بھی نکلتیں توجہ پہلی بار ذوق ہوتا وہ نہ رہتا اس لئے ان کے ظاہر کرنے کو جی چاہتا کیوں کہ ذوق سے مضمون رنگین ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے پر بھی وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو قلم کش پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس ارادہ کا ظہور معرض وجود میں نہ آسکا۔ پھر یہ مکتوب اس حال کے مکشوف ہونے کا سبب بنا حقیقت میں دل کی بات یہ تھی کہ خداوند کریم سے ہمیشہ آپ کے دیدار کا سوال رہا اور بار بار یوں ہوا کہ اللہ سے سوال کیا گیا رَبِّ اَرِنِیْ۔ مگر پھر یہ سوال اور وسوسہ آیا کہ کہیں یہ اس بات میں تو داخل نہیں کہ لولا یکلمنا اللہ او تاتینا آیۃ اس خیال کے آتے ہی دعاء کرنے میں تردد اور تذبذب پیدا ہوتا مگر پھر اللہ کا فضل و کرم دستگیری کرتا اور دل کو اس سے تسلی ہوتی کہ میرا سوال اس لئے نہیں کہ مجھے اللہ کی ذات میں اشکال ہے۔ بلکہ لیطمئن قلبی تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔ جب اس سے خلاصی ہوتی تو نفس و شیطان درپے ہوتے اور اس کی دلیل اور حجت کا مطالبہ کرتے کہ تو آخر یہ سوال کیوں کرتا ہے۔ اس دلیل کیا ہے۔ جب دلیل سمجھ میں نہ آتی تو پھر رک جاتا۔ لیکن اس موقعہ پر بھی خدا کا فضل و کرم معاونت کرتا اور ان کو یوں کہتا کہ اس راستہ پر چلنے والوں کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت نہیں میں بغیر دلیل و حجت کے یہی مطالبہ کرتا رہوں گا۔ اور خدا تعالیٰ سے بایں الفاظ معافی مانگتا رہونگا

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔ پھر نفس یہ شبہ پیش کرتا کہ اس کا فائدہ کیا ہے۔ تو اس کو یہ جواب دیا جاتا کہ اس راہ پر چلنے والوں کے پیش نظر فائدہ نہیں ہوتا وہ اپنے محبوب کے عشق و محبت میں سب کچھ کرگزرتے ہیں اس کا ظاہراً فائدہ ہو یا نہ ہو اس سے ان کو سروکار نہیں۔ اور پھر یہ شبہ ہوتا کہ بعض اوقات انسان اپنے حالات کو ظاہر کر کے بعد میں کسی غلطی کی وجہ سے اس پر تاسف کرتا رہے۔ کہ اگر میں اس کو ظاہر نہ کرتا تو یوں نہ ہوتا اس لئے نفس کہتا کہ تو ان چھپے ہوئے حالات کو ظاہر نہ کر مگر میرے خدا نے ان سب شبہات سے غیر ملتفت کر کے اپنی طرف لگا لیا یہ سب اسی کا فضل و کرم ہے۔ مضمون معلوم شد دیگر بس است۔

مکتوب نمبر ۴۷

بنام شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

طیب المذاق بوجدان الذوق فی مقام الاطلاق

اللہ و رسولہٗ۔ عذر تقصیر احوال کا کیا پیش کروں۔ اور اگر ان حالات کو قدرے تفصیل سے گوش گذار کروں یا دائرۂ قلم میں لاؤں تو ایک قسم کی خودستائی نظر آتی ہے۔ اور اس فقیر کے مشاغل اتنی کثرت سے ہیں۔ کہ ان کی قید سے نجات ناممکنات میں سے ہوگئی ہے۔ میں ایسی قید میں ہوتے ہوئے خداوند کریم کا شکر گذار ہوں۔ اور اگر کسی وقت اپنے نفس کی قیودات میں مبتلا کر دیا جاؤں تو اس سے مجھے ہرگز خوشی نہ ہوگی۔ اللہ تعالٰی سب داناؤں کے دانا اور حکیموں کے حکیم ہیں۔ انہوں نے امر ونہی کے جو قیود اور شریعت کے جو دستور اور قواعد اور اپنے وصل تک کے لئے جو راستے متعین کرکے ہم کو ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا ہے۔ تو حقیقت اس غلامی اور قید کی آزادی اور بے قیدی ہے۔ اگر انسان اپنے کو ان چیزوں کا قیدی بنالیتا ہے۔ تو اس جہان سے رخصت ہونے کے بعد جب دوسرے جہاں میں جسکو جہانِ آخرت کہتے ہیں، پہنچے گا۔ تو اس سے وہاں سب قیود اٹھالی جائیں گی اور آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ اس لئے میں ان قیودات میں مقید ہوکر فرحاں و شاداں ہوں۔ بلکہ خداوند کریم کی ذات کی طرف نظر کرتا ہوں تو اپنی نیازمندی اور نقیری یوں عیاں ہوتی کہ اگر معمولی قسم کا بھی کوئی شخص میری طرف نظر کرم کرتا ہے تو اپنی سعادت مندی تصور کرتا ہوں۔ کہ جس خدا کی قیود میں مقید رہ کر یہاں عزت ہوتی ہے۔ اور لوگ اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ تو وہ خدا اس جہان میں کیوں نہ مہربانی اور کرم کا اظہار فرمائیں گے (اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے مسئلۂ وحدت الوجود کو قدرے بسط سے بیان فرمایا ہے چونکہ وہ موجودہ دور کے خواص وعوام دونوں قسم کے لوگوں کی عقلوں سے بالاتر ہے۔ اس

لئے اس کو قصداً ترک کر دیا گیا ہے۔ اور ترک کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ اس مسئلہ سے کسی قسم کی نفرت ہے۔ اگرچہ سمجھ سے بلند ہے مگر غلط قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اکثر اکابرین امت کا یہ نظریہ کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور خود شاہ صاحب اسی جگہ فرماتے ہیں۔ کہ عارفوں اور سالکوں کا یہی نظریہ ہے۔ چوں کہ اس پر کسی دینی مسئلہ کا مدار نہیں اس لئے اگر کوئی تسلیم نہ کرے تو اس پر معصیت کے ارتکاب وغیرہ کے فتوے سے گریز کیا جائے۔ از مترجم ۱۲)

مکتوب نمبر ۴۸

بنام شیخ ابوالمعالی قدس سرہ

حراسۃ الایمان عن مکائد النفس والشیطان

اللہ ورسولہٗ۔ آدمی بیچارہ حوادث ومصائب میں یوں گھرا ہوا ہے۔ کہ باوجود قادر ہونے کے عاجز۔ عالم ہونے کے جاہل اور قوی ہونے کے ضعیف۔ غنی ہونے کے فقیر ہے۔ اس کے اندر علم وقدرت۔ قوت وغنا کیسے اور کہاں سے آئے۔ جب کہ اس کو اس کا بھی علم نہیں کہ یہ کہاں سے آیا۔ اور کہاں جائیگا۔ اس کا انجام کار کیسے ہوگا جب اس کو اپنے وجود سے متعلقہ چیزوں کی خبر نہیں وہ علم کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے۔ اور اگر اس سے کہا جائے کہ ایک مکھی بنادے تو اس کے بنانے کی طاقت نہیں رکھتا پھر قادر ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے۔ غرضیکہ نہ اس میں ثروت وغنا اور نہ علم و قدرت اس طرح ہیں کہ یہ ان کا بالاصالۃ دعویٰ کرسکے۔ البتہ یہ مجبور محض بھی نہیں کہ کسی کام کو کر بھی نہ سکتا ہو اللہ تعالےٰ کے اوصاف کا عکس اور پرتو اس کے وجود پر پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ بعض اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے۔ اور انسان کو اللہ نے مستقلاً کسی چیز پر قدرت نہیں دی البتہ یہ تین چیزیں اس کے اندر رکھ دی ہیں۔ اول ادراک۔ دوئم باعثہ۔ سوئم خواست۔ مثلاً جب یہ اولاً کسی چیز کا ادراک کرتا ہے۔ اس کے بعد نظر عمیق کرکے دیکھتا ہے۔ کہ آیا یہ میرے لئے مفید ہے یا نہیں اگر مفید ہو فی نفسہٖ یا اس کے ذہن میں تو اس کی جانب اس کی طبیعت کا میلان ہوتا ہے۔ اول ادراک ہے۔ اور میلان طبع باعثہ ہے۔ اس کے بعد اس کے حصول میں سعی بلیغ کرتا ہے۔ یہ خواست ہے۔ ان تین چیزوں کے مختار ہونے کی وجہ سے یہ دیدہ دانستہ اور نادانستہ مصیبتوں میں پڑتا ہے۔ اور ان تین چیزوں کو حرکت میں لانے کے بعد اس مطلوب چیز کو حاصل کرنا اس کے اختیار میں نہیں وہ صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر مناسب

سمجھیں گے تو اسے وہ چیز بھی دینگے ورنہ محروم رہے گا۔ اور اگر شرعًا وہ چیز جائز اور قابل حصول تھی تو اس کو اپنے ارادہ۔ باعثہ و ادراک کے باوجود محروم اور حرمان نصیب رہنے پر ثواب کا ترتب ہوگا۔ اس لئے کہ جو کچھ اس کے اختیار میں ہے اسکو استعمال کرنے اور حرکت میں لانے میں اس نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ رہا اس چیز کا حصول وہ چوں کہ اللہ کی ذات کے اختیار میں تھا اِس لئے اس کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں آئی اسی لئے بزرگوں کا کہنا ہے۔ العبد مختارٌ فی فعلہٖ ومجبورٌ فی اختیارہٖ۔ کائنات عالم کا ہر ذرہ اگرچہ خداوند کریم کا محکوم ہے۔ ان میں بھی حیرانی اور پریشانی رہتی ہے۔ مگر اس انسان جیسا اور کوئی حیران و پریشان نہیں اس کو سب سے زیادہ پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جمادات اور نباتات اس قسم کی حیات اور عقل ہی نہیں رکھتے تاکہ ان کو کوئی پریشانی لاحق ہوسکے۔ اسی طرح حیوانات وہ اگرچہ حیات رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کو بعض مصائب سے دوچار ہونا لازمی ہے۔ مگر ان میں عقل نہیں کہ جس سے وہ اس بات کو معلوم کرسکیں کہ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اور کس لئے اور کیوں۔؟ ان تمام چیزوں سے چوں کہ وہ عاری ہیں اس لئے ان کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ملائکہ کو لیجئے۔ اگرچہ اُن کے اندر عقل کمال درجہ کی ہے۔ مگر ان میں قوت شہویہ اور غضبیہ نہیں جو جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ جسمانی حوادثات و آفات سے بھی منزہ ہیں۔ اس لئے ان کے پریشان ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ایک آدمی ہے۔ کہ اس میں حرص۔ طمع۔ لالچ۔ شہوت۔ غضب۔ خواہش۔ آرزو۔ تمنا غم۔ ہم۔ ہوا۔ ہوس۔ چوں۔ چرا ہو غرضیکہ وہ ہزار قسم کی محنتوں اور آلائشوں سے ملوث ہوکر پریشانیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ ؎

گہے دانا گہے ناداں نشستہ گہے غمگیں گہے شاداں نشستہ

(انسان کی کیفیت یہ ہے کہ کبھی تو عقلمند اور کبھی بیوقوف نظر آتا ہے۔ اسی طرح کبھی خوش و خرم اور کبھی غمگین) اور اس بیچارے کے لئے سب سے زیادہ مشکل تو یہ ہے۔ کہ اس کے اندر شہوت ہے۔ اور دوسری جانب دنیا اپنے تمام ہار و سنگار سے مزین ہے۔ اب یہ اس سے کس طرح اپنی جان کو بچائے۔ طبیعت میں میلان اور شہوت موجود

ہے اور جس کی طرف میلان ہو اگر وہ بدصورت اور بدنما ہو تو میلان خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا حال تو یہ ہے۔ کہ وہ تو تزئین کے سب اسباب اور سنگار سے مزین ہے۔ جیسے حدیث میں آتا ہے۔ الدنیا خضرۃٌ وحلوۃٌ کہ دنیا سبز و شیریں ہے۔ یعنی دیکھنے میں خوبصورت اور چکھنے میں میٹھی ہے۔ لیکن دنیا کو سب اسباب تزئین سے مزین کر کے اور انسان کے اندر مادہ میلان وشہوت رکھ کر خداوند کریم کو یہ دیکھنا ہے۔ کہ کون اس کے چاہنے والے اور کون اس کو ترک کرنے والے ہیں بری چیز کو تو ہر ایک ترک کر ہی دیتا ہے۔ بلکہ چاہتا ہی نہیں اس کو ہم نے مزین کر کے دیکھنا یہ ہے کہ کون اس کو مرغوب رکھتے ہیں۔ اور کون مجھے محبوب رکھتے ہیں۔ گویا کہ ہمارا امتحان لینا مقصود ہے جیسا کہ خود قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملاً۔ کہ ہم نے دنیا کو رنگین اور مزین کر دیا تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ کون اچھا عمل کرتا ہے۔ اور کون اسکی فریب کاریوں میں آکر اپنی آخرت برباد کرتا ہے۔ جب انسان کی کیفیت یہ ہے تو بظاہر بچاؤ کا راستہ سوائے اس کے اور کوئی نظر نہیں آتا کہ یہ اپنی عاجزی اور بیچارگی کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ رب العزت دربار میں التماس و درخواست بصد آہ و بکاریوں کرے کہ یا الٰہ العالمین میرے پیچھے ہزارہا قسم کی مصیبتیں مجھے اچکنے کے لئے پڑی ہوئی ہیں۔ تو محض اپنے فضل و کرم سے میری دستگیری فرما کر سب سے متنفر کر کے اپنی طرف لگائے۔ اور اگر مجھ سے کسی قسم کی غلطی ہو جائے تو رحم فرما کر معاف فرما۔

(مذکورہ بالا بحث کے اندر انسان کی تین وجودی صفتوں کا بیان تھا۔ اور ذیل میں انسان کی تین عدمی صفتوں کا بیان فرماتے ہیں۔) کہ اسی طرح انسان کے اندر تین فنائی اور عدمی صفتیں ہیں اول مخلوق سے ناامیدی۔ یعنی مخلوق کا وجود و عدم اس کی نظروں میں مساوی ہو جائے اور ان کی ذم اور مدح کا اعتبار نہ کرے اور انہیں ضار و نافع نہ سمجھے۔ (لیکن اس زمانے میں انسان کی حالت اس کے برعکس ہے جیسا کہ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی　　مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

دوئم نفس کی سب خواہشات شریعت مطہرہ کے تابع ہو جائیں گویا کہ نفس کی کوئی

خواہش ہے ہی نہیں۔ سوئم۔ اس کا ارادہ اور خواہش بھی ختم ہو جائے۔ کہ کوئی نفع و ضرر خیر و شر کی نفس میں آرزو نہ رہے ہے۔ یعنی جو خدا کی خواست ہو اسی پر چلے اس کے دل میں اپنی کوئی آرزو نہ رہے۔ استغفر اللہ و اتوب الی اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ کلام کا رخ بلا اختیار دوسری جانب ہو گیا مقصود تو اس برادر سعادت مند کا ذکر کرنا تھا جو مجاہدہ اور ریاضت کی تلوار سے اختیاری طور پر اپنی جان کو قتل کر کے اس جان کے اصلی مالک کو بلا خیانت سپرد کر دے۔ واللہ یحفظکم وھو الحفیظ العلیم عزیز من!۔ ہر آدمی اپنے جانی دشمنوں سے بچنے کی خاطر ہر حربہ اور حیلہ استعمال میں لاتا ہے۔ تاکہ وہ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہ سکے لیکن افسوس ہے انسان پر کہ اس کے پیچھے اس کی جان سے زیادہ ایمان و اسلام کے دشمن پڑے ہوئے ہیں اور وہ ان سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ نہیں کر رہا ہے۔ جانی دشمنوں کے مقابلہ میں صرف جان ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے علاوہ اور ہر اس چیز کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جو دشمن کے حملہ کو بیکار کر دے۔ لیکن ایمانی دشمنوں کے دفاع کے لئے بیچارہ اکیلا ایمان ہی ہے۔ صحیح فرمایا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدء الایمان غریبًا وسیعود غریبًا کما بدء (میری نظر سے الایمان کا لفظ نہیں گزرا بلکہ بجائے الایمان کے الاسلام کا لفظ معلوم ہے۔ ہو سکتا ہے مولاناؒ یا کاتب سے تسامح ہو گیا ہو۔ یا مولانا ایمان و اسلام کو ایک ہی سمجھتے ہوں واللہ اعلم بندہ محمد فاضل عفا اللہ عنہ) ان بیرونی اور اندرونی دشمنوں سے کس ہتھیار اور کس چیز سے دفاع کیا جائے۔ لا الہ الا اللہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی۔ کہ لا الہ الا اللہ ایک قلعہ ہے جو اس میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے بچ گیا۔ اور اس کا ایمان سلامت رہا۔ اور ہر آفت و مصیبت اور دشمن سے مامون ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود قلعہ بندی میں احتیاط ضروری ہے اس لئے کہ دشمن تو قلعہ کو بھی ختم کرنے کے درپے ہیں۔ قدوۃ الاولیاء شیخ صدر الدین بن شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا قدس اللہ ارواحھم واوصل الینا من برکاتھم اپنے ملفوظات میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ حصن وہ ہے جس کے ارد گرد کی حفاظت کی جائے۔ وہ حصن نہیں جس کے ارد گرد کا خیال ہی نہ کیا جائے۔ اور لا الہ الا اللہ کے قلعہ میں داخل ہونا تین قسم پر ہے۔ ظاہر۔ باطن۔ حقیقت۔ ظاہر یہ ہے کہ خوف و امید

سوائے اللہ کے اور کسی سے نہ رکھی جائے۔ کہ اگر تمام جہاں دشمن یا دوست ہو جائے تو بغیر اللہ کے حکم کے کوئی نقصان یا نفع نہ پہنچا سکیں۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وان یمسسك الله بضر فلا كاشف له الا هو وان یرد بخیر فلا راد لفضله الآیۃ۔ اور باطن یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھے کہ جو چیز بھی اس دنیائے فانی میں ہے اس کو ثبات نہیں وہ فنا ہونے والی ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے۔ کل من علیها فان الآیۃ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جنت کی آرزو اور دوزخ کا خوف دل میں نہ آئے۔ اور اللہ کے علاوہ اور کسی سے قرار نہ پکڑے (پھر اس کا مستحق ہو) فی مقعد صدق عند ملیك مقتدر الآیۃ۔ جب اس مقام تک پہنچ جائے گا تو بہشت خود بخود اس کے تابع ہو کر مل جائے اور دوزخ سے بُعد نصیب ہوئے۔

انتہیٰ کلام الشیخؒ۔

عاقبت کارہائے دنیا و دین بخیر باد

مکتوب نمبر ۴۹

بنام شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

توصیۃ الاصحاب بالصبر فی جمیع الابواب

اللہ و رسولہٗ۔ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا۔ کہ اچانک صبر کا خیال آیا اور آہستہ آہستہ و رفتہ رفتہ دل کی گہرائیوں میں اترتا گیا۔ اور اتنی شدت اختیار کرتا گیا کہ میرے لئے نماز کی ادائیگی مشکل ہوگئی۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو ان لوگوں سے بھی اس کا ذکر کیا جو میرے پاس موجود تھے۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد میرے دل میں اس کی اور زیادہ اہمیت پیدا ہوگئی اور میں نے اس کو ایمان و اسلام کا ایک عظیم باب پایا۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ اس کو تحریر کردوں۔ تاکہ مسلمانوں کو اس سے فائدہ ہو اور میری اکثر و بیشتر تصانیف اسی قبیل سے ہیں اور اسی غرض سے لکھی گئی ہیں تاکہ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اور ان کے باطنی نور کے اضافہ کا سبب بنے۔ اسی ایک سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے منزل مقصود تک پہنچادینگے۔

جاننا چاہیئے کہ صبر کے معنیٰ داعیۂ نفس پر داعیۂ حق کو ترجیح دینا ہے (نفس ایک کام پر برانگیختہ کرتا ہے اور شریعت اس کے خلاف کا امر کرتی ہے۔ تو نفس کی خواہش کو ترک کر کے شریعت پر عمل کرنے کو صبر کہتے ہیں۔) اور کوئی عبادت بغیر صبر کے مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اس کی ضد پر صبر نہ کیا جائے۔ اسی لئے بزرگ صبر کو نصف ایمان قرار دیتے ہیں۔

وصل ۔ مسلمان ہونے کے لئے باب اول صبر ہے۔ اور سب سے عمدہ چیز عقائد اسلامیہ پر ثابت قدمی ہے۔ خصوصاً وہ عقائد جن میں عقل کو دخل نہیں (یعنی جو بظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتے ہوں) بلکہ عقل ان عقائد کے تصور و تخیل سے حیرانی اور مختلف قسم کے وساوس میں مبتلا ہوجائے۔ جیسے قیامت و حشر و نشر کے احوال اور

قدرتِ الٰہیہ کے عجائب و غرائب جو ملک و ملکوت میں ظاہر ہیں اور جن کی خبر شریعت نے دی اور وہ مخبر صادق کی خبر پر موقوف ہیں اور ان کو تسلیم کرنا بجز نور ایمانی کے ممکن نہیں۔ ہر جگہ یہی حال ہے۔ اور ان کے حصول کا یہی طریقہ ہے۔ اور وہ عقائد جن میں عقل کو دخل ہے۔ اور متکلمین نے اپنے زعم میں ان کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا ہے۔ ان پر یقین رکھنا بھی ایمان ہے۔ اور وہ عقائد نہ ہوتے تو متکلمین کے سب دلائل باعث حیرانی اور پریشانی ہوتے۔ اس لئے یہ دلائل ان عقائد اور مسائل کو پیدا کرنے والے نہیں بلکہ وہ محض اطمینان قلب کا سامان ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو ایمان تقلیدی ہے تو یہ غلط ہے۔ بلکہ یہ یقین ہے جو دل میں موجود تھا تقلیدی تو وہ ہوتا ہے جس کا دل میں یقین نہ ہو اور جس طرح دیکھا یا سنا بغیر سوچے سمجھے اس میں گھس گیا اور اس کی اتباع کرنے لگا۔ اور تقلیدی اعتقاد تو کسی شک میں ڈالنے والے کے شک و شبہ پیدا کرنے سے زائل ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایمان تو اس طرح محکم ہے کہ اگر ہزار مشکک اور شبہ پیدا کرنے والے شبہات پیدا کرتے رہیں تب بھی ہرگز زائل نہ ہونے پائے۔ اور جو لوگ نور ایمان سے عاری ہوتے ہیں ان کو کوئی دلیل فائدہ نہیں دے سکتی۔ نعوذ باللہ من تلک الحالۃ۔ اور اس پر دلائل غیر متناہیہ ہیں جو لوگوں نے بیان فرمائے ہیں۔ اور اگر بالفرض اس میں بھی شبہ اور وسواس جاگزیں ہونے لگے تو پھر بزرگوں کا کہنا ہے کہ اس کے دفع کرنے میں حتی المقدور کوشش کی جائے۔ اور اپنے ایمان پر ثابت قدمی سے قائم رہنا چاہیئے۔ اور دل و زبان پر کوئی بیہودہ خیال و کلام نہ لایا جائے۔ اور اللہ کے دو ناموں یعنی النور۔ الہادی کا کثرت سے وظیفہ رکھے جس سے اسکو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب ہوگا اور جمیع وساوس و شبہات خدا کے فضل و کرم سے رفع دفع ہو جائیں گے جس کا سبب یہ ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا جو ظاہراً اثر ہوگا وہ آہستہ آہستہ قلب و جگر میں بھی سرایت کرے گا جس کی وجہ سے قلب کی ظلمات، نور سے تبدیل ہو جائیں گی۔

وصل۔ یہ بیان تو ایمان و اعتقاد کی نسبت صبر کا تھا۔ اور دوسری قسم کا صبر اعمال میں ہوتا ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ جو نے عمل میں صبر نہ کیا جائے وہ وجود میں نہیں آتا اور نہ ہی اس میں عمدگی پیدا ہوتی ہے۔ اور جس طرح اس کی حقیقت واقعہ ہے

وہ صبر ہی کے بعد رونما ہوتی ہے۔ جب کسی چیز کی حقیقت وجود میں نہیں آتی اسوقت تک اس کے نتائج اور ثمرات مرتب نہیں ہو سکتے۔ اس کا کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کا کرنا نہ کرنے سے بدتر ہوتا ہے۔ اور سب اعمال سے بہترین عمل تو نماز ہے جس کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے۔ اقرب ما یکون العبد الیٰ ربہٖ وھو ساجدٌ۔ کہ اللہ کے ہاں انسان قریب ترین سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس عبادت کے اندر صبر لازمی و ضروری امر ہے۔ اور صبر کے بعد اس کے وضو کی شرائط و آداب و حضور و طمانیت کی رعایت کی جائے۔ اس لئے کہ جتنا حضورِ قلب وضو میں ہوگا اسی کی مقدار نماز میں بھی ہوگا۔ کیونکہ وضوء نماز کا مقدمہ ہے۔ اور نماز شروع کرنے کے بعد نماز میں قرأت ہوتی ہے اس میں صبر یہ ہے کہ تلفظ کی صحت اور ترتیل و تجوید خشوع و خضوع اور سنت کے مطابق طوالت اختیار کیجائے۔ خصوصًا تہجد کی نماز میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ اور سجود و قومہ کو بھی اسی کے اندازہ سے کرتے تھے۔ علماء سے منقول ہے کہ قرأت کے اندر زبان۔ کان۔ دل ایک ہی جگہ ہونے چاہئیں۔ تاکہ زبان سے جو نکلے کان اس کو سنیں اور دل سمجھے اور رکوع و قومہ و جلسہ وغیرہ میں تعدیل اور اللہ تعالیٰ کی جلالت مرتبت وغیرہ امور کا خیال کیا جائے۔ اور جب تشہد میں بیٹھا جائے تو اس تمام کیفیت کو ذہن نشین رکھا جائے جو معراج میں واقع ہوئی اور اس میں جس طرح الفاظ وارد ہوئے اس کی ہیئت کو بھی ذہن سے نہ نکالا جائے۔ اور ان کلمات سے فراغت کے بعد ان الفاظ سے دعاء کرے جو حدیث میں منقول ہیں۔ اور سلام پھیرنے کے بعد دعا مانگنا بھی ایک صبر ہے۔ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں نماز سے فراغت کے بعد دعاء نہ مانگنے والوں کو آپ نے سرعان القوم فرمایا اور سرعان القوم اس گروہ کو کہتے ہیں۔ جو لڑائی کے میدان میں لڑنے کو آئے مگر ہاتھ میں لڑائی کا سامان نہ ہو۔ یعنی جو معرکہ میں تہی دست آئے اور جب دشمن حملہ آور ہو تو بھاگ جائے۔ اسی طرح نماز سے فراغت کے بعد ذکر و تسبیح میں مشغول ہونا بھی صبر ہے۔ اسی لئے بعض بزرگ نماز سے فراغت کے بعد خلوت خانے میں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس کی برکت اور اس پر ثمرہ کے ترتب سے آگاہ ہوتے ہیں۔

وصل۔ ایک قسم صبر کی یہ ہے کہ مصائب و آفات پر صبر کیا جائے۔ اور اس میں عمدہ صبر تو ریاضت اور مجاہدہ سلوک کا ہے خصوصاً اس وقت جب کہ مقصود حاصل نہ ہو اور یہ سلوک و ریاضت میں مصروف رہے۔ اس وقت پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروازے اس پر وسیع کر دیتے ہیں۔ اور ہر قسم کے شدائد و انقباض کو راحت و انبساط سے تبدیل فرما دیتے ہیں۔ اس وقت سکوت لازم ہے۔ اور کسی پر اس کیفیت کو بیان نہ کرے اور سب سے لازم ترین طریقہ صدق و اخلاص کا ہے۔ باوجود سب محاسن و مناقب۔ فضائل و کمالات سے متصف ہونے کے عاجزی و انکساری کو اختیار کرنا۔ اور لوگوں سے شفقت اور نرمی سے پیش آنا۔ بزرگوں اور بڑوں کا ادب و احترام کرنا اور اللہ کی بندگی میں ہمہ تن منہمک ہونا۔ اور کسی کو برا کہنے سے گریز کرنا چاہیئے اسلئے کہ بزرگوں کا کہنا ہے۔ کہ ہزار کافروں کو کفر سے بچانا ایمان کے ایک احتمال سے بہتر ہے اس سے کہ مومن کو ایمان سے خارج کیا جائے کفر کے ایک احتمال سے۔ یا ایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا و رابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون

والعاقبة بالخیر

مکتوب نمبر ۵۰

بنام شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

تنبیہ اھل الفکر برعایۃ اداب الذکر

اللہ و رسولہٗ۔ اس وقت شیخ اجل و اعظم عبدالوہاب متقی شاذلی روّح اللہ روحہٗ و اوصل الینا برکاتہٗ نے اس مسکین کو ذکر کرنے کی تلقین کی اور اس کی اجازت دی۔ اور اس کے آداب سکھائے نیز مجھے ایک کتاب المسمّٰی بمنہج السالک الٰی اشرف المسالک دی۔ چوں کہ وہ کتاب عربی میں تھی طالبان طریقت کی سہولت کے لئے اس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اور یہ واقعہ تلقین مکہ میں ۹۹۹ھ میں ہوا اور اس کتاب کا ترجمہ ۱۰۲۶ھ میں شہر دہلی میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی امداد سے اس کتاب کا ترجمہ کرتا ہوں۔ (اس سے آگے کتاب کا ترجمہ ہے۔ فاضل۔) فرماتے ہیں کہ ذکر کے آداب ۲۰ ہیں۔ پانچ ذکر شروع کرنے سے پہلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بارہ ذکر میں مشغول ہونے کے دوران۔ اور تین ذکر ختم کے بعد سے متعلق ہیں۔ اور جو پانچ شروع کرنے سے پہلے والے ہیں ان میں ایک تو اللہ کے حضور میں اپنے پہلے گناہوں سے توبہ کرنا ہے۔ دوئم وضو یا غسل کرے۔ سوئم آرام اور خاموشی سے اللہ کے ذکر میں مشغول رہے یعنی کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرے کہ اس میں کوئی ایسی چیز موجود نہ ہو جو ذکر میں خلل انداز ہو سکے۔ چہارم اپنے دل کو ہمہ تن شیخ کی طرف متوجہ کرے اور اگر اس وقت شیخ کو ندا کرے اور اس سے مدد چاہے تو بھی جائز ہے (مترجم کہتا ہے کہ یہ بات شاہ صاحب کی نہیں لوگوں نے اس کو درج کر دیا ہے۔ اور اگر شاہ صاحب کی طرف اس کی نسبت کو درست مان لیا جائے تو یہ شاہ صاحب کی بہت بڑی غلطی ہے کہ ایسے محقق ہو کر ایک کتاب کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال نہ فرمایا کہ آخر یہ بات کیسی ہے۔ اور عقائد پر اس سے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں بہر کیف استمداد بغیر اللہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کے عدم جواز پر سب علمائے

اہل السنت کا اتفاق ہے اور اس مسئلہ کے بطلان پر علمائے سلف و خلف کی متعدد کتب موجود ہیں بندہ محمد فاضل عفا اللہ عنہ) اور پنجم بزرگ و شیخ سے استمداد مانگنے کو حقیقت میں نبی کریم سے استمداد تصور کرے اس لئے کہ وہ بزرگ تو نبی علیہ السلام کے جانشین اور نائب ہیں۔ اور وہ بارہ آداب جن کا ملحوظ رکھنا دوران ذکر میں ضروری ہے۔ یہ ہیں۔ اول جگہ پاک و طاہر ہو۔ اور اس طرح بیٹھے جس طرح نماز میں بیٹھنا چاہیئے۔ ایک جماعت اسی کو مناسب سمجھتی ہے۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی کیفیت کا دل پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور دوسری جماعت ہے جو کہتی ہے۔ کہ بیٹھنے میں کوئی طریقہ متعین نہیں جس میں ذاکر کو سہولت ہو وہی اختیار کرے اسی میں خیر و برکت ہے۔ اور اگر اکیلا ہو تو قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور اگر جماعت ہے تو حلقہ بنا کر بیٹھیں۔ دویم دونوں ہاتھوں کو دونوں رانوں پر رکھا جائے سویم۔ مجلس ذکر کو خوشبو وغیرہ سے معطر کر دیا جائے۔ اس لئے کہ مجالس ذکر میں ملائکہ اور مسلم جن حاضر ہوتے ہیں۔ چہارم پاک کپڑے پہنے جائیں جو کہ حلال طریقہ سے حاصل کئے گئے ہوں۔ پنجم اگر میسر ہو تو تاریک جگہ پر بیٹھا جائے۔ چھٹے آنکھوں کو بند کر کے بیٹھا جائے تاکہ حواس ظاہرہ بند ہو جائیں۔ ساتویں اپنے شیخ کا تصور کرے ایک جماعت کے نزدیک یہ ضروری اور لازمی امر ہے۔ (لیکن ایک جماعت کے نزدیک ناجائز اور حرام ہے) آٹھویں ظاہر و باطن میں صدق اور راستی کو لازم پکڑا جائے۔ اس لئے کہ صدق ایک ایسی تلوار ہے کہ اس کو جس چیز پر بھی مارا جائے کارگر ثابت ہو۔ اور جس چیز پر لگے اس کو پارہ پارہ کر کے رکھدے۔ نویں اخلاص فی العمل اور اپنی نیت کو ہر اس تلویث سے پاک کرے جو اس راہ میں رکاوٹ ثابت ہو۔ دسویں ذکر کرنے میں لا الہ الا اللہ کا انتخاب کیا جائے اور اس کو جہر سے پڑھا جائے۔ گیارہویں۔ ہر بار ان کلمات کے معانی کو اپنے دل میں حاضر کیا جائے۔ اور جب بھی کوئی بشری وسوسہ پیدا ہو تو زبان سے لا الہ الا اللہ کہے اور دل میں لا معبود الا اللہ کا تصور کرے۔ بارہویں جو چیز خداوند کریم کے علاوہ ہے لا الہ الا اللہ کہہ کے ان سب چیزوں کی نفی کرے اور اللہ کے نام سے دل کو قرار میں لائے بزرگوں نے کہا ہے کہ جب آدمی اللہ کا نام لیتا ہے تو وہ سر سے پاؤں کی انگلیوں تک خوشی محسوس کرتا ہے۔ اور وہ تین ادب جو ذکر سے فراغت کے بعد تعلق رکھتے ہیں یہ ہیں۔ اول یہ ہے کہ خاموش رہے اور

خشوع وخضوع میں ڈوبا رہے اور اس طرح کرنے سے اس کو وہ فائدہ ہو جو بیس برس مجاہدہ اور ریاضت سے بھی نہیں ملتا۔

دویم۔ دم کی حفاظت کرے اور اس کو بند رکھے اس سے بصیرت کی روشنائی تیز ہوتی ہے۔ اور ایسا کرنے سے سب پردے دور ہو جاتے ہیں۔ سوئم ذکر سے فراغت کے بعد متصلاً پانی نہ پیا جائے اس لئے کہ یہ آتش شوق کو بجھا دیتا ہے۔ اور حالانکہ ذکر سے مطلوب ہی یہی ہے۔ نیز طبی اعتبار سے بھی حرکت و جنبش کرنے کے بعد پانی پینا درست نہیں۔ اور مرض استسقاء کے پیدا ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔ صاحب کتاب نے کہا ہے۔ کہ ذکر کرنے والا ان تین ادبوں کو خوب ملحوظ رکھے۔ اس لئے کہ ذکر کا نتیجہ اور ثمرہ ان ہی تین پر موقوف ہے۔ اور شیخ عجمی سے منقول ہے کہ ذاکر کو ان تین ادبوں کا لحاظ رکھنا اس وقت ضروری ہے جبکہ اس کو اپنے عقل و دانش پر قابو ہو اور اپنے ذکر پر اختیار رکھتا ہو۔ اور جب ذاکر اپنے رب کے ذکر میں اپنی عقل کھو بیٹھتا ہے۔ تو اس وقت اس پر یہ احکام جاری نہیں ہوتے پھر اس کے لئے اور احکام ہیں جو اس فن کے ماہر لوگ جانتے ہیں۔ اور جب ذاکر اپنے افعال کا مختار نہیں رہتا تو اس سے مختلف الاقسام الفاظ اور کلمات سرزد ہوتے ہیں۔ جو شرعاً اور ظاہراً اگرچہ درست نہ ہوتے ہوں مگر عنداللہ وہ محمود ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنے اختیار سے کچھ نہیں کر رہا۔ پس کبھی اس سے۔ لا لا۔ ہو ہو۔ ہا ہا۔ آہ آہ کے الفاظ سرزد ہوتے ہیں۔ اور کبھی ایسے کلمات جن کے الفاظ اور معانی تک نہیں ہوتے جن کو دنیا والے بے معنی اور مہمل الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

وصل۔ یہ تھے ذکر کرنے کے آداب جو کتاب منہج السالک میں بیان کئے گئے ہیں نیز اسی کتاب میں ذکر کے فوائد اور فضائل بھی موجود ہیں۔ اور وہ وہی ہیں جو کتاب و سنت میں مذکور و مشہور ہیں اگر میں ان کو بیان کروں تو سلسلہ طویل اور دراز ہو جائے اور میں نے اپنے مکتوبات میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن چند فوائد بیان کرتا ہوں جو کہ میں نے شیخ کی زبانِ ترجمان حق سے سنے اور یہ سب باتیں کتاب زاد المتقین فی سلوک طریق الیقین میں موجود نہیں ہیں میں اللہ سے امداد طلب کرتے

ہوئے ان باتوں کو تحریر کرتا ہوں۔

فائدہ۔ اسی کتاب مذکور میں ہے۔ کہ ذکر دو قسم پر ہے۔ ایک ذکر زبان کا اور دوسرا ذکر دل کا۔ اور بندہ زبان کا ذکر کرتے کرتے دل کے ذکر تک رسائی پاتا ہے۔ اور ذکر کی تاثیر اور دوام تو اسی ذکر کو ہے جو دل کا ہے۔ اور جب دونوں جمع ہو جائیں تو یہ سونے پر سہاگہ ہے۔ اکثر صوفیائے کرام کے سلسلوں میں یہی بات معروف و مشہور ہے۔ اور سلسلۂ قادریہ والے بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ اور سلسلۂ نقشبندیہ والے صرف دل کے ذکر پر ہی اکتفاء و اقتصار کرتے ہیں۔ اور اسی ذکر کی مبتدی کو ابتداء میں تعلیم دیتے ہیں۔

فائدہ۔ میں نے شیخ سے ان اذکار اور ان اذکار کے طریق کار کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ کیا یہ قرآن اور سنت سے ثابت ہیں یا نہیں تو شیخ نے جواب میں فرمایا کہ یوں اذکار کی ہیئت کذائیہ تو قرآن اور سنت سے ثابت نہیں البتہ ان کو بزرگانِ ملت مستحسنات سے شمار کرتے ہیں۔ اور اصل ذکر تو لا الہ الا اللہ ہے جس کو تصحیح حروف و مخارج سے ادا کیا جائے۔ اور جب کسی پر شوق کا غلبہ ہو اور اس کی زبان سے اس کے خلاف کلمات صادر ہو جائیں تو اس کا حکم جداگانہ ہے۔

فائدہ۔ ذکر کرتے وقت حبس نفس بعض بزرگوں کے نزدیک ضروری اور سلوک کا اصل قوی ہے۔ اور اس طرح سے قلب کے اندر جتنے خس و خاشاک ہیں سب ختم اور زائل ہو جاتے ہیں۔ اور قلب کو غیروں کے تصور اور خیال سے پاک کرنے کا اس سے بہترین اور کوئی طریقہ نہیں اور یہ سلسلۂ چشتیہ و کبرویہ اور شطاریہ میں شرط ہے۔ اور سلسلۂ نقشبندیہ میں شرط نہیں البتہ اس کی اولویت کے وہ بھی قائل ہیں یعنی اگر کوئی حبس نفس کرے تو مناسب ہے شرط نہیں کہ اس کے علاوہ ذکر سودمند ہی نہ ہو۔ اس بات کو حضرت شیخ کلیم الٰہی قدس سرہٗ نے اپنی ایک کتاب بنام اورادِ خود میں تحریر فرمایا ہے۔ ایک دفعہ میں نے خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ سے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک بار خواجہ احرار اور مولانا عبدالرحمان جامی شیخ بہاؤالدین عمر جو خراسان کے متاخرین بزرگوں میں سے تھے کی خدمت میں برکت حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ اور ان دونوں بزرگوں نے شیخ بہاؤالدین عمر سے عرض کیا کہ ذکر کے

اندر جو بزرگوں سے حبس نفس منقول ہے وہ سنت سے ثابت نہیں تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ کیا تم خواجہ بہاؤ الدین نقشبند کے طریق کے منکر ہو ؟۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہم ان کے سلسلہ کے منکر نہیں بلکہ ایک بات تھی جو ہم نے کہی۔ دلیکن اس بزرگ نے ان دو بزرگوں کے اعتراض کا کوئی جواب نہ دیا مترجم ۱۲) اور شیخ مذکور شاید سلسلہ سہروردیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نزدیک ذکر میں حبس نفس نہیں ہے۔ اور اسی بزرگ کے موافق زین الدین خافی جو سہروردیہ سے تعلق رکھتے ہیں اپنی کتاب وصایا میں فرماتے ہیں۔ کہ ذکر کو اس طرح شدت اور قوت سے کیا جائے کہ اس کے اثرات رگ و پے تک سرایت کر جائیں اور سانس کو اپنی کیفیت پر چھوڑ اجائے اور جس طرح خود آتا ہے آنے دیں اور لوگوں میں جو حبس نفس کا مسئلہ ہے۔ اسکی ابتداء جوگیوں اور غیر مسلم راہبوں سے ہوئی ہے۔

فائدہ :۔ شبلی قدس سرہٗ اپنے احباب سے فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ میرا ہمنشیں وہ ہے جو میرا ذکر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُنس خدا کی طرف سے ہے اور توحش و اجنبیت غیر سے ہوتی ہے۔ ابوعثمان سے کسی نے دریافت کیا کہ میں اللہ کا ذکر بڑی بہتات اور کثرت سے کرتا ہوں مگر اس کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں دیکھتا تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہی سب سے بڑی نعمت شمار کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اعضاء کو اپنی عبادت میں لگا دیا ہے۔ شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری شاذلی ؒ جو مصنف ہیں کتاب الحکم کے وہ اسی کتاب میں ایک روایت بیان کرتے ہیں۔ کہ ذاکر جب لا الہ الا اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اس سے عرش جنبش اور حرکت میں آجاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کلمات خود عالم جبروت سے ہیں۔ اور جو شخص اس کلمہ کو صبح کے وقت طہارت کے ساتھ ایک ہزار بار پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے رزق کی تنگی کو فراخی سے بدل دیتے ہیں اور وسعت رزق سے جسمانی اور روحانی دونوں مراد ہیں۔ اور جو شخص اس کو استواء شمس کے وقت ایک ہزار بار پڑھتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کے باطنی شیطان کو سست کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص ہر نئے ماہ میں ہزار بار پڑھے وہ تمام بیماریوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ اور جو شخص کسی نئے شہر میں داخل ہو اور اسی مقدار سے اس کو پڑھے تو اس شہر کے تمام فتنوں سے محفوظ رہے۔

فائدہ:- ذکر کرنے کی دلیل کتاب وسنت ہے ۔اس سے بڑھ کر اور کوئی دلیل نہیں اور مشائخ کی تلقین کی بہت تاثیر ہے۔ وہ اپنے اس عمل یا طریق کار کے صحیح ہونے پر اس روایت سے سند حاصل کرتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ سے دریافت کیا میں کس طرح ذکر کیا کروں یا رسول اللہ۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیٹھ کر دونوں آنکھوں کو بند کر کے اور اس کو مجھ سے تین بار سن لے۔ پھر تو اس کو تین بار کرنا کہ میں تجھ سے سن لوں اسی چیز کی بزرگان ملت تلقین کرتے ہیں۔ کہ اولاً نبی علیہ السلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تلقین کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حسن بصری رضی اللہ عنہ، اور حسن بصری نے دوسرے لوگوں کو یہاں تک کہ وہی سلسلہ ہمارے تک پہونچا۔ واللہ اعلم *

مکتوب نمبر ۵۱

بنام شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

تذکیر اھل الذکر ببیان فضیلتہ علی الفکر

اللہ ورسولہٗ۔ شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ذکر وفکر دونوں بہترین حالات ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے دو دو حالات و آداب اور مقامات ہیں جنکی شرح اور بیان طویل و دراز ہے۔ اور میرے دل میں جو بات آئی وہ یہ ہے کہ ذکر بہتر اور ارفع ہے۔ اس لئے کہ خدا کے ذکر سے خدا کا قرب لازم آتا ہے۔ علاوہ ازیں جو ذکر کرتا ہے اس کا ذکر خدا کرتے ہیں جیسے ارشاد ہے۔ فاذکرونی اذکرکم الایۃ (کہ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) اور شریعت کے اندر کوئی ذکر اس قسم کا ثابت نہیں کہ جو بندہ کرے اور اسی کی مانند خداوند کریم بھی کریں۔ اور جو اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں ان کے بارے میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ یحبہم ویحبونہٗ (کہ ان سے اللہ محبت رکھتے ہیں اور وہ اللہ سے) شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے شیخ ابوعلی دقاق سے دریافت کیا کہ ذکر اور فکر میں افضل اور تمام تر کون سی چیز ہے۔ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک فکر سے ذکر افضل ہے۔ اس لئے کہ ذکر کرنے سے خداوند کریم نے فرمایا کہ میں بھی اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اور فکر کے بارے میں یوں نہیں فرمایا۔ اور نیز شیخ ابوعلی دقاق نے ذکر پر نکتہ بیان فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی ذکر بہتر ہے۔ اسی لئے اللہ نے اپنی کتاب کا نام بھی ذکر رکھا جیسا ارشاد ہے۔ وانزلنا الیك الذکر الایۃ۔ اور دوسری جگہ فرمایا۔ ھذا ذکرٌ مبارك انزلناہ الایۃ شیخ ابو عبدالرحمٰن ذکر کے احوال بیان کرتے ہیں اور ان میں سے ایک ذکر لسانی ہے۔ اور یہ حال بزرگ تر ہے۔ جو ہر وقت اپنے خدا کا نام زبان سے لے رہا ہے۔ اور اس کی زبان اللہ کے نام سے جاری ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ اگر تو توانائی چاہتا

ہے تو اپنی زبان کو اللہ کے ذکر سے تر و تازہ رکھ اور دوسرا ذکر قلبی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دل اس طرح سے پاک وصاف ہو جائے کہ جو احوال و موارد اس پر وارد ہوں ان تمام کا اظہار ظاہر پر ہو۔ اور وہ احوال دل سے ظاہر پر مرتب ہوں گے جبکہ دل اللہ کے ذکر میں مشغول رہے۔ اور دل کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں اور بخششوں کو یاد کرے جس سے دل ہمیشہ پاک وصاف رہ کر خدا کے ذکر میں مشغول رہے گا۔ اور تیسرا ذکر سر ہے۔ کہ جب آدمی ذکر قلب میں مصروف ہو کر اس کے تمام شرائط پر عمل کر کے اس کے مقامات علیہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ اور اس کا باطن ہر کدورت سے پاک ہو جاتا ہے پھر کوئی ناجائز چیز ظاہر پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اور ان وساوس و خواطر کا اثر اندر ہی اندر رہتا ہے۔ جن کو ذکر دور کر دیتا ہے۔ کاتب حروف کہتا ہے (شاہ صاحب) کہ گویا کہ ذکر سر ثمرہ اور نتیجہ ہے ذکر قلب کا۔ کہ جب قلب صاف ہو جاتا ہے تو باطن بھی پاک وصاف ہو جاتا ہے اس کو ذکر سر کہتے ہیں اور سر ایک لطیفہ ہے جو دل سے اوپر ہے۔ اور دوام ذکر و حضور جو بعضے بزرگ ثابت کرتے ہیں اسی سر سے متصل ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ ذکر کی ایک اور قسم بھی ہے جس کو ذکر روح کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اپنی ذات کو خداوند کریم کی ذات میں اس طرح فنا کر دیا جائے کہ ذاکر کے سامنے نہ ذکر رہے۔ اور نہ دنیا کی کسی اور چیز پر نظر رہے۔ بلکہ وہ ایسی حالت میں خداوند کریم کا مشاہدہ کرے اور خداوند کریم اس کو دیکھیں کہ باقی سب چیز فانی ہو جائے۔ اور اللہ کا ذکر اس کے ذکر پر غالب آ جائے جس طرح اللہ کی ذات ذاکر کی ذات پر غالب ہے۔ اور اس کے اور اللہ کے ذکر میں مقابلہ بھی کب ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا ذکر حادث اور خداوند کریم کا ذکر قدیم ہے۔ رہے افکار تو وہ متفکر کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے متفکر کو ان میں فکر کرنی چاہیئے کہ یہ از قسم معاصی تو نہیں کوئی تو اپنے ماسبق اعمال و افعال میں فکر کرتا ہے۔ کوئی خدا کے انعامات پر۔ اور کوئی آئندہ کی زندگی اور کوئی صنع الٰہی پر جیسے ارشاد ہے افلا یتفکرون فی خلق السمٰوات والارض الاٰیتہ۔ اور کوئی خداوند کریم کی رضا اور عدم رضا کے بارے میں سوچتا ہے۔ اور اس قسم کے اور بھی بہت افکار ہیں جن کو آدمی سوچتا رہتا ہے۔ یہ جتنے بھی افکار ہیں سب نفس کے احوال کی طرف راجع ہیں جس سے معلوم ہوا کہ متفکر نفس کا ساتھی ہے اس لئے اس کے احوال میں فکر کرتا رہتا ہے۔ اور ذاکر خداوند کریم کی ذات ستودہ صفات

کا جلیس و ساتھی ہے اس لئے وہ اکثر و بیشتر خداوند کریم کی ذات کا مشاہدہ و مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ارشاد ہے کہ انا جلیس من ذکرنی دکہ جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کا ساتھی ہوں) ذاکر اپنے نفس کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک ایسی ذات کے مطالعہ اور مشاہدہ میں مستغرق ہے جس کے سامنے نفس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذاکر متفکر سے اولیٰ و اعلیٰ ہے۔ نیز ذکر خفی بہترین ذکر ہے اس لئے کہ خدا کا ارشاد ہے۔ اذ نادیٰ ربہٗ ندا ءً خفیاً الایۃ۔ اسی طرح پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے افضل الذکر خَفِیٌّ دکہ سب ذکروں سے بہترین خفی ذکر ہے)

غرضیکہ ذکر و فکر دو حالتیں ہیں جن میں ذکر افضل ہے۔ یہ شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمی کی کلام کا خلاصہ ہے اور میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ذکر و فکر دونوں شرعاً مطلوب ہیں۔ لیکن فکر موقوف علیہ ہے۔ اور ذکر موقوف۔ اور قاعدہ ہے۔ کہ موقوف علیہ اصالۃً مطلوب نہیں ہوتا بلکہ اصل مطلوب تو موقوف ہی ہوتا ہے۔ جیسے وضو، نماز کے لئے موقوف علیہ ہے اور نماز اس پر موقوف ہے۔ لیکن کوئی شخص بھی وضو، کو نماز سے بہتر نہیں کہتا اس لئے کہ مقصود وضو، سے نماز ہی پڑھنا ہے جو مقصد اصلی ہے۔ اسی طرح فکر مقدمہ اور تتمہ سلوک ہے۔ اصل مقصد ذکر ہے۔

وصل۔ شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ حکم کبیر میں شیخ ابن عطاء اللہ کی کتاب مفتاح الفلاح سے نقل فرماتے ہیں۔ کہ ذکر نام ہے غفلت و نسیان اور نفس کی فریب کاریوں سے چھٹکارا پانے کا پھر اس ذکر کی اس طرح تعمیم ہے۔ کہ اگر کوئی اللہ کی صفت یا اس کا حکم یا اس کا فعل بیان کرے یا ان چیزوں پر کسی غیر چیز کو بطور استدلال پیش کرے یا انبیائے کرام اور رسولوں کا "تذکرہ کرے یا اللہ کے خاص بندوں اور بزرگوں کا "تذکرہ کرے یا ان چیزوں کا ذکر کرے جو خدا کی طرف منسوب ہوں۔ جیسے اشعار۔ ذکر وغیرہ۔ یہ سب کچھ ذکر میں داخل ہیں۔ اس اعتبار سے متکلم۔ واعظ۔ فقیہ۔ مدرس۔ مفتی۔ اور اللہ تعالیٰ کی جلالت قدر میں فکر کرنے والا۔ اور وہ لوگ جو اپنے نفس کو ممنوعات سے محفوظ رکھتے ہیں سب ذاکرین ہیں۔ نیز ذکر کئی قسم پر ہے۔ ایک وہ ذکر جو زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک دل سے ایک اعضاء کا اور اعضاء کا ذکر سراً ہوتا ہے اور کبھی جہراً۔ اور ان میں سے جامع ترین وہ ذکر ہے جو ان سب قسموں کو شریک ہو یعنی یہ سب قسمیں اس میں داخل ہو جائیں۔ نیز بعضے

عارف لوگوں کا کہنا ہے کہ ذکر کی سات قسمیں ہیں۔ ذکر ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ کان۔ دل۔ روح۔ زبان کا۔ ہاتھ کا ذکر یہ ہے کہ اس کے ذریعہ کمزور اور غریب لوگوں کی امداد کی جائے۔ ذکر پاؤں کا یہ ہے کہ پاؤں پر چل کر علماء وصلحاء کی زیارت کی جائے۔ اور آنکھ کا ذکر یہ ہے کہ اس سے رویا جائے۔ اور کان کا ذکر یہ ہے کہ اس سے حکماء امت کی بات سنی جائے۔ اور دل کا ذکر یہ ہے کہ دل میں دنیائے فانی سے انقطاع اور دار بقاء کی طرف مراجعت اختیار کی جائے۔ اور روح کا ذکر یہ ہے کہ رویت باری کا اشتیاق ہو۔ اور زبان کا ذکر یہ ہے کہ اس سے قرآن کریم کی تلاوت کی جائے۔ اس لئے کہ یہی چیز سب دعاؤں سے زیادہ مستجاب ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے اللہ کو یاد کیا اگرچہ اسکی نمازیں اور روزے کم ہی کیوں نہ ہوں اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی یاد نہیں کی اگرچہ اس کے روزے اور نمازیں کثرت سے ہوں۔ رواہ الطبرانی عن واقد۔ انتہی +

مکتوب نمبر ۵۲

بنام شیخ نورالحقؒ

الاعتصام بحبل الصبر والثبات عند اجتماع اسباب اللذات

اللہ ورسولہٗ۔ حق تعالیٰ کی ذات ہر حال میں ناصر و مددگار ہے۔ ۲۶ رجب تک مکاتیب کا سلسلہ یہاں تک پہنچ چکا ہے جس سے دل منور و مسرور ہے۔ ان دنیاوی مسرتوں سے اب اس ضعیف کا دل بھر چکا ہے اب تو صرف ایک ہی مسرت کو تڑپ رہا ہوں اور وہی ہر مسلمان کا مطلوب ہے۔ میری مراد اس مسرت سے مسرت اخروی ہے۔ کہ خداوند کریم وہاں کی مسرتوں سے نوازیں۔ اس کے بعد گوش گذار ہوں۔ کہ دنیا کے افراد اپنے دنیاوی اور دینی مقاصد کو حاصل کرنے میں کئی قسموں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ کہ بعض لوگ تو دنیا کو طلب کرنے میں اتنے منہمک ہو گئے ہیں کہ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھے ہوئے ہیں۔ نہ ان کی زبان پر دین کی بات ہے۔ اور نہ ہی انہیں اپنی اخروی زندگی کا فکر ہے۔ گویا کہ ان کو دین کی خبر تک نہیں ہم اللہ سے ایسی زندگی سے پناہ مانگتے ہیں۔ کہ بعضے لوگ ایسے ہیں کہ وہ دین کو جانتے ہیں۔ اخروی زندگی کا فکر بھی ان کو دامنگیر ہے لیکن بوقت غلبہ و ہجوم شہوات ان کا یہ علم اتنا کمزور پڑ جاتا ہے۔ کہ باوجود علم رکھنے کے شہوات میں کود پڑتے ہیں۔ قرآن کریم میں انہیں لوگوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اَضَلَّہُ اللہ علیٰ علم۔ الایۃ۔ یہ تو اللہ کا ابتلاء و امتحان ہے کہ دنیا اور اس کے اسباب کو اس طرح مزین کر دیا ہے کہ خود بخود دل ان چیزوں کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ الدنیا حلوۃ خضراء کہ دنیا میٹھی اور سبز ہے۔ یعنی دنیا کی شہوت باطن میں لذیذ اور ظاہر میں رنگین ہے۔ اس وقت تو اللہ کی نصرت اور امداد درکار ہے۔ کہ وہ انسان کی حفاظت فرمائیں اور اس کے دام تزویر میں مبتلاء نہ ہونے دیں۔ پھر خداوند کریم کی حفاظت دو قسم پر ہے۔ ایک تو انبیائے کرام کے ساتھ مخصوص ہے جس

کو عصمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم کی ذات انبیائے کرام اور شہوات کے درمیان حائل ہے۔ ان کا طبعی میلان اپنی طرف فرما دیا گیا جس سے وہ کسی گناہ میں مبتلاء نہیں ہونے پاتے۔ اور دوسری حفاظت اپنے خاص بندوں اور اولیائے کرام کے ساتھ ہے۔ اگرچہ ان کے قلب و جگر میں گناہوں کا میلان اور شہوات کا تصور و تخیل بوقت غلبۂ بشری گھوم جاتا ہے۔ مگر ان کو بھی خدا تعالےٰ محض اپنے فضل و کرم سے محفوظ فرما لیتے ہیں۔ انہیں لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے۔ ان عبادی لیس لک علیہم سلطان۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو گناہ اور معصیت میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کا ایمان انہیں توبہ اور استغفار پر مجبور کرتا ہے۔ اس لئے بعد از صدور گناہ وہ دربار خداوندی میں آہ و بکا کرتے ہیں۔ جس سے اللہ تعالیٰ ان کے سابقہ گناہوں سے چشم پوشی فرما لیتے ہیں۔ انہیں لوگوں کے بارے میں ارشاد نبوی ہے۔ اِذَا اَحَبَّ اللہ عبداً لم یضرہٗ ذنبٌ۔ مقصود ان مقدمات سے یہ تھا۔ کہ اگر کسی کو بعض مہالک و عوارض لاحق ہو جائیں تو وہ بڑی پامردی اور دلیری و جرأت سے ان کا مقابلہ کرے۔ اور اگر ان میں منہمک ہونے کا خطرہ ہو تو خداوند کریم کی ذات کی طرف رجوع کرے وہی ہر ایک کا معاون و مددگار ہے۔ (اس کے بعد اپنے بیٹے سے خطاب کرتے ہیں) کہ اے فرزند ارجمند! تیرے لئے خداوند کریم کی ذات سے دعاء کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تجھے ہمیشہ اس فقیری اور درویشی طریقہ پر قائم و دائم رکھے۔ یہی اصل الاصول ہے۔ چوں کہ میری عمر کا تقاضاء اب یہ ہے۔ کہ میں شاید کچھ ہی روز کا مہمان ہوں۔ اس لئے اس راستہ میں جو کچھ مجھ سے رہ گیا ہے امید کرتا ہوں کہ آپ اس کی تکمیل کریں گے اس لئے کہ بیٹے کا وجود باپ ہی کا دوسرا وجود ہوتا ہے۔ اور اس دعاء کو کثرت سے پڑھتے رہنا۔

اللّٰھُمَّ انی اعوذ بک من جھد البلاء و درک الشقاء وسوء القضاء وشماتۃ الاعداء اور بندہ اس دعاء کو ان کلمات کی زیادتی سے پڑھتا رہتا ہے۔ اللھم انی اعوذ بک من الحور بعد الکور ومن الشقاوۃ بعد السعادۃ ومن للقطع بعد الوصول ومن الرد بعد القبول ومن الخیبۃ بعد الرجاء ومن المنع بعد العطاء

اور یہ دعا بھی پڑھا کریں۔ اللّٰھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا والاٰخرۃ ان دعاؤں کے پڑھنے سے امید ہے کہ غلط خیالات محو ہو جائیں گے۔ اور اگر حالت قبض بھی طاری ہوگی تو اس ضعیف کی مانند وہ قبض انبساط وذوق وفراغت سے متبدل ہو جائے گا جس کی تعبیر سے میری زبان عاجز وقاصر ہے۔ اب تو خداوند کریم سے راضی ہوں اور اس نے اپنی رحمت کے دروازے میرے اوپر مفتوح کردیئے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا عرض کروں اب تو قلم بھی تھک چکا ہے اس لئے اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔

والعاقبة بالخير

مکتوب نمبر ۵۳

بنام شیخ نورالحق رحمۃ اللہ علیہ

تسویۃ الادانی والاعالی بالخوف والسکوت فی حضرۃ لاابالی

اللہ ورسولہٗ ؎

آہ از استغنائے دلبر آہ آہ   کز تعظم بستہ بر کونین راہ

اللہ کی ذات ستودہ صفات عجب قدرت کی مالک ہے۔ اور اس کے ہاں کسی کی ذاتی وجاہت اور شخصی رعب و دبدبہ نہیں چل سکتا۔ اس کی بے پروائی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ کبھی تو اس سے نہ مانگنے والے پر ناراضگی کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ مجھ سے نہ مانگنے والے میری درگاہ کے راندہ ہیں۔ اور کسی موقعہ پر مانگنے والے سے عدم التفات کیا جاتا ہے۔ اسی لئے صوفیائے کرام کے اس معاملہ میں تین گروہ ہو گئے۔ اوّل وہ لوگ جو کسی چیز کا سوال نہیں کرتے اور کہتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے جمیع احوال سے واقف کار ہیں۔ اور سوال تو اس سے کیا جاتا ہے جو کسی کی حالت سے آگاہ نہ ہو۔ لہذا مانگنے سے کیا فائدہ اور دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اس بات کے قائل ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت سوال کیا جائے۔ ہر ضرورت کی درخواست کی جائے۔ یہاں تک کہ اگر نمک اور جوتے کے تسمہ کی ضرورت ہو تو بھی اس سے حاصل کی جائے۔ اور تیسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ موقعہ و محل کا خیال رکھ کر سوال کیا جائے۔ اس اعتبار سے وہ کہتے ہیں کہ کبھی سائل بن کر سوال کیا جائے اور کبھی سکوت اختیار کیا جائے۔ اور کہتے ہیں کہ دعا تو کام کے حصول کا بہانہ ہے ورنہ یہی ہے کہ ہر انسان کی تقدیر میں جو تحریر کر دیا گیا ہے۔ وہی ملے گا اس سے زائد کسی نہیں مل سکتا۔ اور دعا تو صرف بندہ کی عزت اور کرامت کے اظہار کے لئے ہے۔ اور دعاء کی حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ واقعی دعاء کے بعد عزت وکرامت حاصل ہوتی ہے۔ اور جو لوگوں میں مشہور ہے کہ دعاء تقدیر کو بھی تبدیل

کر دیتی ہے سراسر غلط اور باطل ہے۔ جیسا کہ دنیا کے سلاطین اور ملوک سے ظاہر ہے۔ اور جو کچھ ہوتا ہے وہ تقدیر ہی ہے۔ اور کبھی تقدیر میں یوں بھی لکھ دیا جاتا ہے کہ اگر دعا کریں گے تو کام ہوگا اور دعاء نہیں کریں گے تو کام نہ ہوگا۔ اس صورت میں وہ دعا اپنا مدعا رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اگر دعا سے مدعا حاصل نہ ہوا تو اجر و ثواب تو کہیں نہیں جاتا۔ اور یہ بھی اس کی تقدیر اور مشیت ہے۔ لیکن وہ جو اللہ نے فرمایا کہ میں عمل کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اس بنا پر امید یہی رکھنی چاہیئے کہ اس کا وعدہ سچا ہو لیکن اگر وہ اس کے خلاف بھی فرمالیں تو اس کی ذات لاابالی ہے اس سے کسی کو سوال کرنے کی مجال نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس وعدہ کے اندر کوئی قید اور شرط ہو جس پر بندہ کو اطلاع نہ دی گئی ہو اس لئے اس کی ذات سے اولاً امید اور ثانیاً بیم رکھنی چاہیئے اور یہی تمام مقربان اور بزرگانِ امت کا طریقہ ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے الایمان بین الخوف والرجاء

؎ نو امید مشو کہ رحمت حق عام است مغرور مشو کہ خاصگاں در بیم اند

(یعنی اللہ کی رحمت عام ہے اس لئے نا امید نہیں ہونا چاہیئے اور مغرور بھی نہ ہو کہ اللہ کے خاص بندے بیم میں ہیں۔

بس اسی کا نام مسلمانی ہے۔ باقی تمام گمراہی اور آوارگی ہے۔ یہ کام سب کاموں سے مشکل ترین ہے۔ اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ مسلمان ہونا تمام کاموں سے مشکل ہے۔ اس کے یہی معنیٰ ہیں جو ہم نے اوپر عرض کر دئے۔ اللہم ثبت قلوبنا علی الایمان زبان پر چند کلمات کا جذبات میں نکل جانا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا خمار مستی تو وہ ہے جو بحکم جبلت بشری صادر ہو۔ اور منقول ہے۔ کہ بعضے بزرگ منبر پر چڑھے اور بڑے آہ و بکار سے خداوند کریم سے بارش طلب کی اور دعائیں مانگیں مگر ان کی دعاؤں اور بکاؤں کا کوئی اثر مترتب نہ ہوا تو وہ خجالت اور شرمندگی کا سا منہ لے کر واپس ہوئے اور ہم تو گناہ گار اور سیاہ کار لوگ ہیں ہم سے کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس مالک سے دعاء کرتے رہنا چاہیئے اس لئے کہ اگر اس احکم الحاکمین سے دعاء کرنا ترک کر دینگے تو پھر اور کون سا ایسا دربار ہے جس کا خدا کے دربار سے مقابلہ کیا جا سکتا ہو۔ پھر نفس اعتراض و سوال کرتا ہے۔ کہ جب خداوند کریم سمیع و بصیر، خبیر و علیم جواد و کریم ہیں۔

تو ان سے سوال کرنے کا کیا مطلب اور دعا کرنے کے کیا معنیٰ۔ اس لئے کہ جب وہ سمیع ہوئے تو ہمارے کہے بغیر ہماری کیفیات کو جانتے ہیں۔ ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ جواد و کریم ہیں۔ تو جواد و کریم تو وہ ہے جو بلا مانگے دے پھر اس سے سوال کرنے کا کیا مطلب تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جو اوپر بیان ہوئیں اسی طرح وہ جبار۔ قہار۔ علیم و حکیم بھی ہیں۔ شاید اس کی تقدیر میں ہمارے مانگنے اور سوال کرنے ہی میں حکمتیں اور اسرار موجود ہوں۔ کہ ان کو نفع تب ہو گا جبکہ یہ مجھ سے سوال کرینگے۔ شیخ نصیر الدین محمود قدس سرہٗ کے ملفوظات میں ہے۔ کہ ایک دن لوگ ان کے پاس آئے کہ نماز استسقاء ادا کی جائے وہ کہتے ہیں۔ کہ میں نے نماز استسقاء پڑھائی اور خوب رو رو کر خداوند کریم سے بارش طلب کی مگر کوئی اثر نہ ہوا جب میں واپس آیا تو یہ سب معاملہ سید محمد گیسو دراز سے عرض کیا کہ اللہ نے میرے ساتھ یہ معاملہ فرمایا ہے۔ اب لوگ ہم کو طعنے دینگے اور طرح طرح کی آوازیں کسیں گے۔ آخر کار ان لوگوں کو کسی طرح بتلایا گیا کہ فلاں کوچہ کے اندر ایک مخنث رہتے ہیں اس کے پاس چلے جاؤ وہ دعا کرینگے تو بارش ہو جائے گی چنانچہ لوگ ان کے پاس گئے انہوں نے دعا کی تو بارش ہو گئی — خلاصۂ کلام یہ ہے۔ کہ خداوند کریم کی ذات پر کسی کا دباؤ نہیں چلتا وہ کسی کے تابع نہیں بلکہ سب دنیا اس کے تابع ہے۔ وہ اگر نہ مانے تو بڑے بڑے لوگوں کی درخواست کو رد کر دے اور ماننے پہ آئے تو معمولی معمولی آدمیوں کی مان لے۔ استغفر اللہ واتوب الی اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ واتباعہٖ اجمعین ھذا طریق الحق ومحی علوم الدین۔

مکتوب نمبر ۵۴

بنام شیخ نورالحق رحمۃ اللہ علیہ

تذکیر اھل المجاھدۃ بانَّ المکاتبۃ عین المشاھدۃ

اللّٰہ ورسولہٗ ۔ اللّٰھم کما انعمت فزدو کما زدت فَادِم وکما ادمت فبارک ۔
یہ ایک جامع دعا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ اے اللہ تعالیٰ جس طرح تو نے انعامات کئے اور اس بندے کو اپنی نعمتوں کے ساتھ مخصوص کرلیا ہے اسی طرح اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں کو زیادہ فرما اور نعمتوں کی کمی اور نقصان سے نگرانی فرما۔ اور جس طرح تو نے زیادہ فرمایا ہے۔ اسی طرح ان نعمتوں کو باقی اور دائم رکھ اور ان کے معدوم ہوجانے سے مامون فرما۔ اور جس طرح تو ان کو دوام دے گا اسی طرح ان میں برکت فرما اور ان نعمتوں کو وسعت دے۔ دراصل اس دعا میں شکر کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ شکر کرنے سے نعمتیں بڑھتی ہیں۔ اور صرف شکر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خلوص نیت بھی درکار ہے۔ بغیر خلوص نیت اور نعمتوں پر شکر کرنے کے نعمتوں کا حصول اور دوام قربت نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح جاری ہے کہ اس نے بعض چیزوں کو بعض چیزوں اور اسباب کے ساتھ مربوط کر رکھا ہے۔ وہ مخلوق کے تمام کاموں کو اپنی تقدیر و تدبیر سے فرماتا ہے ۔ اور نعمتوں کا عنایت فرمانا یہ اس کا فضل ہے۔ اور اس فضل کو کسی سبب سے مسبب کرنا اور اس سبب کو پیدا فرمانا یہ بھی اس کا فضل ہے۔ تمام فضل اسی کے ہیں۔ واللہ ذوالفضل العظیم۔ اللہ تعالےٰ نیک بختوں کو مزید نعمتوں سے مالامال کرے اور ان کی دل کی روشنی کو جو سرمایہ عزت و قبول ہے۔ ہمیشہ اور پائندہ رکھے ۔ اللہ تعالیٰ کا علم تو محیط ہے جس طرح انسان کا کمال دو قسم پر ہے اسی طرح اللہ کی نعمتیں بھی دو قسم پر ہیں۔ ظاہری و باطنی۔ محسوس و معقول صورت و معنیٰ۔ خلق و خُلق۔ دنیا و آخرت۔ بہت سعادت مند ہیں وہ لوگ جو ان دونوں

نعمتوں سے نوازے جائیں۔ یہ ہے کمال جامعیت۔ اور نشان جامعیت یہ ہے۔ کہ ان صوفیائے کرام میں داخل ہو جانا چاہیئے جو اس راہ کے بادشاہ ہیں جنہوں نے واسطہ بواسطہ اس ترقی و عروج کو حاصل کیا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ان سے خط و کتابت رکھی جائے خط و کتابت کو لوگ نصف مشاہدہ (ملاقات) کہتے ہیں۔ جب نصف نصیب ہو جائے تو مکمل ہونے کی بھی امید ہے۔ اگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو پھر یوں عرض کروں گا کہ اگر ایک خط نصف ملاقات ہے تو اس کے بعد دوسرا بھی نصف ہے ان دونوں کو جمع کیا جائے تو پوری ملاقات ہوگئی۔ لہذا معلوم ہوا کہ مکاتبت عین مشاہدہ ہے۔ اور اگر یہی مکاتبت متوالی اور متواتر ہو جائے تو کئی مشاہدے ہو جائیں۔ اگر کوئی ظاہر بیں یوں کہے کہ بوقت ملاقات متکلم اور مخاطب دونوں حاضر ہوتے ہیں اور جس کو آپ ملاقات قرار دے رہے یعنی مکاتبت اس میں متکلم کا کلام حاضر ہے اور اس کا وجود غائب ہے۔ پھر اس کو مشاہدہ سے کیسے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت شناس اور حقیقت بیں کے نزدیک یہ شیطانی دھوکہ ہے۔ بلکہ اس میں بھی دونوں حاضر ہوتے ہیں۔

جیسے کسی نے کہا ہے ؎

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار　　جب ذرا گردن جھکالی دیکھ لی

اس جگہ ایک نکتہ سمجھ میں آیا۔ کہ ایک شخص پردہ کو دیکھتا ہے۔ اس سے (تو اپنا محبوب) محجوب ہے۔ اور دوسرا وہ شخص ہے جو پردہ کے اندر والی چیز دیکھتا ہے وہ مشاہدہ کرنے والا ہے۔ آخر یہ دیکھنا اور سننا سب پردہ کی موجودگی میں ہے۔ اگر پردہ اٹھ جائے تو نہ سننا رہے اور نہ ہی دیکھنا ؎

ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو
چوں پردہ بر افتد نہ تو مانی نہ من

(یعنی میری اور تیری نسبتیں اس وقت تک قائم ہیں جب تک پردہ ہے۔ جب یہ پردہ اٹھ جائے گا نہ تو رہے گا اور نہ میں اسکو کسی نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

وہی حق ہی حق ہے نہ میں ہوں نہ تو ہے
انا، انت کی لغو یہ سب گفتگو ہے۔ از مترجم

اس مضمون کو دوسرے رسالوں میں بڑے بسط سے لکھا گیا ہے۔ ان میں دیکھ لیا جائے۔

اس جگہ میرا روئے سخن کسی اور طرف تھا اور قلم کی طغیانی اور جولانی کہیں اور لے گئی۔ اصل تو مکاتیب کے سلسلہ میں عرض کر رہا تھا۔ سو میرے جتنے مکاتیب ہیں اگر ان کو اول سے آخر تک حرف بحرف دیکھا جائے تو بحمد اللہ مفید ثابت ہوں گے اگر ان مکاتیب کو کوئی اپنی خلوت کا ساتھی بنالے تو عجیب ذوق محسوس کرے۔ زیادہ گستاخی بہتر نہیں

عاقبت بخیر باد

استغفر اللہ واتوب الی اللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ وصلی اللہ علی سید الانام الداعی الی طریق الحق والیقین محمد وآلہ وصحبہ واتباعہ اجمعین ھداۃ طریق الحق ومحی علوم الدین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مکتوب نمبر ۵۵

بنام شیخ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ

تبصرۃ الاغنیاء بان الفقر مراۃ جمال الغناء

اللہ ورسولہٗ۔ دل کانپ رہا ہے زبان سے قوت گویائی مسلوب ہے اور قلم لکھنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ کاغذ پیچ در پیچ کھا رہا ہے۔ ان حالات میں سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں اور کہاں دم ماروں۔ اور کہاں راہ پاؤں ادھر خداوند کریم کی عظمت اور جبروت پیش نظر ہے۔ جس کی وجہ سے خاموش بیٹھا ہوں۔ اور ادھر اپنی ذات کو دیکھتا ہوں تو سوائے عجز و بیچارگی اور ضعف و ناتوانی کے اور کچھ نہیں پاتا۔ اب یہ سوچ رہا ہوں کہ میں خداوند کریم سے اسی طرح خطاب کروں جیسے عرفاً فقراء لوگ امراء سے کیا کرتے ہیں۔ یا باعتبار حسن خلق و تواضع کے۔ ان سب باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پھر بھی اس مضمون کو شروع کرتے ہوئے ڈر رہا ہوں کہ کہیں افراط و تفریط میں نہ چلا جاؤں اور حالانکہ خیر الامور اوسطھا ہوا کرتے ہیں۔ لیکن توکلاً علی اللہ شروع کرتا ہوں۔

بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا کہ کیا اچھا ہے وہ امیر جو فقیروں پر طلب ثواب کی نیت سے مہربان رہتا ہے۔ اور خدا کی رضا چاہتا ہے۔ اور کیا ہی اچھا ہے وہ فقیر جو اپنے فقر سے امیروں پر ناز کرتا ہے اور اللہ کی قدرت اور اس کے غناء پر نظر رکھتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے جن کو مال و منال سے نوازا ہوا ہے غیر کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ اور جن کو دنیا سے بے نیازی سے نوازا ہے اس میں بھی غیر کو راہ نہیں غرضیکہ مال و منال اور بے نیازی یہ دو جدا جدا راستے ہیں۔ جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر تونگروں کو نیازمندی کرنی ہو تو درویشوں سے کریں۔ اور اگر درویش حقیقی ہوں تو وہ ان کی دعا سے نصرت کریں۔ اور توجہ اور امداد باطن سے مدد کریں جو ہزار لشکر سے بھی زیادہ قوی اور

طاقتور ہے۔ اور اگر درویش مجازی ہوں تو ان کا فقر تونگروں کے غناء کے جمال کا آئینہ ہوں اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بالا و برتر ہے اس کی ذات کسی نقص سے متصف نہیں اس نے اپنے بندوں کو صرف بندگی کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ تاکہ وہ اپنے جمال و کمال کا مظاہرہ کرے اور اس کو ظاہر و آشکارا فرمائے۔ جیسے حسن والوں کو اپنے حسن کے ظاہر کرنے کیلئے آئینہ چاہیئے اگرچہ ان کا جمال آئینہ کا محتاج نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنے حسن و جمال کو ظاہر و آشکارا کرنے کی غرض سے پیدا فرمایا۔ اور محبت طرفین سے پیدا ہوتی ہے اور خود محبت ایک ایسی نسبت ہے جو دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ اور ہر ایک پر اپنا پرتو اور رنگ ڈال کر جدا جدا نام رکھتی ہے۔ اور ہر دو کے درمیان ناز و نیاز کو لاتی ہے۔ اگر ان میں دوئی اور غیریت اٹھ جائے تو دونوں ایک ہیں۔ لیکن لذت تو دوئی مائی اور توئی وغیرہ میں ہے اس لئے کہ پیدائش عالم اسی سے ہے۔ میرا روئے سخن تو دعا کی طرف تھا اور چلا کہیں اور گیا۔ لیکن الحمد للہ کہ محبت کی جانب گیا ہوں جو کہ سب کاموں کا خلاصہ ہے اور دعا بھی تو محبت سے ہوتی ہے۔ اور محبت کے دو سبب ہوتے ہیں۔ اگر کسی سے کوئی محبت کرتا ہے تو اولاً اس لئے کہ وہ حسین و جمیل ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ اس نے محبت کرنے والے پر احسان کیا ہے۔ ہم نے ہزاروں کو دیکھا ہے کہ وہ لوگوں کے حسن پر یا احسان پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں تو محبت اپنے کمالِ عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ اور حقیقۃً یہ دونوں صفتیں خداوند کریم میں جو رب الارباب ہے بدرجہ اتم واکمل موجود ہیں۔ اسی کا اثر ذرا ذرا دوسری مخلوق کے افراد پر ہے۔ خصوصاً افراد انسانی کہ یہ خداوند کریم کی اوصاف کا مورد و مظہر ہیں۔ سعادت مند ہیں وہ لوگ جن کے اندر ان اوصاف نے بدرجۂ اکمل جگہ کر رکھی ہے۔ اور وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ شکر کرنے سے نعمتوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اگرچہ شکر کی ادائیگی کی حقیقت عقلاً محال ہے۔ لیکن شریعت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ہر نعمت پر شکر متعین فرما دیا ہے۔ اور اس کے ادا کرنے کے طریق بھی بتلا دئے ہیں۔ مثلاً ؎

سر بنجشد شکر خواہد سجدہ پائے بخشد شکر خواہد قعدہ

(یعنی اللہ نے سر دیا اور اس کا شکر سجدہ ہے اور پاؤں دئے ان کا شکر قعدہ ہے)

یہ تو عبادات بدنیہ میں ہے اور اسی پر عبادات مالیہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔
والتوفیق من اللہ۔ اس جگہ ایک نکتہ یاد آگیا اس کو بھی عرض کئے دیتا ہوں وہ یہ ہے
اصل تو شکر بندے کی طرف سے ہونا چاہیئے لیکن قرآن میں اللہ نے شکر کی نسبت اپنی طرف
بھی فرمائی ہے چنانچہ فرمایا واللہ شکور حلیم۔ یعنی بندے اللہ کے شکر گذار ہوں تو
اللہ تعالیٰ ان کا شکر ادا کرتے ہیں یعنی بندوں کو جزائے شکر دیتے ہیں اور شکر سبب مزید
نعمت بنتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ تو پھر اس کے دل
میں مزید محبت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی شکر بندہ مزید نعمت کا سبب بنتا ہے۔ اور شکر
مولیٰ موجب مزید محبت ہے بندہ سے۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان

عاقبت بخیر باد

مکتوب نمبر ۵۶

بنام شیخ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ

اسقاط اعتبار الاجساد والاشباہ عند ملاقات القلوب والارواح

اللہ درسولہٗ۔ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اس کے علم نے تمام دنیا اور اس کی چیزوں کو گھیر رکھا ہے۔ بسم اللہ فاتح الوجود ہے۔ اور الحمد للہ مظہر کل موجود ہے۔ اور لا الٰہ الا اللہ سرِ توحید ہے۔ اسی اللہ سے ابتداء ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ ادراک سے پاک و منزہ ہے وہ احد و واحد ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں وہ جس طرح پہلے تھا اسی طرح اب بھی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ایک ایسا کنز اور خزانہ ہے۔ کہ اس کے پڑھنے سے خیر و برکت نازل ہوتی ہے اور برائی و شر بھاگ جاتے ہیں۔ اور انا للہ وانا الیہ راجعون کو ہر مصیبت کے وقت اور ہر حال میں پڑھنا مفید ہے۔ اور اسی اللہ ہی کی طرف رجوع ہوگا وہی ہر ایک کا مرجع اور مآل ہے۔ وہی اول، آخر، ظاہر، باطن ہے اور ہر چیز کو اس کے وجود میں آنے سے پہلے اور بعد میں جاننے والا ہے۔ کوئی چیز اس کی ذات کے علاوہ نہیں بلکہ بالحقیقت باقی چیزیں تو کالمعدوم والمفقود ہیں۔ اور اسی کیلئے ہے احاطۂ واسعہ حقیقت جامعہ۔ سر قائم۔ ملک دائم اور حکم لازم وہ بزرگی والا اور بڑی شان و شوکت کا مالک ہے۔ وہی حامد اور محمود ہے۔ اور صلوٰۃ و سلام ہو ایسی ذات پر جو اول ہیں ایجاد میں جو قائم ہیں کمال عبودیت کے ساتھ۔ اور صلوٰۃ و سلام ہو آپ کی اولاد پر اور اصحاب پر جو آپ کے اسرار و انوار کے خزانہ تھے۔ اور حقائق کے کنوز تھے اور مخلوق کو ہدایت کرنے والے تھے۔ اور صلوٰۃ و سلام ہو آپ کے تمام اولیاء پر جو طریقِ حق کے ہادی اور علوم دینیہ کو زندہ کرنے والے ہیں۔ وسلم تسلیما کثیراً سبحان اللہ وما انا من المشرکین حسبی اللہ ونعم الوکیل ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

ان کلمات کو کمل العارفین نے اپنے قلم سے لکھا تھا اس مکتوب کے اندر جو انہوں نے حرمین شریفین کے بعض سادات کی طرف روانہ کیا تھا۔ وہ کلمات یہ ہیں۔ (یعنی ان کا ترجمہ)

امابعد۔ ہمارے بڑے مرتبے والے کا بڑے مرتبے والا مکتوب پہنچا جن کا نام سید عارف باللہ مولانا علم اللہ بن عبداللہ جو اولیائے کرام کی اولاد میں سے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان سے راضی ہوں اور وہ اللہ سے۔ یہ ایک ایسا خط تھا۔ جو قلوب میں جلا پیدا کرنے والا تھا۔ اور عہد محبت کی تجدید کرنے والا عزم وصال کو مصمم کرنے والا تھا جس میں ارض مبارک کا تذکرہ بھی تھا۔ اللہ اس ارض کو باعتبار برکت کے زیادہ کرے۔ اور یہ عبد ضعیف اس ارض میں ایک مدت مرید گذار کر اس کے فیض سے مستفیض ہوتا رہا ہے جس زمانہ میں سید شیخ عبدالوہاب متقی جو ہند کے مشہور و معروف مشائخ میں سے ہیں موجود تھے۔ اور اہل یمن نے مکہ والوں کو اس بزرگ کی تعریف میں متعدد خطوط لکھے تھے۔ شاید آپ نے یہ بات مکہ والوں سے بھی سن لی ہوگی۔ اور آپ کے فضائل کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کر لیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں۔ وہ اس مقام پر بڑے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور سب لوگوں میں مشہور بزرگ ہیں، وہ اپنے زمانہ میں یکتا ہیں۔ وہ کسی کی تعریف وتوصیف کے محتاج نہیں۔ اب تو اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے درمیان ملاقات کا راستہ کھول دیں اس لئے کہ ان کے اوپر تو کوئی چیز بھاری اور مشکل نہیں۔ اس لئے کہ وہ تو ہر چیز پر قادر ہیں۔ اور اگر جسمانی ملاقات نہ ہو سکے تو دلوں اور قلوب ہی کی ملاقات سہی جو واقع ہے۔ اور محبت کے راستہ میں کوئی روکاوٹ نہیں ہوتی نہ کم اور نہ ہی زیادہ میرے دل میں السید حاتم الیمنی المغانی رحجو بڑے بزرگوں میں سے ہیں کی ایک بات گھوم رہی ہے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے جمیع مضامین الہامیہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے دل کی خواہش کو محض خداوند کریم کی رضا یا اس سے ڈر کر ترک کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ایک ایسی حیات عطاء فرماتے ہیں۔ جس سے وہ ہر ایک کا عزیز اور محبوب بن جاتا ہے۔ اور اس سید حاتم یمنی نے شیخ عبدالوہاب کی زیارت کا قصد کیا۔ اور مخا سے مکہ تک اسی غرض سے تشریف لائے۔ آپ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور حرم میں بیٹھ گئے۔ اور شیخ سے مجلس میں

داخل ہونے کی اجازت چاہی لیکن شیخ نے اجازت نہ دی۔ اور شیخ نے یہ فرمایا کہ ملاقات القلوب اوقع۔ کہ دلوں کی محبت اس سے زیادہ وقیع ہے۔ پس سید حاتم بڑی خوشی سے واپس لوٹ گئے۔ میں نے یہ حکایت ایک بڑے بزرگ کے سامنے بیان کی تو وہ بڑے تعجب سے فرمانے لگے کہ ہاں اہل استقامت کا یہی مقام ہوتا ہے جس کو اہل رسوم کب معلوم کر سکتے ہیں۔ اے سیدی آپ زمین کے ایک ایسے بقعہ میں نزیل ہیں جس کی مثل اور کوئی ٹکڑا نہیں اور اس کے رہنے والے سب اہل فلاح وصلاح ہیں جو صبح وشام خداوند کریم کے ذکر اور عبادت میں مصروف ہیں۔ بارك الله لنا ولكم ولسائر المسلمين

اقول قولی هٰذا واستغفر الله ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم۔

مکتوب نمبر ۵۷

بنام شیخ نور الحق رحمتہ اللہ

ذکر الاحوال والاقوال المنبھۃ علی رعایۃ طریق الاستقامۃ والاعتدال

اللہ ورسولہٗ: سب تعریف اس ذات کے لئے ہے جس نے خاص کر لیا اپنے بندوں کو توحید کے اسرار ظاہر کرنے پر اور خاص کر لیا ان کے باطنی نور کو چمکتے ہوئے نور سے۔ اور اپنے فضل واحسان سے۔ اور پہنا دیا ان کو معرفت کا لباس اپنے لطف وامتنان سے چنانچہ ہو گئے ان کے لئے اللہ کے اسماء اور صفات لباس۔ اور وہ حقیقی بندے بنا دئے گئے۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا اور شہادت دیتا ہوں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں جنہوں نے اپنی امت کو ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کے نور میں داخل کیا، اور آپ کے آل و اصحاب پر تحفہ سلام ہو۔

اما بعد: میری طرف بزرگ محترم کی طرف سے ایک خط بلکہ کئی خطوط موصول ہوئے جو معرفت کے اسرار سے لبریز تھے اور جن کے سمجھنے سے اذہان قاصر تھے اگرچہ اس کے مضامین تکرار سے تھے اور ان کے الفاظ کی موجیں ایک دوسرے کے مشابہ تھیں، لیکن ہر ایک موج کے موتی جدا رنگ کے تھے اور ہر موج کی شوکت وشان علیحدہ تھی جن کو دیکھ کر عقل ونظر حیران و دنگ رہتی تھی مگر باوجود ان خصوصیات کے اے میرے سردار میں ان کے بیان اور اظہار سے معذور ہوں اس لئے کہ میرے شیخ سید عبدالوہاب نے مجھے وصیت کر رکھی ہے۔ کہ حقائق و دقائق کے بیان کرنے سے گریز کروں اور مخلوق خدا کو معاملات وغیرہ کی تعلیم دوں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا۔ کہ تو فقیہ صوفی بن نہ صوفی فقیہ۔ اور امام غزالیؒ کی کتابوں مثلاً احیاء العلوم وغیرہ کے مطالعہ کرنے کی بھی وصیت فرمائی تھی۔ اور اسی طرح یہ بھی وصیت فرمائی تھی۔ کہ میں نہ کلام کروں مگر دین وملت کے ان احکام وامور پر جن سے

دین کی ترویج ہوتی ہو۔ وہ بھی اس طرح کہ جس سے عقائد محفوظ رہیں اور سنت کے احکام میں سرمو فرق نہ آنے پائے۔ اور منع فرما دیا تھا واقع ہونے سے تاویلات باطنیہ میں کہ جس سے سوائے حسرت و ندامت کے اور کچھ حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ میرے شیخ سے راضی ہوں۔ ان کے بارے میں بہت سی حکایات اور روایات مشہور و معروف ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔ کہ ایک دن آپ کے سامنے ایک کتاب موجود تھی جس کو آپ پڑھ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا یا سیدی یہ کیا کتاب ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔ اس کو کس نے لکھا۔ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب ہے جس کا نام ہے الانسان الکامل اس میں شیخ ابن العربی کے طریقہ پر اسرار و حقائق بیان کئے گئے ہیں۔ اور اس کو شیخ عبدالکریم حنبلی یمنی نے لکھا۔ اور اسی بزرگ کی ایک تفسیر بھی ہے جس میں انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی انیس ۱۹ جلدوں میں تفسیر کی ہے۔ اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ ہر حرف پر ایک جلد لکھی ہے۔ اور میرے شیخ نے فرمایا کہ میں نے اس کی چار پانچ جلدیں دیکھی ہیں جس میں اس طرح کلام کیا گیا ہے کہ جس کے سمجھنے پر ذہن قادر نہیں۔ اور اگر کوئی سمجھ بھی لے تو اس کے بیان کرنے پر کسی کو قدرت نہیں۔ ان کی شان تصنیفات میں اکثر یوں ہی ہوتی ہے وہ یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی صحرا، اور جنگل میں سیر کر رہے ہیں لیکن ان کی اکثر کتابیں عشق و محبت کے زہر سے بھر پور ہوتی ہیں عام لوگوں کے لئے ان کا پڑھنا ہلاک ہونے کے مترادف ہے۔ اسی لئے میرے شیخ ان کی کتابیں کسی کو نہیں دیا کرتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میرے شیخ کے پاس ایک شخص فتوحات مکیہ لایا۔ اور وہ نسخہ صحیح اور بہترین تھا۔ میں اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا تو شیخ میرا مطلب سمجھ کر فرمانے لگے کہ کیا تو اسے خریدنا چاہتا ہے۔ میں نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو حاصل کر لوں گا فرمایا خرید لو مگر اس کی مبہمات میں نہ جانا۔ جو باتیں واضح اور بین ہوں انہیں محفوظ کرنا۔ لیکن اس کے ساتھ حسن اعتقاد کا ضرور خیال رکھنا میری یہ بات مان لیگا تو بچ جائے گا۔ اور فرمایا کہ سیدی احمد بن رزوق کی ایک کتاب بنام "قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ" جو بڑی عجیب کتاب ہے۔ جو جمع کرتی ہے فقہ اور تصوف کے راستہ کو۔ اس سے نہیں فائدہ اٹھا سکتا مگر وہ فقیہ جو جمیع احوال سے واقفکار ہو۔ اور صوفی محقق جس نے اپنی زندگی کو اعمال شرعیہ

سے متقید کیا ہوا ہو۔ اور اس فقیر نے اس کا فارسی میں ترجمہ کر کے "مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین" نام رکھا ہے میری تصنیف و تالیف میں یہی عادت ہے کہ میں بزرگوں کے اقوال کو اپنی کتابوں میں جمع کرتا ہوں اور انہیں کے اقوال کی طرف مراجعت کرتا ہوں۔ اور میری تالیفات کی تعداد اسی سے نوے تک پہنچ چکی ہے۔ میرے شیخ نے مجھے علاوہ الفصوص کے وہ سب کتابیں پڑھائیں جو میسر ہو سکیں اور ان کے تعلم اور تعلیم کی اجازت دی مگر فصوص کی تعلیم اور تعلم کی آپ نے مجھے اجازت نہیں دی۔ اور میرے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ کسی کو کتابوں سے سلوک و تصوف حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ راستہ تو صرف عمل اور شریعت کی اتباع سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ سالک کے لئے اولاً ضروری ہے۔ کہ اپنے عقائد کو اہل السنت والجماعت کے مطابق بنائے۔ اس لئے کہ ان کے عقائد وہی ہیں جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے منقول ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی کتب کا مطالعہ کرے تو کوئی حرج نہیں لیکن اسی شرط مذکور کے ساتھ کہ وہ مبہمات میں نہ گھسے۔ اگر تم اولیائے کرام کی باتوں کو بظاہر کتاب و سنت کے خلاف دیکھو تو اولاً ان چیزوں کی نسبت ان لوگوں کی طرف نہ کرو۔ (بلکہ یوں کہو کہ کسی نے ان کی طرف یہ بات منسوب کر دی ہے۔ اور کتابوں میں غلط طور پر اس کا اندراج ہو گیا حقیقۃً یہ بات ان کی شان سے بعید ہے) اور ثانیاً اس کی تاویل کرو۔ اور ان کی بات کو دلائل شرعیہ سے منطبق کر دو۔ اور اگر تطبیق و تاویل دونوں محال ہوں تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس میں توقف اختیار کیا جائے۔ اور ان بزرگوں پر طعن و سب وغیرہ سے کف لسانی کی جائے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ایسی باتیں حالت جذب و سکر میں کہی ہوں جس میں وہ عند اللہ معذور ہوں۔ اور ان کے اس قول و عمل سے طریق تصوف کو بھی بُرا نہ کہا جائے اس لئے کہ یہ طریق ابن عربی وغیرہ کی کتابوں مثل فصوص و فتوحات میں منحصر نہیں۔ اور تصوف کی حقیقت تو یہ ہے۔ کہ انسان اللہ کی طرف اس عقیدہ سے متوجہ ہو جائے کہ وہ راضی ہو جائیں جیسا کہ مقامِ احسان ہے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ (اس کے بعد مسئلہ وحدت الوجود بیان فرماتے ہیں) میرے دل اور باطن نے ہمیشہ اس بات کی شہادت دی ہے کہ اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں۔ اس کے علاوہ میری عقل اور کسی بات کو نہیں سمجھ سکتی۔ لوگ تو اس معاملہ میں عقل

کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک وہی محقق اور حق ہے جس کو میں نے عرض کر دیا ہے میرا باطن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا تو کوئی چیز نہیں اللہ تعالیٰ تو اول سے اکیلے ہی ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی نہیں تو اب ان کے ساتھ کون آگیا۔ اور ممکنات کی حقیقۃ تو معدوم ہے۔ اللہ میں جو ظاہر ہوتا ہے۔ وہ حق ہی حق ہے۔ وہ اشیاء کے ایجاد کی صورت میں ہو یا اظہار میں۔ جیسے کہ کسی نے کہا ہے ؎

عبارا تنا شتّٰی وحسنک واحد

(یعنی آپ کے حسن کو بیان کرنے میں ہماری عبارات مختلف ہیں مگر آپ کا حسن تو ایک ہی ہے) اور میرے نزدیک تو ایجاد عالم کو تسلیم کرنا ہی وحدۃ الوجود ہے۔ اس لئے کہ وجود حقیقی تو اللہ کے سوا کسی کا نہیں اور بعض عارفین سے منقول ہے۔ کہ مخلوق کی کثرت کو دیکھ کر خداوند کریم کی توحید سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور فارسی کے اندر اس مسئلہ کو تین طرح اور تین قسم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمہ از اوست۔ وہمہ بدوست۔ ہمہ اوست۔ جس کے باطن میں توحید غالب آجاتی ہے وہ ہر عبارت اور اشارہ سے توحید کو سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کو خداوند کریم کی ذات کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ نہ اس کے عقیدہ میں کوئی ضرر ہے اور نہ ہی نافع۔ علاوہ ازیں وہ خداوند کریم کے عشق میں مخمور ہو کر طالب بن کر جستجو کرتا ہے اور اس راستہ میں جان تک کی بازی لگانی پڑے تو گریز نہیں کرتا۔ (اس کے بعد دیار حبیب میں اپنی حاضری کا مختصر سا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حاضری کا ایک عجیب سبب بنا اور اس سبب کو ذکر نہیں فرمایا بلکہ حوالہ دے دیا کہ اس کو میں نے اپنی کتاب "جذب القلوب الی دیار المحبوب" میں ذکر کر دیا ہے) اے میرے شیخ میں نے خط کا سلسلہ بہت طویل کر دیا۔ اس طوالت کا سبب یہ ہوا کہ حقیقۃً میرا دل آپ کی ملاقات کرنے کو بے قرار ہے مگر وہ تو ہوئی نہیں تو سمجھا کہ اگر وہ ملاقات نہیں تو یہ معنوی ملاقات ہی حاصل کر لوں اس لئے خط اس طرح تحریر کر رہا ہوں جیسے آپ کے پاس موجود ہوں۔ لیکن باوجود اس کے خطا کار ہوں اس لئے خداوند کریم سے استغفار کرتا ہوں کہ میری تحریر میں جو ہفوات و ہذلیات ہیں۔ ان کو معاف فرمائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مکتوب نمبر ۵۸

بنام شیخ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ

تحصیل الغنائم والبرکات بتفسیر سورۃ والعادیات

اللہ ورسولہٗ۔ والعادیات ضبحا۔ اللہ تعالیٰ ان غازی گھوڑوں کی قسم اٹھاتے ہیں جو بھاگتے وقت ہانپتے ہیں۔ اور گھوڑے کی آواز کے تین نام ہیں۔ اول صہیل یعنی ہنہنانا جیسے کہ گھوڑوں کی عام عادت ہوتی ہے۔ دوسرا حمحمہ جو گھاس وغیرہ کی طلب کے وقت آواز نکالتے ہیں۔ تیسرا ضبحؔ۔ جو دوڑتے وقت آواز نکالتے ہیں۔ حدیثوں کے اندر گھوڑوں کی بہت کثرت سے فضیلت واقع ہے۔ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ الخیر معقود فی نواصی الخیل کہ بھلائی گھوڑوں کی پیشانی کے بالوں کے ساتھ باندھ دی گئی ہے۔ اس لئے کہ ان سے دین کا اعلاء اور کفار کی سرکوبی کی جاتی ہے۔ فالموریات قدحًا۔ پس باہر لانے والے ہیں آگ کو پتھر سے اپنے پاؤں کے ساتھ۔ اور یہ حالت بھاگتے وقت اکثر وبیشتر واقع ہوتی ہے۔ فالمغیرات صُبحًا پس غارت کرنے والے ہیں صبح کے وقت۔ یہ صفت سواروں کی ہے۔ چونکہ وہ بواسطہ گھوڑوں کے کرتے ہیں اس لئے ان کی طرف نسبت کر دی گئی۔ اور غارت اکثر صبح کے وقت ہوتی ہے۔ اس لئے صبح کا تذکرہ کر دیا گیا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جس شہر یا بستی کو صبح کے وقت غارت کرتے تو پہلے اس کے نزدیک تشریف لے جاتے اگر ان سے کوئی ایسی بات سن لیتے جو اسلام کی علامت ہوتی تو ان پر حملہ نہ فرماتے اور اگر ان میں اسلام کی علامت محسوس نہ فرماتے تو حملہ فرما دیا کرتے تھے۔ فاثرن بہٖ نقعًا۔ پھر وہ صبح کے وقت غبار اڑاتے ہیں۔ جو دشمن پر ٹوٹ پڑنے اور اس کے بھاگنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ فوسطن بہٖ جمعًا۔ پھر اس وقت دشمنوں کے گروہ میں جا گھستے ہیں۔ یعنی ان پر حملہ کرتے اور انہیں برباد کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ نے جو اس جگہ گھوڑوں کی قسم کھائی ہے تو وہ حقیقت میں غازیوں اور سواروں

کے مقام وعزت کو ظاہر کرنا ہے۔ اس لئے کہ گھوڑا تو از قسم حیوانات ہے اس کی قسم کھانے کا کوئی مطلب ہی نہ تھا قسم تو صرف غازی کے مقام ومنزلت کے ظاہر کرنے کی خاطر کھائی گئی ہے۔ ان الانسان لربہ لکنود۔ انسان اپنی بشری جبلت کے مقتضیٰ کے مطابق خداوند کریم کی ذات کا واقعی ناشکر گذار ہے۔ اور نافرمانی کرنے والا اور بخل کرنے والا ہے کنودؔ کے تین معنی آتے ہیں۔ جو ہم نے عرض کر دئے بعض کہتے ہیں کہ انسان سے مراد عبداللہ بن ابی مناف ہے اور یہ سورت اسی کی مذمت میں نازل ہوئی ہے۔ یہ درست معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ اس سے قبل تو غازیوں کا ذکر اور گھوڑوں کی قسموں کا بیان ہے۔ مناسب یہی ہے۔ کہ جب اللہ نے ان کو فتح اور کامرانی اور دشمن پر حملہ کرنے کی توفیق عنایت فرمائی وہ اللہ کے شکر گذار بندے بنیں مگر اکثر اس کا خیال نہیں کرتے اور وہ اس کو اپنا ہی کمال تصور کرتے ہیں۔ وانہ علیٰ ذالک لشھید اور تحقیق اس انسان کو خود بھی اس کی خبر ہے۔ یعنی وہ اپنے بخل اور کنود پر خود شاہد ہے۔ اگرچہ غفلت کی وجہ سے اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وانہ لحب الخیر لشدید اور تحقیق انسان مال کی محبت میں بہت سخت ہے۔ اور خیر بھی مال کثیر کے معنیٰ میں قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر مستعمل ہوا ہے۔ اور مال کو مال اس لئے کہتے ہیں۔ کہ انسان طبعاً اس کی طرف مائل ہے۔ اور اگر اس کو خدا کی راہ میں صرف کیا جائے تو اس میں خیر اور بھلائی بھی ہے۔ اور شدید کے معنیٰ بخیل کے بھی آتے ہیں۔ اس صورت میں معنیٰ یوں ہوں گے کہ انسان مال سے اتنی محبت رکھتا ہے کہ اس پر شکر گذاری نہیں کرتا۔ اور خدا کے راستہ میں اس مال کو صرف نہیں کرتا بلکہ کفران نعمت کرتا ہے۔ افلا یعلم اذا بعثر مافی القبور کیا اس کو وہ وقت معلوم نہیں کہ جب زندہ کئے جاویں گے جتنے مرے قبروں میں ہیں وحصل مافی الصدور اور آشکارا ہو جائے گی ہر وہ چیز جو دلوں میں ہے۔ بھلائی اور برائی خیر و شر سب آشکارا ہو جائے گی۔ اور صدور کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے۔ کہ اگرچہ صدور کے علاوہ دیگر اعضا سے بھی اعمال صادر ہوتے ہیں مگر وہ سب قلوب کے اعمال کی فرع ہوتے ہیں اصل القلوب ہیں۔ اس لئے فرع کا اعتبار نہیں کیا گیا ان ربھم یومئذٍ لخبیر۔ بے شک ان کا پروردگار ان کے اس دن کے حال سے پورا واقف ہے۔ اس لئے تمام اقوال وافعال میں خداوند کریم کا خوف وتقویٰ اختیار کیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرآن کا

ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ ظاہر تو وہ قواعد و احکام ہیں جو ہر ایک کو نظر آتے ہیں اور باطن وہ ہے کہ اس کے ظاہر سے کسی اور طرف ایمار و اشارہ کیا گیا ہو۔ اس سورت کے اندر اگرچہ ظاہراً گھوڑوں اور غازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ مگر باطن میں اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جو خدا کی راہ میں کمربستہ ہوکر چلتے ہیں۔ عادیات یعنی اللہ کی راہ میں چلنے والے کمال کے حصول کی خاطر ہانپتے ہیں۔ الموریات۔ یعنی وہ اپنے افکار کو انوار معرفت سے جلا دیتے ہیں۔ والمغیرات یعنی وہ اپنے نفس پر حملہ کرتے ہیں۔ اور اس پر غالب آجاتے ہیں۔ فاثرن بہٖ نقعًا وہ اس راستہ میں دوڑتے ہوئے غبار اڑاتے ہیں۔ فوسطن بہٖ جمعًا۔ پھر وہ عالم علوی میں گھس جاتے ہیں۔ قسم تو اللہ نے ان نفوس کاملہ کی کھائی ہے۔ پھر آدمی کمالات کی تحصیل میں بہت کچھ غلطیاں کرتا ہے کبھی کفران نعمت کر بیٹھتا ہے۔ اور تعلقات جسمانی کی وجہ سے اس کو اپنی تقصیر کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ کیا تجھے وہ روز یاد نہیں کہ جس دن سب پردے اٹھ جائیں گے۔ اور حقیقت منکشف ہوکر واضح ہو جائے گی۔ پس چاہیئے کہ اللہ کی ذات کے مراقبہ کو لازم پکڑا جائے۔ اور غفلت و فراغت سے بھاگا جائے۔ واللہ اعلم ۱۲

مکتوب نمبر ۵۹

ترجمہ اس مکتوب گرامی کا جس کو سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ (جو اجلہ صحابہ کرام علیہم الرضوان میں سے ہیں۔) کے بیٹے کی تعزیت میں تحریر فرمایا تھا

ترجمۃ مکتوب النبی الاجل فی تعزیۃ ولد معاذ بن جبل

من محمد رسول اللہ الی معاذ بن جبل۔ کہ یہ خط محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذ بن جبل کو لکھا جاتا ہے۔ سلام علیک۔ تجھ پر ہر مصیبت اور آفت سے امن و سلامتی ہو خصوصاً بے صبری اور جزع و فزع سے۔ فانی احمد الیک اللہ الذی لا الہ الا ھو: میں یقیناً اس ذات کی حمد و ثناء کرتا ہوں جس کے سوا کوئی کارساز نہیں اور اسی بات کو آپ تک پہنچاتا ہوں۔

اما بعد فاعظم اللہ لک الاجر۔ بعد حمد کے کہتا ہوں میں کہ خدا تعالیٰ آپ کو بزرگ تر فرمائیں۔ اور اس مصیبت پر ثواب مرتب فرمائیں۔ یعنی اس مصیبت پر صبر دیں۔ اس لئے کہ اجر و ثواب مصیبت پر صبر کرنے سے ملتا ہے۔ اور اگر صبر نہ کرے تو وہ آدمی مستحق عذاب و عتاب ہوتا ہے۔ والھمک الصبر آپ کو اللہ تعالیٰ صبر دیں۔ ورزقنا وایاک الشکر۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو اور آپ کو اپنی نعمتوں پر شکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ فان انفسنا واموالنا واھلینا من مواھب اللہ عزوجل ھینۃ۔ تحقیق ہماری جانیں اور ہمارے مال اور اولاد یہ تمام اللہ عزوجل کی بخشش ہیں۔ وعواریتہ المستودعۃ یعنی یہ جتنی نعمتیں اس نے ہم کو عنایت فرمائی ہیں وہ ہماری ملک نہیں بلکہ وہ ہمارے پاس اس کی عاریت اور امانت ہیں۔ اور حقیقت میں وہ سب چیزیں اللہ کی مملوکہ ہیں۔ جب وہ چاہے اپنی مملوکہ چیز کو واپس لے سکتے ہیں ؎

وما الاھل والمال الا ودیعۃ ولابدّ یوماً ان ترد الودائع

(یعنی ہمارے اہل ومال صرف ودیعت ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ودیعت کو ایک دن واپس کیا جائے) ونمتع بھا الی اجل معدود۔ اور ہم فائدہ اٹھاتے ہیں ان چیزوں سے ایک مدت معدود تک یقضیھا لوقت معلوم اور پورا کرلیں گے ایک معلوم وقت میں ثم افرض علینا الشکر اذا اعطی پھر فرض کر دیا ہم پر ان نعمتوں پر شکر کرنا جب عنایت فرماتے ہیں والصبر اذا ابتلی اور جب مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں تو اس پر صبر کرنا بھی ہم پر فرض کر دیا۔ فکان ابنک من مواھب اللہ الھنیۃ وعواریہ المستودعۃ۔ پس تھے آپ کے صاحبزادے اللہ کی بخششوں میں سے ایک بخشش اور اللہ کی امانتوں میں سے ایک امانت۔ یقبضہٗ منک باجر کثیر۔ اور لے لیا تجھ سے تیرے بیٹے کو اجر عظیم دے کر۔ الصلوٰۃ والرحمۃ والھدی ان صبرت۔ اور صلوٰۃ ورحمت ہوگی آپ پر اگر آپ صبر کریں۔ اور اس کے اندر اشارہ ہے اس آیت کریمہ کی طرف۔ وَبَشِّرِ الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولئک علیھم صلواتٌ من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون ٥

فاصبر ولا یحبط جزعک اجرک۔ پس صبر کرتا کہ تیرا رونا اور جزع وفزع کرنا تیرے صبر کو ضائع نہ کر دے۔ واعلم ان الجزع لا یرد شیئا۔ اور جزع کرنے سے فائدہ ہی کیا اس لئے کہ جزع کسی مصیبت کو دور نہیں کرسکتی۔ ولا یدفع حزنا اور بے صبری غم کو دور نہیں کرسکتی وماھو نازل فکان اور جو مصیبت نازل ہونے والی ہے وہ ہو کے رہے گی۔ واصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین اور صبر کیجئے اللہ تعالیٰ محسنین کے عمل کو ضائع نہیں کرتے واللہ اعلم ÷

مکتوب نمبر ۶۰

بنام شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

انطلاق اللسان بشکایۃ حال الهجران

اللہ و رسولہٗ۔ اپنے اعمال و احوال پر نظر کرتا ہوں تو سوائے نا امیدی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اگر اس کریم کے کرم پر نظر کرتا ہوں تو بخششوں اور رحمتوں سے اپنے دل کو پر از امید پاتا ہوں۔ یا اس کی تعبیر یوں کی جائے کہ اگر اس کے قہر و غضب کو دیکھتا ہوں تو اپنے اعمال و احوال پَرِ کاہ کی مانند نظر آتے ہیں جس سے یہ غم و اندوہ دامنگیر ہوتا ہے کہ سوائے عذاب و عتاب کے اور کچھ نصیب نہ ہوگا اور سب شادمانی و فرحت اندوہ اور غم سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کے لطف و کرم پر نظر کرتا ہوں تو سب اندوہ اور غم فرحت اور سرور سے بدل جاتے ہیں مگر اس کا قہر یا اس کی رحمت پردۂ ابہام میں ہے۔ یہ کیا خبر کہ وہ غضبناک ہوں گے یا کرم و فضل فرمائیں گے حقیقۃً اس چیز کو پردۂ ابہام میں رکھنے میں بھی راز اور حکمت ہے تاکہ خداوند کریم کی سطوت اور رعب بندوں پر قائم رہے۔ اور وہ عبادت و ریاضت میں لیل و نہار مصروف و مشغول رہیں۔ اور وہ لطف و قہر کے مابین رہیں جس کو امید و بیم کہتے ہیں۔ کہ وہ ذات زندہ کرنے والی اور مارنے والی، عطاء کرنے والی اور منع کرنے والی ہے۔ اگرچہ یہ احوال بنی آدم کے لئے لازم اور ضروری ہیں اور عدم و وجود مشہور و معلوم ہے۔ لیکن ان معلومات پر کبھی کبھی غرور اور جہالت کا عارضی پردہ آجاتا ہے وہ بوجہ آرام کے ہو یا عیش و عشرت اور کثرت اموال سے۔ اس لئے ایک گروہ مال کے جمع کرنے میں مصروف ہے اور اس نے اسی کو اپنی ابدی زندگی تصور کر رکھا ہے۔ جو حقیقت میں ہلاکت و بربادی ہے۔ یہ لوگ اسی فکر میں ہیں اس کے علاوہ ان کے اذہان میں اور کوئی فکر نہیں اے خداوند کریم یہ قوم عاد و نمود نہیں کہ آپ ان کا استیصال کریں یا ہلاک کر ڈالیں بلکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ ان سے آپ کا

وعدہ مہربانی اور لطف کرنے کا ہے۔ آپ ان کی تمام حقیقتوں کو جانتے ہیں۔ اور آپ بڑے رحیم و کریم ہیں۔ ان پر کرم فرما اور انہیں گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے نور میں داخل فرما۔ بات لمبی ہوگئی اور میں اپنے مقصود سے بہت دور نکل گیا۔ مقصود تو اپنی ناتوانی اور ضعف وحیرانی کو بیان کرنا تھا۔ کہ ضعفِ پیری اور مرض لاعلاج میں مبتلا ہونے کے میری حال شکستہ ہے۔ دل کے سب سکون اور راحتیں مفقود ہیں۔ اصل میں میرے ضعف اور کمزور ہونے کی وجہ یہ ہے۔ میں نے اپنی تمام عمر ریاضت اور مشقت میں صرف کی ہے۔ اس لئے اب اکثر مرضوں اور بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ لیکن پھر بھی ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ سوائے صبر کے چارہ نہیں اور تسلیم و رضا سے گریز نہیں۔ خلاصۂ احوال یہ ہے کہ اس فقیر کے احوال تین قسموں میں منقسم ہیں۔ یا تو اللہ تعالے میرے ضعف کو ختم کر کے طاقت وقوت عطاء فرمائیں۔ یا چند روز تک اسی ناتوانی اور کمزوری ہی میں رکھ کر کچھ بقاء عنایت فرمائیں۔ اور یا اس دنیا سے اپنی طرف بلالیں۔ ان میں سے جو اللہ کو پسند ہو بندہ اس پر راضی ہے۔

رَضِیْتُ بِمَا قَسَمَ اللّٰہُ لِی
وَفَوَّضْتُ اَمْرِی اِلیٰ خَالِقِی

(یعنی میرے حصہ اور قسمت میں جو کچھ آیا میں اس پر راضی ہوں۔ اور میں نے اپنے معاملات اپنے خالق کے سپرد کر رکھے ہیں وہ جو چاہیں کریں)

ما بدست دوست دادیم اختیار خویش را
صلاح ما ہمہ آنست کان تراست صلاح

(یعنی میں نے اپنے اختیارات اپنے دوست کے قبضے میں دیدئے ہیں۔ میرے ارادے وہی ہونگے جو (اے دوست) تیرے ارادے ہیں) اب تو صرف ایک ہی تمنا ہے کہ سیروا فی الارض پر عمل کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پہنچا جائے اور زندگی کے باقی ایام وہیں بسر کئے جائیں۔ لیکن اب تو اس کی بھی ہمت نہیں۔ اس لئے سوائے صبر کے چارہ کار نہیں لیکن اللہ جو کہ ہر چیز پر قادر ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے اسباب کردے جس سے میرا ارادہ پورا ہوجائے۔ ہماری عمر تو غفلت اور ہوشیاری دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے ہماری مثال ایک ایسے لشکر کی ہے۔ جس نے جنگل میں اپنا قیام کیا ہو اسی دوران ان کو اپنے افسر بلا

کا حکم ملتا ہے۔ کہ فوراً کوچ کرو وہ اس کی بڑی مستعدی سے تیاری کرتے ہیں۔ پھر اچانک حکم ملا کہ ابھی نہیں ذرا دیر ٹھہر جاؤ لشکری لوگ پہلے ہوشیار تھے اب غفلت اور کاہلی سے سو رہیں گے یہی حال ہماری زندگی کا ہے کہ جب خیال آیا کہ اس جہاں سے کوچ کرنا ہے تو اس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے پھر دنیا کی آلائشوں میں مبتلا ہو کر اس فکر سے غافل ہو گئے۔ لیکن ہمیں تو اس طرح تیار رہنا چاہیئے کہ جیسے کسی کوچ کا حکم ملا اور وہ آخری فیصلہ ہو ہر وقت اور ہر آن تیاری کی جائے اور اس دار فانی سے گلو خلاصی کرائی جائے اس لئے جہاں جاتا ہے وہاں تو بقا ہی بقا ہے عیش ہی عیش سرور ہی سرور۔ تو اس ابدی عیش و سرور راحت و آرام کو اس فانی عیش و سرور پر کیوں قربان کیا جائے۔

مکتوب نمبر ۶۱

بنام شاہ ابوالمعالی قدس سرہٗ

اظہار القلق والاضطراب فی حصول المطلوب بلا ارتیاب

اللہ ورسولہٗ۔ اے اللہ میں کمزور ہوں مجھے طاقتور بنا دیجئے۔ میرا ضعف کئی قسم پر ہے ضعفِ بدن۔ ضعفِ دل۔ ضعفِ ایمان۔ ضعفِ یقین۔ ضعفِ عقل۔ یہ تمام ضعف مل کر ظلمات بعضہا فوق بعضٍ کے حکم میں ہیں۔ انہوں نے انوار توفیق اور ہمت و استقلال کے پاؤں کو متزلزل کر رکھا ہے۔ ان سب قسم کے ضعفوں سے بڑے بڑے خدا رسیدہ لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جب اُن لوگوں کا یہ حال ہے تو جو محض مومنین کے زمرہ میں داخل ہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ ان کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے ان سب وعدوں کو فراموش کر کے بیٹھ جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے روز اول میں کر چکے ہیں یا باعتبار مسلم ہونے کے جو ان سب پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سب سے غافل ہو کر اپنی موجودہ حالت پر فرحاں و شاداں ہیں۔ اور یقین کے درجہ سے ہٹ کر محض ظن کے درجہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کا علم و اعتقاد باقی رہتا ہے مگر یقینیات کا ظنیات سے تبدیل ہونا یہ خود ایک بہت بڑا نقص و عیب ہے۔ اور اس کا علاج سوائے ان دعاؤں کے کچھ نہیں جو مناسب اوقات میں بزرگوں سے منقول ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اس کا علاج نصرت خداوندی ہے کہ اگر اس کا تعاون شریک حال ہو جائے تو یہ سب ضعف اور ان کے اثرات ایک ہی منٹ میں ہباءً منثوراً ہو جائیں اور قلب انسانی پاک و طاہر ہو کر ہمہ تن خدا کی ذات اور اس کے احکام کے امتثال میں متوجہ ہو جائے اور گمراہ ہونے کا سب سے بڑا سبب تو بے صبری اور عدم استقلال اور حکومت وقت جو اسلامی اصولوں کے خلاف ہو ان کے شر و فساد میں مبتلا ہو جانا ہے۔ مگر جب انسان خداوند کریم پر کامل یقین و بھروسہ کر لیتا ہے تو یہ لوگ بھی کوئی ضرور نقصان نہیں پہنچا سکتے میری کیفیت یہ ہے کہ میں

حجاز کے سفر سے واپس آکر تقریباً پچیس ۲۵ برس سے اس شہر میں موجود ہوں بحمداللہ ان لوگوں کے شر و فساد سے محض خداوند کریم کے فضل و کرم سے محفوظ و مامون ہوں۔

محال است چوں دوست دارد ترا — کہ در دست دشمن گذارد ترا

(یعنی جب اللہ تعالیٰ تجھ کو دوست رکھتے ہوں تو یہ بات محالات میں سے ہے کہ تجھے غیروں کے سپرد کردیں) میرے دل میں جب اس جگہ پر رہنے سے وحشت و بے حوصلگی حد درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو دل مجبور کرتا ہے کہ اب تو دیار حبیب میں بقیہ زندگی کے ایام بسر کئے جائیں اس لئے کہ وہ خطۂ زمین ایسا ہے کہ جو اس میں داخل ہوگا وہ بنص قرآن مامون و محفوظ رہے گا۔ جیسے ارشاد ہے حرماً امناً ویتخطف الناس من حولهم. والذين تبوؤا الدار والايمان۔ یہ حکم ان لوگوں کے حق میں ہے جو ان اماکن کے رہنے والے ہیں۔ ان اماکن کی طرف کوچ و رحلت کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ غیروں کی صحبت سے جان بچاکر اپنوں کے اندر زندگی بسر کی جائے ؎

سوئے صحرا نہ از پئے سیر و تماشا میروم — شہر بر من بے تو تنگ آمد بصحرا میروم

(یعنی صحرا کی جانب سیر و سیاحت کی خاطر نہیں نکلا۔ بلکہ بغیر آپ کے یہ شہر باوجود وسیع ہونے کے، مجھ پر تنگ ہوچکا ہے اس لئے اپنا رخ صحرا اور جنگل کی طرف کرلیا ہے)

اگر میرے رہنے پر وہ (نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم) رضامند ہوگئے تو فهو المرام۔ اور اگر آپ نے واپس ہونے کو فرما دیا تب بھی میرا مقصد حاصل ہے۔ اصل تو ان کی رضا مطلوب و مقصود ہے۔ وہ آپ کے قریب رہتے ہوئے ہو یا دور۔ اور تمام پریشانیوں و قلق و اضطراب کے دو سبب ہیں۔ انسان کا دل جوہر استعداد اور مرکز محبت و الفت ہے۔ وہ اللہ کی محبت کے بغیر خالی ہے۔ اور کمال کا طالب اور کمال کا متمنی نفس ہے جو کمالات کو اپنے لئے حاصل کرتا ہے۔ اس بات کو کاملین کے حق میں کہا گیا ہے۔ کہ جناب عزت حق جو مطلوب بالذات اور مطلق محبوب ہے لائق تر انہیں کو ہے۔ اور خاصیت نفس کی اس طرح ہے کہ وہ ہر عمل پر جزا کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور ہر کام کی غرض و غایت کو تلاش کرتا ہے۔ اور اپنے ہر کام پر جلدی نتیجہ اور ثمرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس کو ثمرہ و نتیجہ ملنے میں قدرے تاخیر ہوجائے تو بڑا بے صبر اور بے استقلال سا نظر آتا ہے۔ اس جگہ پر ایک نکتہ یاد آگیا ہے جو مقام کے اعتبار سے مناسب ہے وہ یہ ہے۔ کہ نفس کو اپنا مقصود حاصل نہ ہونے میں شاید اللہ تعالیٰ کی غرض یہ

ہو کہ اگر اس کو اس کے عمل کا نتیجہ نہ دیا جائے اور یہ اپنے افعال و اعمال کے ثمرات کو اپنی ظاہری نظروں سے نہ دیکھ سکے۔ اور اس کی تمام توجہات خداوند کریم کی ذات کی طرف مبذول ہو جائیں اور ثمرات اس کی نظروں میں گر جائیں اور ایک ہی مقصد اس کے پیشِ نظر رہے وہ ہے خداوند کریم کی رضامندی اور محبت۔ اور جزائے عمل نظروں سے مطلقاً ساقط ہو جائے اور اپنے دل کو اس سے تسلی دے لیا کرے کہ میرا مقصد تو محض رضائے الٰہی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اعمال پر انوار و اسرار اور ثمرات کا عدم ترتب اخلاص کے فقدان کی صورت میں ہوتا ہے۔ ورنہ عبادات اور اعمال پر لامحالہ اور ضروری طور پر ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔

اور یہ عامل کی عدم استعداد و عدم قابلیت سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قربت الٰہی کے حصول اور اللہ کی درگاہ میں مختص ہو جانے کے اعمال اور کام دوسرے ہیں۔ اور اس کے اہل کیلئے قابلیت اور قربت دوسری قسم کی ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا مقولہ ہے۔ ومن لم یکن للوصال اھلا فکل احسانہ ذنوبا۔ (کہ جو وصال کا اہل نہیں ہوتا اسکی تمام نیکیاں بھی گناہ شمار ہوتے ہیں)۔ اسی مقام پر کہا گیا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے انسان مردود قرار دیا جاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسکے حالات ظاہرہ و باطنہ کو درست نہیں کر سکتی اور اگر اللہ کی درگاہ میں قبول ہو جائے تو پھر اسے کسی گناہ کا اندیشہ نہیں رہتا (یعنی اسوقت اسکی خداوند تعالیٰ امداد فرماتے ہیں اور اس سے کسی گناہ کا صدور نہیں ہوتا) اسلئے یہ دعا پڑھی جائے اللھم اعوذ بک من الرد بعد القبول ومن القطع بعد الوصول ومن الخیبۃ بعد الرجاء ومن المنع بعد العطاء واعوذ بک من الحور بعد الکور۔ اور اسباب وحشت و تنگ دلی کا دوسرا سبب رفیق طریق کا مفقود ہونا ہے۔ راستے کی شدتوں اور مشکلات سے اتنا خطرہ و ڈر نہیں جتنا رفیق کے فقدان اور نہ ہونے میں ہے۔ میں کسی کو نہیں دیکھتا اور نہیں پاتا جو میرا رفیق ہو سکے ہر ایک سالک و طالب صوفی و عالم ایک دوسرے کے ساتھ مخالط اور مصاحب ہو کر اپنے اپنے مقاصد میں رواں دواں ہیں لیکن ایک میں ہی ایسا نااہل ہوں جو گمنامی کے زاویہ اور کنارہ میں پڑا ہوا ہوں۔ اس وقت دو چیزیں دل میں ہیں ایک تو اس بات کی حسرت و ناامیدی کہ سب لوگ اتفاقِ عمل سے ایک جانب جا رہے ہیں اور جمع ہو رہے ہیں۔ لامحالہ وہ ایک خاص فضیلت اور برکت کو پالیں گے لیکن یہ اکیلا اس سے محروم و مہجور ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میں تمام سے جدا اور علٰحدہ پڑا ہوا ہوں انشاء اللہ اللہ تعالیٰ اپنی مخصوص رحمت اور نعمت سے نوازینگے دوسرے شاید اس سے محروم رہیں۔ ان اللہ علی کل شیء قدیر (اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہیں) وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین +

مکتوب نمبر ۶۲

بنام شاہ ابو المعالی قدس سرہٗ

توصیۃ الاخوان بالصبر علیٰ جفاءِ اھل الزمان

اللہ ورسولہٗ۔ الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ واتباعہٖ ھداۃ طریق الحق ومحی علوم دین اللہ **اما بعد**۔ آپ کا مکتوب گرامی مل کر باعث سرور وانبساط ہوا۔ جس سے محبت کاتب للمکتوب معلوم ہوئی اور وحشت وبیگانگی دور ہوئی۔ وہ مکتوب جو بدست شیخ مصطفیٰ روانہ کیا گیا تھا جس میں میرے لئے بہت سی نصائح کو جمع کیا گیا ہے وہ واقعی موافق حال ہیں اگرچہ یہ برادر آداب واحوال کا ہمیشہ خود ہی خیال رکھتا ہے اور اس معاملہ میں بیدار ہے۔ اور طریق وصیت ونصیحت اور تنبیہ واخلاص دوستی اور مودت کے لوازمات میں سے ہے۔ اور اس فقیر اور اس محب کی کیفیت ایسی نہیں کہ اس کے دل میں کدورت ونفرت جگہ پکڑے گی۔ اور آپ پر تو یہ بات روشن وواضح ہے۔ کہ یہ فقیر تو آپ کی خدمت میں صرف اصلاح احوال کی غرض سے حاضر ہوا کرتا ہے اس کے علاوہ میرا کوئی دیگر مقصد ہی نہیں ہوتا۔ اور غرض آپ سے محبت کرنے کی رضائے مولیٰ ہے۔ اور صرف اللہ کے لئے ہے۔ اور یہ فقیر تو اس شہر میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اولاً تو لوگ مجھے جانتے ہی نہیں اور جو جانتے ہیں وہ اچھا نہیں سمجھتے اس لئے میں بتصریح قرآن کہ واصبر علیٰ مایقولون واھجرھم ھجراً جمیلا۔ خاموش ہوں لوگوں کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر میں حقیقۃً بُرا اور گمراہ نہیں ہوں تو ان کا میری طرف ایسی چیزوں کو منسوب کرنا میرے لئے ذرہ برابر بھی ضرر رساں نہیں ہوسکتا۔ اور اگر حقیقۃً بُرا اور گمراہ ہوں اور لوگ مجھے نیک اور اچھا سمجھتے ہیں تو اس کا اللہ کے ہاں کوئی نفع اور فائدہ نہیں ہوسکتا۔ درویش کا اصل کام تو لوگوں کے جور وستم، ظلم

اور استبداد کو برداشت کرنا ہے۔ اور جو شخص اس راستہ میں قدم رکھے گا وہ لوگوں کے ایذاء اور آزار سے ہرگز نہ بچ سکے گا اسے ضرور بالضرور مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس لئے اس راستہ پر چلنے والے کے لئے اولین امر صبر کرنا اور اللہ کی قضاء و تقدیر پر راضی رہنا ہے۔ اور اس بات کو لازم پکڑا جائے کہ بے صبری اور بے تاملی سے گریز کیا جائے۔ اور دل و زبان کو بدگوئی اور بدخواہی سے محفوظ رکھا جائے۔ اور کسی کے لئے بددعا نہ کرے تاکہ خود ظلم کا مرتکب نہ ہو جائے۔ بہترین راستہ اور طریقہ یہ ہے کہ اللہ جبار و کریم کے دربار میں اپنے حالات و احوال پیش کئے جائیں اور جن لوگوں کے ظلم سے تکلیف ہو ان کی دربار ایزدی میں شکایت پیش کی جائے۔ اور اپنے گناہوں اور تقصیروں کی معافی طلب کیجائے لیکن کسی کے لئے بددعا کرنا یا کسی کو تکلیف و آزار پہنچانا سالکین کے مسلک سے بہت دور ہے۔ میں نے جب حضرت قطب الوقت جناب شیخ عبدالوہاب متقی سے اذکار وغیرہ کی اجازت چاہی تو آپ سے دریافت کیا کہ لوگوں کو وعظ و پند کرنا بھی قرب الٰہی کا وسیلہ و ذریعہ ہے یا نہیں تو آپ نے فرمایا کہ کیوں نہیں؟۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے سے تمسک کیا جائے اور لوگوں کی تلخ اور سخت باتوں کو برداشت کیا جائے۔ اس لئے کہ درویشی تو خاکساری عاجزی۔ تواضع۔ انکساری۔ اور اپنے کو برباد کر دینے کا نام ہے نہ جنگ و جدل کا نام درویشی ہے (جیسے کہ موجودہ زمانہ میں لوگوں نے زیادہ لڑنے والوں کو بڑے ولی و درویش ہونے کی علامت قرار دے رکھا ہے)۔ الغرض درویش کو جو جفاء و جفا پہنچے اس پر علاوہ صبر و شکر کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اور اگر درویش اللہ تعالیٰ کے خفیہ الطاف پر نظر کرے تو اس کا شکر بجالائے محققین کا ارشاد ہے کہ ہر بلاء و مصیبت پر اگر شکر کو وظیفہ بنایا جائے۔ تو بہت مفید و موثر ہے لیکن حوصلہ بشری ضعیف و کمزور ہے۔ کہ وہ اپنے اوپر مصائب کو منڈلاتا ہوئے دیکھ کر بھی شکر بجالائے اس لئے اس کو صبر ہی کرنا چاہئے ورنہ اصل تو شکر ہی ہے۔ اگر ان مصیبتوں پر شکر نہ کر سکے تو پھر صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اسی لئے جب کہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ غنی شکر گذار بہتر ہے یا فقیر صبر کرنے والا۔ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ان دونوں سے وہ فقیر افضل ہے جو مصائب کے اندر بھی خداوند کریم کا شکر گذار رہے۔ اس جگہ دو طریق ہیں۔ لوگوں سے آزار کو برداشت کر کے اس پر صبر کرنا اور وطن کو ترک نہ کرنا۔ اور اگر کسی صورت میں جان کا خطرہ

لاحق ہو تو وطن کو بھی ترک کر دیا جائے اس لئے کہ وطن کو ترک کرنا انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔ اگر انسان کی توجہ کسی صحیح جانب ہو تو اس کو کوئی خطرہ نہیں وہ ہر جگہ پر کامیاب رہے گا۔ اور اسے کوئی غم لاحق نہ ہوگا۔ جیسے ارشاد ہے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین وان جندنا لھم الغالبون۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہٗ الایۃ۔ بہرکیف دل مضبوط ہونا چاہیئے۔ پھر کوئی اندیشہ نہیں۔ اس فقیر کو آپ اپنی دعاؤں میں فراموش نہ فرمائیں۔ اور سب فقیروں کے مرجع و ماوٰی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس جگہ مقصود یہ تھا کہ فقیر کو کسی سے جنگ و جدل نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ ہمہ وقت اپنے احوال کو خداوند کریم سے متعلق رکھے اور ہمیشہ عاجز بن کر رہے۔ میں بھی ایک ایسا فقیر ہوں کہ جس کے اندر تعلی اور برتری کا کبھی شبہ تک پیدا نہیں ہوا میں تو ایک دردمند انسان ہوں اور یہی میری مرغوب چیز ہے اس مضمون کو میں نے نظم بھی کیا ہے۔ والسلام علیکم۔

مکتوب نمبر ۶۳

بنام شیخ نورالحق دہلویؒ

سلوك الطريقة على نهج المجاز قنطرة الحقيقة

اللہ ورسولہٗ۔ بعض علمائے وقت نے اس رباعی کو مجاز پر محمول کیا ہے۔ اور ہر ایک نے اس کے بارے میں اپنی اپنی مرضی کے موافق اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس فقیر کا بھی اس رباعی کے بارے ایک خیال ونظریہ ہے۔ پہلے رباعی ملاحظہ ہو۔ رباعی

گفتم کہ دو بوسہ دہ زلب گفتانی گفتم کہ بروز نے بشب گفتانی

گفتم کہ بجز نے تو نمیدانی ہیچ رد کرد بسویم زطرب گفتانی

گفتم کہ دو بوسہ دہ زلب گفتانی۔ یہ سالک کا سوال ہے طریق محبت سے جو طالب مقام قرب ووصل ہے۔ جو چاہتا ہے شفاہاً اور عیاناً ذات باری کا مشاہدہ ودیدار کرے۔ اور اس مشاہدہ کو مکالمہ کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ کہ بوجو لب پر ہوتی ہے لب اس بو کی مصدر اور مشعر ہے کہ خوشبو اس جگہ پر موجود ہے۔ بعض بزرگوں کو اس میں اختلاف ہے کہ مشاہدہ کو مکالمہ کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے یا نہیں۔

اور عوارف کے اندر کہا گیا ہے۔ کہ دل کی آنکھیں ہیں۔ اور کانوں کی آنکھیں نہیں اور نہ ہی کانوں سے دیکھا جاتا ہے بلکہ کانوں سے بات سنی جاتی ہے۔ اسی طرح نہ دیکھنا سننے کو مانع ہے اور نہ سننا دیکھنے کے لئے مانع ہے۔ قطب الوقت شیخ ابوالحسن شاذلی قدس سرہٗ حزب کبیر کے اندر فرماتے ہیں۔ کہ اے اللہ میں آپ سے مشاہدہ کا سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ مکالمہ بھی ہو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج بھی اسی بات کے لئے مثبت ہے کہ مشاہدہ اور مکالمہ باہم دیگر متضاد چیزیں نہیں بلکہ دونوں بیک وقت جمع ہوا کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرا گروہ ہے جو مشاہدہ

کے عدم جواز کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ مشاہدہ اپنے کو ہلاک کرنے اور پریشانیوں میں ڈالنے کا نام ہے۔ اور خود بخود پریشانیوں میں پڑنے اور ہلاک کرنے کی شریعت میں ممانعت موجود ہے لہٰذا مشاہدہ ممنوع ہوا مگر یہ ایک ایسا قول ہے جو ظاہر البطلان ہے اور ہر ذی شعور اس کو باطل سمجھتا ہے اس لئے ہم اس کے سننے کے لئے تیار نہیں۔ جب اس کو سننا پسند نہیں کرتے تو پھر اس کا جواب کیسے عرض کریں۔ اور دو بوسہ اشارہ ہے شوق کے بعد ذوق۔ وصل کے بعد وصل اور فنار کے بعد بقاء کے حاصل کرنے کی طرف۔ اور اشارہ ہے مشاہدہ کی طرف اس لئے کہ دوسرا بوسہ بغیر رات گذارنے کے حاصل و میسر نہیں ہوتا۔ گفتم دو بوسہ دہ زلب۔ کی شرح یہ ہے۔ گفتانی محبوب کے ناز و استغناء اور غرور و خوبیٔ حسن کو کہتے ہیں حقیقت میں جو اپنے نفس کے اندر طلب کی آتش شعلہ زن ہے اس کو تیز کرنا اور محبوب کے وصال کے لئے جدوجہد کرنا ہے۔ بلکہ حصول مطلوب کے لئے اپنی ذات کو امیدوار بنانا ہے۔ اور اپنے مطلب کو وہی پاسکتا ہے جو کوشش کرے اس لئے کہ عربی کا محاورہ مشہور ہے من جَدَّ وَجَدَ۔ جو کوشش کرتا ہے وہ اپنے مطلوب کو پالیتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کریم کی طرف سے اگر رد و منع ہو تو وہ عین اجابت و عطاء ہے۔ شیخ ابوالعباس المرسی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے۔ کہ عام لوگ جب ڈرائے جاتے ہیں تو خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب انہیں امید دلائی جاتی ہے تو امیدوار ہو جاتے ہیں۔ اور عارف لوگ جب ڈرا دئے جاتے ہیں تو امیدوار ہوتے ہیں۔ اور جب امید دلا دئے جاتے ہیں تو خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔

گفتم کہ بروز تے بشب گفتانی۔ کہ تجھ کو کمال کے مراتب کی طلب اور قرب و وصول کے درجات کی خواہش ہونی چاہیئے اور نفس سے متعلق جتنی خواہشات ہوں ان سب کو عموماً اور حب جاہ کو خصوصاً ترک کر دیا جائے۔ اس لئے کہ حبّ جاہ ایک ایسی بیماری اور بلاء ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے سالک کوئی راستہ عبور نہیں کر سکتا۔ اسی لئے عارفین کا مشہور مقولہ ہے آخر ما یخرج من راس الصد یقین حبُّ الجاہ (یعنی سلوک و صدق کے تمام راستوں کو طے کرتے ہوئے مشکل ترین حب جاہ کا ترک کرنا ہو. بظاہر مشکل ترین ہو لیکن اس کا نتیجہ بڑا شیریں ہے) اور اللہ کے نزدیک جاہ و عزت معذرت پیش کرتے رہنے اور بخشش مانگتے رہنے کا نام ہے۔ استغفار اور

اعتذار وہی کرتا ہے جو اس دولت اور کمال کا طالب وخواہشمند ہوتا ہے۔ اور پھر اس کمال کے انوار جو کرامات وخوارق عادات ہیں پوشیدہ رکھے جائیں انہیں ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ اور اللہ کی ذات کے علاوہ اور کسی پر نظر نہ رہے۔ اور پھر وہ مقام اولیائی تحت قبائی لا یعرفہم غیری (کہ میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں ان کو میرے بغیر اور کوئی نہیں پہچان سکتا) کے مصداق ہوں۔ یا الولی یعرف الولی کے اعتبار سے انہیں وہی لوگ پہچان سکیں جو ان کے ہم پلہ اور ہم مرتبہ ہوں۔ بعضے کہتے ہیں کہ وَلِیُّ اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام ہے۔ فافہم (اس جگہ مولانا رح نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر معلوم یوں ہوتا ہے اس نکتہ کے کہنے سے آپ کو عوام کے اعتقاد کے فاسد ہو جانے کا خطرہ تھا اس لئے فافہم فرما کر خاموش ہو گئے۔ از مترجم ۱۲) اس جگہ پکارنے یا اس وجہ سے کہ محب اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے محبوب تک رسائی کرے یا اس اعتبار سے کہ شہود ذات اور محبت ذاتی تحدید زمان اور تعین روز و شب سے بالاتر ہے اس لئے کہ لیس عنداللہ صباح ولا مساء کہ اللہ کے ہاں نہ صبح ہے اور نہ ہی شام۔ اور اللہ کے خاص محب کے نزدیک شہرت و عدم شہرت۔ ظہور و عدم ظہور سب یکساں و برابر ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ نام و نمود کا متمنی نہیں ہوتا ہے اور شہرت کی اس کو ضرورت ہوتی ہے جو اپنا نام و نمود چاہتا ہے۔ اسی لئے عارفین کا مقولہ ہے۔

من اراد الظہور فہو عبد الظہور ومن اراد الخفاء فہو عبد الخفاء وعبداللہ سواء اظہر او اخفیٰ (یعنی جو شہرت کو چاہتا ہے تو وہ حقیقت میں اللہ کا بندہ نہیں بلکہ شہرت کا ہے۔ اور جو خفاء کو چاہے وہ خفاء کا بندہ ہے اور اللہ کا بندہ تو وہ ہے جس کے سامنے شہرت و عدم شہرت دونوں غائب و مفقود ہوتی ہیں بلکہ اس کے سامنے محض رضائے الٰہی ہوتی ہے۔

ع گفتم بجز نے تو نمیدانی ہیچ

یعنی جب طالب و سالک کے چلنے کا راستہ بند اور مسدود ہو گیا۔ اور جس طرف وہ جائے اس کو راستہ نہ ملے اور اس کو بجز نفی و منع اور رد و استبعاد کے کچھ حاصل نہ ہو تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ الہ العالمین میرے تیرے سوا اور کون ہے جو میری شکایتوں کو سنے اور مشکلوں کو حل کرے۔ اور زبان حال سے کہے کہ رب العزت

مجھ پر مہربانی فرما کر میری مشکلات کو حل فرما دیجیے۔ مصرعہ

روکردبسویم ازطرب گفتانی

یعنی میں نے اپنی تمام ضرورتوں کے وقت آپ ہی کی طرف رجوع کیا ہے۔ اور آپ کے علاوہ میں کسی کو اس بات کا لائق ہی تصور نہیں کرتا جس کی طرف بوقت ضرورت رجوع کیا جا سکے۔ اللہ ہماری جانب سے غنی اور صاحب ناز ہیں اور باطن میں بوجہ کرم وجود نیاز مند واللہ یدعوا الی دارالسلام نیاز ہے۔ اور یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ناز ہے۔ یہ چند کلمات بڑی عجلت اور جلدی سے فضل و کمال والے لوگوں کے بارے میں پیش نظر ہیں۔ بات اپنی جگہ سے ہٹ کر کہیں اور چلی گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے ڈر ہے کہ کہیں راز و اسرار کی باتیں ظاہر نہ ہو جائیں اس لئے اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

مکتوب نمبر ۶۴

بنام شیخ نورالحق دہلویؒ

تسلیۃ السائل بین المسائل

اللہ ورسولہ۔ مکتوب گرامی مل کر کاشف احوال ہوا۔ آپ کی سلامتیٔ احوال پر خدا کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔ الحمد للہ علی کل حال۔ دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے طاعون سے بھاگنے کے بارے میں تحریر فرمایا سو اس کے بارے ہیں شرعی مسئلہ یہ ہے۔ کہ جس مقام پر طاعون و وبا وغیرہ ہو اگر آدمی اس مقام میں موجود ہے۔ تو اس کے خوف سے باہر نہ جائے۔ اس لئے کہ موت کا جو وقت متعین ہے وہ آ کے رہے گا۔ اور اگر آدمی اس مقام سے خارج کسی اور جگہ پر رہتا ہے تو وہ طاعون میں مبتلاء مقام میں داخل نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ خدانخواستہ مرض طاعون میں مبتلا ہو گیا تو ہو سکتا ہے کہ اس کے قلب و جگر میں یہ تصور جاگزیں ہو جائے کہ اگر میں اس جگہ نہ آتا تو شاید طاعون مہلک مرض میں مبتلا نہ ہونے پاتا جس سے اس کا عقیدہ خراب ہو گا۔ تو شریعت نے دخول سے ممانعت عقیدہ کے حفظان کی خاطر اور خروج سے ممانعت خدا تعالیٰ سے اعتماد کے اٹھ جانے کی خاطر کی ہے۔ یہ بات تو اس سوال کے جواب سے متعلق تھی۔ اس سے مزید عرض یہ ہے۔ کہ آدمی جہاں بھی ہو اگر اس کی تقدیر میں طاعون وغیرہ میں ابتلاء لکھا ہوا ہے تو وہ ہو کے ہی رہے گا۔ جب ایسے مہلک امراض میں آدمی مبتلاء ہو جائے تو اس میں حقیقتہً ہمارا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے اس لئے صبر و ضبط سے کام لیا جائے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔ خلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا ؕ اور حدیث میں آتا ہے کہ طاعون رجز ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر بھیجی گئی تھی یا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گذر گئے بس جبکہ سنو تم طاعون تو نہ داخل ہو اور جب طاعون واقع ہو جائے اور تم اس جگہ میں ہو تو پھر باہر نہ نکلو۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ طاعون

مسلمان کے لئے شہادت ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس قسم کی متعدد احادیث اس بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ اور جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اگر طاعون واقع ہو تب بھی آدمی اس مقام کو ترک کر سکتا ہے۔ وہ اس آیت سے دلیل پکڑتے ہیں۔ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ کہ تم اپنے ہاتھوں اپنی جانوں کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ اور اس آیت کا مفہوم عام ہے۔ کہ طاعون واقع ہو چکی ہو یا نہ ہو دونوں حالتوں میں اس سے فرار جائز ہے۔ اور جب واقع ہو چکی ہو اس وقت آدمی فرار کو اختیار نہ کرے تو حقیقت میں یہی تو اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جو عین قرآن کی تصریح کے خلاف ہے۔ فہم۔ اس کے علاوہ وہ لوگ اپنی قیاس آرائیوں سے بھی کام لے کر یوں کہتے ہیں۔ اگر ایک جگہ پر آگ لگی ہوئی ہے یا ژالہ باری ہو رہی ہو۔ اگر اس مقام سے آدمی فرار اختیار نہ کرے جب کہ فرار پر قادر بھی ہو اور مر جائے تو وہ حقیقۃً ہلاک ہوا۔ اور حرام موت مرا۔ اسی طرح اگر ایک آدمی طاعون کے مقام کو ترک کرنے پر قادر ہے پھر اس کو ترک نہ کرے اور اس میں مبتلا ہو کر مر جائے تو اس نے اپنی جان کو ہلاک کر دیا۔

مگر یہ قیاسات وہمیہ ہیں۔ اس لئے کہ جب کسی کی تقدیر میں مرنا لکھا ہی جا چکا ہے تو وہ اس مقام میں رہے یا نہ رہے ضرور ہلاک ہوگا۔ اور جن چیزوں پر طاعون کو قیاس کیا گیا ہے وہ حقیقت میں قیاس مع الفارق ہے جو جائز نہیں اس لئے کہ آگ وژالہ وغیرہ موت کے اسباب عادیہ ہیں۔ اور طاعون موت کے اسباب وہمیہ میں سے ہے۔ لہٰذا ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں اور دوسرے یہ قیاس بمقابلہ نص ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں عدم خروج کی صراحۃً ممانعت موجود ہے۔ اور حدیث میں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے اس بات کی شکایت کرنے پر کہ میری زمین جس جگہ پر ہے میں اگر اس کو آباد کر کے اپنے اہل وعیال کا کفیل ہوتا ہوں تو اس جگہ جاتے ہی وبا وامراض میں مبتلاء ہو جاتا ہوں وہ جگہ ترک کرنیکی اجازت دیدی تھی۔ وہ حقیقت میں اس آدمی کے ضعف خیال اور شرک میں مبتلا ہونے پر مبنی ہے۔ اس کو دوسروں پر جاری نہیں کیا جا سکتا۔ اور اصل وہی ہے جسے ہم نے عرض کر دیا۔ دوسری بات جو مکتوب میں لکھی گئی ہے وہ یہ ہے۔ کہ میت کے ساتھ جو عموماً کھانا بھیجا جاتا ہے اس کو کھایا جا سکتا ہے یا نہیں سو اس کے بارے میں قاعدہ شرعیہ کلیہ یہ ہے۔ کہ صدقہ فقیروں کا حق ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے

کہا ہے کہ صدقہ نفلی اغنیاء کے لئے بھی جائز ہے۔ لیکن فتویٰ اغنیاء کے لئے عدم جواز و کراہت کا ہے۔ اور وہ کھانا جس کو لوگ میت کے گھر بھیجتے ہیں وہ میت کے گھر والوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے جو خود مصیبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کھانا نہیں پکا سکتے اگر یہ بطور دعوت وضیافت ہے۔ تو اس کا جواز ظاہر ہے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ یہ کھانا تین دن تک میت کے اہل خانہ کے لئے مخصوص ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ اگر ایک شخص مرتے وقت یہ وصیت کرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد بزرگ کی ارواح کو حلوا پکا کر اس کا ثواب تقسیم کیا جائے سو یہ منجملہ وصیتوں میں سے ایک وصیت ہے اور وصیت علی العموم جائز ہے۔ کتاب "مطالب المومنین" میں اس پر ایک جدا فصل اس عنوان سے قائم کی گئی ہے۔

فصلٌ فی الوصیة بعد الطعام (اس کے ذیل میں یہ واقعہ لائے ہیں) کہ ابوجعفر سے کسی نے سوال کیا کہ اگر کوئی یہ وصیت کرتا ہے۔ کہ میرے مرنے کے بعد کھانا تیار کر کے ان لوگوں کو تقسیم کیا جائے جو میری تعزیت کے لئے آئیں تو اس کا حکم کیا ہے ابوجعفر نے جواب میں فرمایا کہ ہم اس وصیت کو اس کے ثلث مال سے جائز قرار دینگے ان لوگوں کے حق میں جو لمبی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ اس میں فقیر و غنی دونوں برابر ہیں البتہ ان لوگوں کے لئے جائز نہیں جن کی مسافت بہت قلیل ہو اور وہ میت کے قریب ہی کسی گاؤں یا بستی کے رہنے والے ہیں جوامع العلۃ میں اسی طرح ہے۔ اور اسی طرح اگر کوئی شخص یوں وصیت کرے کہ میرے بعد کھانا پکا کر لوگوں کو کھلایا جائے اور اس کا ثواب بزرگوں اور صلحاء کی ارواح کو بخشا جائے تو نفس وصیت کے جواز میں تو کوئی شبہ نہیں۔ البتہ اس کی وصیت میں دو احتمال ہیں۔ اگر کھانا کھلانا بقصد صدقہ تھا تو وہ صرف فقراء کیلئے مخصوص ہے۔ اس سے غنی نہیں کھا سکتے اور اگر ضیافت مقصود تھی تو سب کے لئے جائز ہے۔ اور اگر کوئی آدمی کہے کہ میرے بعد روح کو کھانا کھلایا جائے تو اس طرح سے وصیت کرنا مکروہ ہے اگرچہ اس کے معنیٰ وہی ہونگے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہاں البتہ اگر ان الفاظ کے عدم جواز پر کوئی قطعی دلیل موجود ہو تو پھر اس کا حکم بدل جائے گا۔ دوسرا آپ نے یہ لکھا ہے کہ میت کو عمامہ باندھنا جائز نہیں ہے اور کتب فقہ میں قیل و قال بہت موجود ہے۔ اسکی تحقیق کیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔ بعض متاخرین نے عمامہ کی زیادتی کو مستحسن قرار دیا ہے

اور نبی علیہ السلام کے کفن میں چونکہ عمامہ نہ تھا جیسا کہ ظاہر حدیثوں میں موجود ہے۔ کہ آپ کو تین کپڑوں میں کفنایا گیا جس میں عمامہ کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ اس کے استحسان کے قائل ہیں وہ ان حدیثوں کی تاویل کرتے ہیں۔ نیز آپ نے جو سوال کیا کہ میت کے وجود یا اس کے کفن پر لکھنا کیسا ہے۔ تو اس کے متعلق یہی عرض کر سکتا ہوں کہ میری نظر سے آج تک کوئی روایت و حدیث ایسی نہیں گذری جس سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہو۔ البتہ بعض کتابیں جو صحیح وضعیف۔ رطب و یابس کا مجموعہ ہیں (یعنی جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا) ان میں ایسی روایتیں اور حکایتیں پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کو سودمند سمجھتے ہیں چنانچہ مفتاح الجنان وغیرہ میں یہ حکایت موجود ہے۔ کہ ایک آدمی نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرے سینہ اور پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دینا۔ اس کے مرنے کے بعد بیٹے نے ایسا ہی کیا اور دفن کر دیا چند روز کے بعد باپ کی بیٹے سے خواب میں ملاقات ہوئی تو بیٹے نے باپ سے پوچھا کہ ابا جان قبر میں کیسے گذری۔ باپ نے کہا کہ معاملہ یوں ہوا۔ کہ میرے پاس عذاب کے فرشتے آئے جب انہوں نے میری پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ الخ کو لکھا ہوا دیکھا تو یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ تو نے اپنے کو عذاب سے بچا لیا۔

اور آپ نے جو یہ تحریر فرمایا کہ جو جمعہ یا جمعرات کو مرے اس کے لئے بشارت ہے۔ آیا یہ بشارت صرف مومنین کو شامل ہے یا اس میں اہل کفر بھی شریک ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے۔ کہ ما من مسلم یموت یوم الجمعۃ اولیلۃ الجمعۃ وقاہ اللہ من فتنۃ القبر (یعنی جو مسلم جمعہ کے روز یا جمعہ کی رات کو مرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبر کے فتنوں سے محفوظ رکھتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ یہ بشارت یہ مسلم و مومن کے لئے مخصوص ہے اہل کفر اس میں شریک و شامل نہیں، اور آپ نے جو یہ لکھا کہ ایک شخص یوں کہتا ہے کہ میرا عمل قرآن و سنت پر نہیں بلکہ فقہ پر ہے اس پر کیا لازم ہوگا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً ہم قائل کی نیت دریافت کریں گے اگر وہ قرآن و سنت کی حقیر سمجھ کر یوں کہتا ہے۔ تو بالاجماع کافر ہے اور اس کے کفر میں کسی کو شک و شبہ نہیں۔ اور اگر اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ فقہ خود قرآن و سنت ہے۔ اور مجتہدین نے قرآن و سنت سے مسائل استنباط کئے ہیں اور حدیث کی روایتوں کی جمع کر کے ناسخ و منسوخ کو معلوم

کیا ہے۔ اور جہاں تاویل کی ضرورت تھی وہاں تاویل کی ہے اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان مجتہدین کی تقلید کریں جیسے خود قرآن میں ارشاد ہے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم تعلمون۔ اس اعتبار سے اس کی بات درست ہے لیکن عنوان درست نہیں اس لئے اس طرح کے کلام اور ایسے عنوان سے گریز لازمی امر ہے۔ (بندہ محمد فاضل) یہ جوابات میں نے بوقت کتابت ہی سوچے اور لکھے ہیں اگر ان میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اصلاح فرمادیں۔

واللہ اعلم

مکتوب نمبر ۶۵

بنام شیخ نورالحق دہلویؒ

وجدان البرد باستشمام الورد

اللہ ورسولہٗ ؎ زنسیم جان ندایت دل مردہ زندہ گردد
زکدام باغے ای گل کہ چنیں خوش است بویت

(یعنی اس ہوا سے مرا مردہ قلب زندہ ہوگیا۔ باغ کہاں ہے اے پھول کہ جس سے تیری خوشبو مہک رہی ہے) اللہ تعالیٰ نے دماغ وقت اور شامۂ حال کو اپنی عنایت کی ہواؤں اور کرامت کی خوشبوؤں سے کتاب فتوح الغیب کے مطالعہ سے معطر فرمادیا ہے۔

جو شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانیؒ کی کتاب ہے اور اس فقیر کو اسکی شرح لکھنے کا موقع ملا ہے جس کی مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے اس تقریب پر شعر عرض ہے۔ ؎

عکس روئے تو چو در آئینۂ جام افتاد
از خندۂ مے در طمع خام افتاد

اس بات کا ذوق وشوق تھا کہ اس مضمون میں می اور خندۂ سے کیا مراد ہے۔ اور جام اور افتادن جو محبوب کے چہرے کا عکس ہے۔ کیا ہے۔ اور عارف کا طمع خام میں پڑجانا اس لئے ہوتا ہے۔ کہ وہ گل (پھول) تک پہنچ کر اس کو چن لے۔ اور گل و مل دونوں جمع ہوکر وقت کی بہار دوبالا کردیں۔ اور سودائے جنون وجوش وشورش جو باطن میں موجود ہے جو زاویہ خانہ کا سرور ہے شاید کسی وقت غلبہ پائے اور اندرونی تکلیف رفع ہوجائے جس کا اثر بیرون پر بھی پڑے اور بیرونی تکالیف بھی ختم ہوجائیں۔ اور اب تو وہ خود بھی پردہ میں

ہے۔ادب دامنگیر ہے اس لئے اس شعروبیت کے مطلب کو بیان کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔اور اگر کوئی اس بیت کے معنیٰ دریافت کرنے کا ذوق رکھتا ہو تو فی البدیہ اور بالفعل اس کا مفہوم یہ ہے۔کہ مراد جام سے عاشق کا دل ہے جو مولیٰ کے عشق کی تجلی گاہ اور محل ہے۔اس معنیٰ کے اعتبار سے آئینہ کو اس سے استعارہ کیا گیا ہے۔اور افتادن عکس روئے کنایہ تجلی حق سے ہے۔جب بصورت روح عارف واقع ہوتا ہے تو اس وقت وہ محل اشتباہ ہو جاتا ہے۔اور اس وقت وہ عین حق سے دیکھتا ہے۔اور اتحاد کے توہم میں پڑتا ہے۔اور طمع خام میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔جیسا کہ کہا گیا ہے۔کہ رقت پیالے کی اور شراب کی ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔گویا کہ پیالہ شراب ہی ہے اور پیالہ نہیں گویا کہ شراب پیالہ ہی ہے اور شراب موجود نہیں۔آگے اس پر ایک رباعی پیش کی گئی ہے جس کو قصداً ترک کر دیا گیا ہے کہ وہ عوام کے اذہان سے بالاتر ہے۔ فقط ٭

مکتوب نمبر ۶۶

بنام شیخ نورالحق دہلویؒ

جمع کلمات العارفین من اہل الصدق والیقین

اللہ ورسولہٗ ۔ بعضے کلماتِ مشائخ نظر سے گذرے ان کو سالکین کیلئے مفید سمجھ کر نقل کرتا ہوں اگرچہ اس فقیر کو ان سے کچھ حصہ نصیب نہیں اور میری تمام تصانیف کا یہی حال ہے ۔ یہ محض لوگوں کے فائدہ کے لئے کچھ باتیں عرض کر دیتا ہوں اگرچہ اس پر میرا عمل ہو یا نہ ہو ۔ چوں کہ وہ لوگوں کے لئے مفید تر ہوتی ہیں اس لئے کسی کہ یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس کے کہنے والا کیسا ہے ۔ اس لئے اصل بات دیکھنی چاہیئے کہ وہ کیسی ہے نہ کہ اس کا کہنے والا دیکھا جائے ۔ (۱) اے عزیز اللہ کے بغیر کسی پر اعتماد کر کے پشیمان نہ ہو (۲) اللہ سے غافل نہ ہو تاکہ شیطان تجھ پر مسلط نہ ہو جائے (۳) غرور نہ کرتا کہ ہلاک نہ ہووے (۴) دل کو غیر اللہ کے خیال اور محبت سے خالی کرتا کہ آرام پاوے (۵) اللہ کے کاموں میں لگ جا تاکہ اللہ تیرے کام سنوار دے (۶) دنیا کے کاروبار میں معمولی اہتمام کرتا کہ وہ تیرے لئے کافی ہو (۷) کسی کے عیب نہ دیکھ تاکہ تو اس عیب میں مبتلا نہ ہو (۸) سختیوں میں صبر کرتا کہ فراخی دیکھے (۹) تمام سے ناامید نہ ہو تاکہ تیری امید پوری ہو جائے ۔ (۱۰) ریا نہ کرتا کہ اخلاص پائے (۱۱) ہر کام کو خلوص نیت سے کر تاکہ اس کی فی الفور جزا پائے (۱۲) دنیا کی خواہش نہ کرتا کہ تیری دولت تباہ نہ ہو (۱۳) قناعت کرتا کہ محنت سے چھوٹ جائے (۱۴) کسی کو تکلیف نہ دے تاکہ تجھے کوئی تکلیف نہ دے (۱۵) کسی پر کینہ نہ کرتا کہ تیرے پر لوگ کینہ نہ کریں (۱۶) کسی کو حقارت سے نہ دیکھ تاکہ تجھے لوگ حقارت سے نہ دیکھیں (۱۷) دنیا کی طرف سے غمگین نہ ہو تاکہ غم سے نجات پائے (۱۸) تمام سے جدائی اختیار

کر کے خدا سے محبت کر (۱۹) کل کے کام پر غمگین ہو کر امیدوں کو خراب نہ کر (۲۰) موت کو ہمیشہ یاد رکھ تاکہ تیرا دل دنیا سے بیزار نہ رہے (۲۱) گناہوں کو ترک کر کے حلال کی نعمت کا متمنی بن (۲۲) کسی پر توقع نہ رکھ تاکہ باعزت رہے (۲۳) عاجزی کر کے بزرگی تک رسائی حاصل کر۔ (۲۴) اللہ کا شکر گذار بندہ بن کر دین و دنیا کی نعمتوں سے مالا مال ہو جا (۲۵) بےخوف نہ رہ اگر امان چاہیئے (۲۶) ساتھ حق کے ہمیشہ رہ اگر دولت جاودانی چاہیئے (۲۷) بزرگوں کی خدمت کر کے بزرگی کے مراحل طے کر (۲۸) صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دے اگر عافیت چاہیئے۔ (۲۹) اگر دولت چاہیئے تو دل والوں کا دامن پکڑ (۳۰) اگر منزل تک بغیر تھکاوٹ کے پہنچنا چاہتا ہے تو آہستہ آہستہ چل (۳۱) دنیا والوں سے پرہیز کر تاکہ تیرا دل سیاہ نہ ہو جائے (۳۲) ہمت کر ہمت سے نعمت بڑھتی ہے (۳۳) حرص سے بچ تاکہ ذلیل نہ ہووے۔ (۳۴) اگر قیمتی ہونا چاہتا ہے تو اپنے کردار کو قیمتی نہ سمجھ (۳۵) اگر معرفت رکھتا ہے تو کسی کے عیب مت دیکھ (۳۶) کسی چیز کے فکر میں نہ رہ اگر آزادی چاہیئے (۳۷) مسکین بن تاکہ مقبول ہووے (۳۸) کام کو اخلاص سے کر تاکہ آخر کار پشیمان نہ ہووے (۳۹) جب تو فارغ ہووے تو دوسروں کے کام کر (۴۰) تمام کے ساتھ نرمی کر اگر دشمنوں سے نجات چاہیئے (۴۱) غریبوں پر رحم کر تاکہ کامیاب ہووے (۴۲) کام کو سوچ سمجھ کر کر تاکہ اس میں عجلت کرنے سے شیطان کو راستہ نہ ملے (۴۳) دوسروں کو اپنے سے بہتر جان (۴۴) سختی کو ترک کر دے تاکہ تیرے تمام دشمن نہ ہوں (۴۵) اللہ کو یاد کر تاکہ تیرا دل ویران نہ ہووے (۴۶) دنیا کی طرف مت دیکھ تاکہ اندھا نہ ہووے (۴۷) اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کر کے عاصی نہ ہو (۴۸) ہر ایک کے ساتھ مت بیٹھ تاکہ تباہی سے بچ جاوے (۴۹) اگر لذت کا طالب ہے تو لذت کو ترک کر دے (۵۰) انصاف کر اور ظالم نہ بن (۵۱) اور کام وہ کر جس کو اللہ پسند کرے۔ (۵۲) بیہودہ فکر کو دل سے دور کر تاکہ پریشان نہ ہووے (۵۳) دوستی وہ بہتر ہے جو خدا کے لئے ہووے (۵۴) اپنا کام کسی کو مت کہہ اگر عزیز بننا چاہے (۵۵) طمع کو دل سے نکال دے اگر محتاج نہیں ہونا چاہتا (۵۶) کسی کی بے سوچے سمجھے تعریف نہ کر ہو سکتا ہے۔ کہ وہ تیری تعریف کے خلاف ہو اس لئے کہ تو نے اس کا انجام دیکھے بغیر اس کی تعریف کر دی ہے۔ (۵۷) اپنی حاجتیں اللہ سے مانگ (۵۸) اگر ہدایت پانا چاہتا ہے تو تمام اوقات اللہ کی یاد میں صرف کر دے (۵۹) اگر تو غیرت مند ہے تو بیگانوں کو گھر میں نہ گھسنے دے (۶۰) شب بیدار رہ اگر محبت کی بو چاہیئے (۶۱) نفس کو اپنے کام

میں لگا تاکہ وہ تجھے اپنے کام میں نہ ڈالدے (۶۲) اگر عیبوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کے عیبوں سے چشم پوشی کر (۶۳) خاموش رہ (۶۴) اپنے کام کو پوشیدہ رکھ اگر اس کو قیمتی بنانا ہووے (۶۵) اللہ کے دوستوں سے دوستی کر تاکہ آخرت میں فائدہ اٹھاوے (۶۶) کسی چیز کے ساتھ قرار نہ پکڑ اگر محبت رکھتا ہے (۶۷) اگر تو اپنے نفع ونقصان کو نہیں جانتا تو پریشان ہووے (۶۸) اپنے کو ایک چھوٹا سا قطرہ سمجھ اگرچہ تو دریا کی مانند ہی کیوں نہ ہووے (۶۹) گداگروں کے ساتھ رہ اگرچہ تو بادشاہ ہووے (۷۰) خود پسند نہ ہو اگر پسندیدہ ہونا چاہتا ہے۔

وصلے اللہ علے خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین فقط +

تتمہ

مکتوب نمبر ۶۷

یہ دو مکتوب حضرت شیخ اجل محدث دہلویؒ کے اصل دستخطوں کے ساتھ ملے چونکہ مقصود مکتوبات کو جمع کرنا ہے اس لئے تبرکاً اور تیمناً ان دونوں کو بھی اس رسالہ میں درج کیا جاتا ہے۔

عاقبت بخیر باد :: بہت دفعہ خیال ہوا کہ کوئی چیز اپنے دلبند کو تحریر کروں لیکن پھر حیران ہو کر رہ جاتا تھا کہ سوائے سعادت دارین کے آپ کے لئے کیا دعا کروں۔ اور فقیر کا حال ویسے ہی ہے جیسے اس سے پہلے تھا۔ اور میرے احوال کا اجمال یہ ہے کہ الحمد للہ علیٰ کل حال ونعوذ باللہ من عذاب اہل النار (یعنی اللہ کی ہر حال میں تعریف ہے اور ہم اللہ سے دوزخیوں کے عذاب سے پناہ مانگتے ہیں) تبدل و تغیر احوال تو ہر مخلوق کے لئے لازم ہے جو ہر ایک کو معلوم ہے۔ اگر تھانیسر میں رہتے ہوئے آپ کو دہلی کا خیال آئے تو وہ بے سود ہے اس لئے یہاں ہوتے ہوئے کیا لازم آتا ہے۔ تمہاری خیریت مطلوب ہے جہاں بھی ہو۔ میاں نورالحق کی طرف سے بھی ایک خط آیا ہے جس میں شکر و شکایت دونوں تھیں یعنی شکر تو اللہ تعالیٰ کا اور شکایت اپنے نفس سے۔ آپ سے اسی بات کی توقع ہے کہ آپ ہمارے لئے ایمان اور حسن عاقبت کی دعا فرماتے رہیں گے۔

والعاقبۃ بالخیر

مکتوب نمبر ۶۸

اب میں کیا کہوں اور کیا لکھوں۔ جبکہ بزرگوں نے کوئی چیز نہیں چھوڑی اس لئے میں لکھنے اور کہنے سے عاجز ہوں مگر لوگوں نے اس بارگراں کو فقیر کے سر پر رکھدیا ہے۔ ان شوائق کو سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی آسان نہیں کرسکتا۔ ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہٖ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین۔

(اے رب ہمارے اور مت اٹھوا ہم سے وہ چیز کہ نہیں طاقت واسطے ہمارے ساتھ اس کے اور درگذر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم ہم پر۔ آپ ہمارے کارساز ہیں۔ سو ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے)۔

عاقبت بخیر باد۔ اے میرے بیٹے ؟ یہ بات یقینی ہے کہ میں آپ کو دوست رکھتا ہوں اور آپ کو نیک لوگوں میں سے شمار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام دین و دنیا کی نیکیوں کے حاصل کرنے کی توفیق عنایت فرمائیں، دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھیں، اور تمام کرامات و برکات سے محظوظ فرمائیں، اس سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا آپ کو اور آپ کے تمام کاموں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ والسلام۔ اور فرزند دلبند بجان پیوند محمد عاصم کو بھیج رہا ہوں تاکہ اس کی آنکھیں بھی جمال سے روشن ہو جائیں۔ فقط ✝

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مختصر سوانح حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رح

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ اما بعد۔ سرکار دوعالم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ وابی وامی) کے طفیل اس امت کو جہاں بے شمار خصوصیات سے نواز اگیا وہاں ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ دین سے متعلق ہر شعبہ کی حفاظت اسی امت کے منتخب افراد کے ذریعہ کی گئی جس زمانہ میں دین میں جو فتنہ اٹھا، اہل حق نے اس کو قیامت تک کیلئے سُلادیا۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح کی ذات گرامی کا شمار ایسے ہی مجددین امت میں ہوتا ہے جو زمانہ کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر خالص قرآن وسنت کے علوم اور دین کے صحیح خدوخال کو ظاہر کرتے رہے، علوم اسلامیہ میں کون سا ایسا علم ہے جس میں حضرت شیخ رح کی ٹھوس خدمات تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف اور رسائل ومکتوبات کی صورت میں موجود نہ ہوں۔

نسب و خاندان

شیخ رح کے آباو اجداد بخارا کے رہنے والے تھے، آپکے اجداد میں سب سے پہلے آغا محمد ترک سلطان علاؤالدین خلجی کے دور حکومت یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان تشریف لائے، اور چونکہ یہ اپنے قبیلہ کے سردار اور مرشد بھی تھے اس لئے آپ کے ساتھ آپکے رشتہ دار اور مریدین کی ایک کثیر جماعت بھی ہمراہ آئی، دہلی میں سلطان خلجی رح نے آپکے کمالات کے پیش نظر آپ کو بڑے منصب اور جاگیر سے نوازا۔

سلطان خلجی رح گجرات کی مہم پر دہلی سے روانہ ہوئے تو بہت سے ارکان دولت کے ساتھ آغا محمد کو بھی ہمراہ لیا، راستہ میں سلطان اور ارکان دولت میں رنجش ہوگئی جس کے بعد سلطان آغا محمد کی طرف اور زیادہ متوجہ ہوگئے۔

آغا محمد کے ایک سو ایک لڑکے تھے جو دربار سلطانی میں منصب یافتہ تھے، قضائے الٰہی سے سولڑکے فوت ہوگئے اور صرف ایک صاحبزادہ ملک معزالدین حیات رہے، آغا محمد اس صدمۂ جانکاہ سے تمام مناصب چھوڑ کر شیخ صلاح الدین سہروردی کی خانقاہ میں معتکف ہوگئے۔

ملک معزالدین کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا اور دربار میں صاحب منصب و جاگیر ہوئے، آخر ۷۳۹ھ میں اپنے صاحبزادہ ملک موسیٰ کو اپنا جانشین بنا کر وفات پاگئے۔

ملک موسیٰ بھی دربار کے بڑے عہدیدار تھے بلاد ماوراء النہر گئے اور وہاں سے امیر تیمور کے معزز منصب دار کے طور پر دہلی آئے، پھر دہلی کو ہی وطن بنالیا۔

ملک موسیٰ کے ایک فرزند شیخ فیروز تھے جو حضرت شیخ رح کے پردادا ہیں۔ شیخ فیروز دینی دنیوی، ظاہری باطنی اور وہبی کسبی کمالات وفضائل سے معمور تھے، فنون حرب میں تو اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اسی کے ساتھ شیریں کلامی

ذوق شاعری اور خوش طبعی کے ساتھ بھی متصف تھے ۸۶۰ھ میں اپنی اہلیہ کو حالت حمل میں چھوڑ کر معرکہ بھڑائچ میں گئے اور وہیں شہادت پائی۔

آپکے فرزند شیخ سعد اللہ اپنے والد کی طرح ہمہ صفت موصوف ہوئے، علم سے فراغت کے بعد اپنے زمانہ کے مرشد کامل شیخ محمد منگن کے مرید ہوئے اور ذوق وشوق اور ریاضت ومجاہدہ کے بلند مقام پر فائز ہوکر خلافت سے نوازے گئے اور ۹۲۹ھ میں وفات پائی

آپکے صاحبزادہ شیخ سیف الدین وفات کے وقت صرف آٹھ سال کے تھے، فرماتے ہیں کہ جب میرے والد شیخ سعد اللہ کا وقت قریب آیا تو تہجد کے وقت مجھے ساتھ لیکر چھت پر گئے اور نماز کے بعد مجھے سامنے کھڑا کر کے دعا کی کہ "اے اللہ میں نے اپنی دوسری اولاد کی تربیت وپرورش کر کے ان کے حقوق ادا کر دیئے لیکن اسکے حقوق ابھی ادا نہیں ہوئے لہٰذا تو ہی اس کا مربی ووالی ہے" پھر چھت سے اتر آئے اور ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ کو وفات پائی۔

الطاف ربانی، والد بزرگوار کی دعا اور ذاتی استعداد کے باعث شیخ سیف الدین میں بزرگی وولایت کے آثار جھلکنے لگے، اور رشدہ شدہ عشق وشوق، جذب وارادت، مجاہدہ وریاضت اور استحضار وذکر کے اُس بلند مقام پر پہنچے کہ ہمعصر رشک کرنے لگے۔

ولادت

شیر شاہ سوری کے عہد میں محرم ۹۵۸ھ کو شیخ سیف الدین کے گھر میں علم کا وہ آفتاب طلوع ہوا جسکی ضیا پاشیوں سے تمام ہندوستان منور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شیخ عبد الحق جیسا فرزند عطا فرمایا، جسکی تربیت ونگہداشت میں آپنے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں، اللہ تعالیٰ نے شیخ عبد الحق کو نہایت قوی حافظہ اور بہترین استعداد عطا فرمائی تھی، خود فرماتے ہیں کہ جب میری عمر ڈھائی سال کی تھی اس وقت کی اکثر باتیں مجھے اب تک یاد ہیں۔

تعلیم وتربیت

حروف تہجی پڑھے بغیر آپنے اپنے والد ماجد سے قرآن کریم اس طرح پڑھا کہ وہ سبق لکھ کر دیدیتے شیخ یاد کر کے سنا دیتے، اس طرح تین ماہ میں پورا قرآن کریم پڑھ لیا، اسی دوران والد صاحب سے "ف" تک تختی لکھنا سیکھی اور پھر معمولی توجہ سے ایک ماہ میں نہ صرف لکھنا آگیا بلکہ انشا نویسی پر قدرت حاصل ہوگئی۔ شیخ کو پڑھنے پڑھانے سے بڑا شغف تھا چنانچہ اپنے بچپن کے زمانہ میں کبھی کوئی کھیل نہیں کھیلا، گھر والے کھیلنے کی ترغیب دیتے تو فرما دیتے کہ کھیل کا مقصود دل کا خوش کرنا ہے اور میرا دل پڑھنے سے خوش ہوتا ہے۔ رات کو اکثر چراغ کے سامنے کتابیں لیکر پڑھتے رہتے اور جب والد صاحب آواز دیتے تو فوراً لیٹ جاتے اور کہتے کہ میں تو لیٹا ہوا ہوں پھر اٹھ کر پڑھنے لگتے فارسی اور عربی کی اکثر کتابیں والد صاحب سے چھوٹی عمر میں پڑھ لیں، ۱۲، ۱۳ سال کی عمر میں شرح عقائد وغیرہ اور ۱۵، ۱۶ سال کی عمر میں مطول وغیرہ پڑھ ڈالیں، اور ۱۸ سال کی عمر میں تمام علوم عقلیہ ونقلیہ پڑھ کر فراغت حاصل کر لی۔

اسکے بعد آپ ماوراء النہر تشریف لے گئے اور وہاں مشہور علماء سے اکتساب علم وفیض کیا، آپ کے اساتذہ آپکے علوم کے معترف تھے، فرماتے ہیں کہ جب میں کوئی علمی بات کرتا تو میرے اساتذہ فرماتے تھے کہ عزیز من! در اصل ہم تم سے استفادہ کرتے ہیں اور تمہارے شکر گزار ہیں۔

سلوک وطریقت

والد بزرگوار کے فیض صحبت سے اس راہ کے بھی شہسوار ہوئے، بچپن ہی سے شیخ سیف الدین تربیت باطن کرتے رہتے تھے، اولیا اور صوفیا کے واقعات، ان کے عشق وشوق کے واردات اپنے صاحبزادہ کو سناتے اور گرمی عشق سے ان کے دل کو بھی گرماتے، تلب میں استعداد تو کامل درجہ کی پہلے سے موجود تھی

ذراسی آگ دکھانے کی دیر تھی کہ قلب سے عشق حقیقی کے ایسے شعلے اٹھنا شروع ہو گئے جو آخر دم تک ماند نہ پڑے۔ قلب ہمیشہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتا جس کا لازمی اثر یہ تھا کہ لوگوں کے میل جول سے نفرت اور ذکر و فکر کیلئے خلوت کو اختیار کر لیا۔

یہ زمانہ اکبر بادشاہ کا تھا جس میں دین کی بے حرمتی اور بدعات کی ترویج سرکاری طریقہ پر کی جارہی تھی، امرائے دربار نے شیخ عبدالحق کو اپنے ساتھ ملانا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے جس کی قسمت میں احیائے دین کی نعمت لکھدی ہو وہ بھلا ان ہتھکنڈوں میں کب آنے والا تھا۔

سفر حجاز

ہندوستان کی اس دور کی مذہبی حالت سے دل برداشتہ ہو کر شیخ نے سفر حجاز کا ارادہ کیا، اور ۹۹۶ھ میں جبکہ آپکی عمر ۳۸ سال کی تھی براہ گجرات حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا۔ رمضان سے کافی پہلے حجاز پہنچ گئے اور وہاں کے علما سے علم حدیث کی تکمیل کی اور تمام کتب صحاح کا سماع کیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے علوم ظاہری کی تکمیل کے ساتھ سلوک طریقت میں بھی رہنمائی فرمائی، رمضان اپنے شیخ کی خدمت میں گذارا اور حج بھی انکے ہمراہ ادا کیا۔ حج سے فراغت کے بعد اپنے شیخ کے حکم کے مطابق حرم شریف کے ایک حجرہ میں ان کی زیر نگرانی عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ شیخ متقی رح کی تربیت اور خصوصی توجہ نے آپکو اکسیر بنا دیا، تین سال تک حجاز میں قیام رہا اور عجیب و غریب الطاف و واردات سے نوازے گئے۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کو بے انتہا عشق تھا، دیار مدینہ میں جاتے تو فرط ادب سے برہنہ پا ہو جاتے، اسی دوران متعدد مرتبہ آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

ہندوستان واپسی

حجاز مقدس میں تین سال قیام میں آپ علم و عمل اور ظاہر و باطن کی تمام گھاٹیوں سے گزر چکے تھے، اب جب ہر طرح تکمیل ہو گئی تو شیخ متقی نے ہندوستان واپس جانے کا حکم دیا، شیخ عبدالحق رح ہندوستان کے حالات سے ایسے دل برداشتہ تھے کہ یہاں آنے کو بالکل دل نہ چاہتا تھا لیکن حکم شیخ کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ آپنے پھر یہ درخواست کی بغداد کے راستہ واپسی کی اجازت مل جاتے تاکہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے مزار مبارک پر حاضری ہو سکے، لیکن شیخ نے اس کی بھی اجازت نہ دی، آخر مجبور ہو کر بادل ناخواستہ ۱۰۰۰ھ میں ہندوستان واپس آئے۔

شیخ نے ہندوستان آکر دیکھا کہ اکبر کے باطل افکار نے دین الٰہی کی شکل اختیار کر لی ہے اور اسلامی شعائر کی کھلے عام تضحیک ہو رہی ہے، اہل حق کی آواز یا تو بے اثر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے یا انھیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جارہا ہے، حضرت شیخ نے ایسی صورت میں حفاظت دین کی ایک مؤثر اور خاموش تدبیر اختیار کی کہ ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور درس و تدریس اور وعظ و تلقین میں مشغول ہو گئے۔

مشائخ

شیخ عبدالحق رح نے بچپن میں اپنے والد بزرگوار شیخ سیف الدین سے روحانی تربیت حاصل کی، اور ۹۸۵ھ میں اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ سید موسیٰ گیلانی رح سے (جو سلسلۂ قادریہ کے مشاہیر شیوخ میں سے ہیں) وابستہ ہوئے، ۹۹۶ھ میں حجاز مقدس میں شیخ عبدالوہاب متقی رح سے سلسلۂ ارادت قائم کیا، اور پھر دہلی کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ رح سے جنکی تمام عمر احیائے سنت میں گزری ہے بیعت کی۔ مذکورہ بالا اولیائے کرام رح کی خصوصی توجہات اور فیوض و برکات سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ بلند و بالا مقام پر فائز ہو گئے۔

وفات

یہ آفتاب علم جس نے عرصۂ دراز تک فضائے ہند کو اپنی ضیا پاشیوں سے حیات روحانی عطا کی ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو غروب ہوگیا، آپ کی عمر ۹۴ سال کی ہوئی۔ نماز جنازہ آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ نور الحق رح نے پڑھائی، اور آپ کو آپ کی وصیت کے مطابق حوض شمسی کے کنارے سپرد خاک کردیا گیا۔ آپ کی تاریخ ولادت شیخ اولیا ۹۵۸ اور تاریخ وفات فخر عالم ۱۰۵۲ ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

اولاد امجاد

حضرت شیخ کے تین صاحبزادے ہوئے شیخ نور الحق، شیخ علی محمد۔ اور شیخ محمد ہاشم سب سے بڑے شیخ نور الحق رح اپنے والد کے علم وفضل کے وارث ہوئے، خود حضرت شیخ انھیں "عبدالحق ثانی" فرمایا کرتے تھے، عہد شاہجہانی میں اپنے والد کی حیات میں ہی انھوں نے عہدۂ قضا قبول کرلیا تھا، آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائیں جن میں صحیح بخاری کی شرح تیسیر القاری چھ جلدوں میں بہت مشہور ہے

دوسرے صاحبزادہ شیخ علی محمد بھی بڑے عالم وفاضل اور صاحب تصانیف بزرگ ہوئے اور تیسرے صاحبزادہ شیخ محمد ہاشم بھی اونچے درجہ کے عالم اور علم حدیث سے خاص مناسبت رکھنے والے تھے۔

تصانیف

حضرت شیخ کی عمر کا اکثر حصہ تصنیف وتالیف میں گزرا ہے آپ کی تصانیف کی تعداد ساٹھ ہے اور مکتوبات ورسائل کو بھی اگر شامل کرلیا جائے تو سو سے اونچی تعداد ہو جاتی ہے، ہر فن پر آپ کی تصنیف موجود ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ (۲) اخبار الاخیار (۳) آداب الصالحین (۴) تکمیل الایمان (۵) جذب القلوب (۶) شرح سفر السعادۃ (۷) شرح فتوح الغیب (۸) ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ (۹) مدارج النبوۃ (۱۰) مرج البحرین۔

کچھ مکتوبات سے متعلق

اصل مکتوبات فارسی میں ہیں جنھیں اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے، اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ لفظی ترجمہ کی پیروی نہ ہو بلکہ مفہوم کو صحیح اور مختصر انداز میں بیان کردیا جائے۔ ان مکتوبات میں بہت سی علمی اور فنی اصطلاحات بھی آگئی ہیں جن کا سمجھنا اہل فن کا حصہ ہے، دوسرے حضرات اس کے درپے نہ ہوں، بعض مقامات پر ایسے مضامین بھی آئے ہیں جو ظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، وہاں اول تو یہ کوشش کی گئی ہے کہ کچھ اضافہ وغیرہ کرکے مطلب کو صحیح کردیا جائے، اور جہاں ایسا نہیں ہوسکا اس کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ بزرگوں کے ایسے اقوال کی تاویل کرلی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ ہم ان کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکے ہیں، ایسے مشتبہ اقوال کسی حال میں بھی دوسروں کے لئے قابل عمل نہیں ہیں ان اقوال وحالات کی وجہ سے نہ تو شریعت کو چھوڑا جائے نہ بزرگوں سے بدگمانی اور ان کی شان میں گستاخی کی جائے۔ نسئال اللہ التوفیق والھدایۃ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

سنت خیر الانام

مصنفہ: حضرت مولانا محمد کرم شاہ صاحب فاضل جامعہ ازہر

انکار سنت کے اس پرفتن دور میں اس مسئلے کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے کہ حضرت رسول کریم کی سنت مطہرہ کی حقیقت کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ مسلمان سنت رسول ع کے مطابق اپنی زندگی گزار کر خداوند قدوس کے حضور سرخروئی حاصل کر سکیں اس اہم موضوع پر فاضل مصنف نے جس محنت و کاوش کا مظاہرہ کیا ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی مختلف مسائل وجزئیات اور ہر مکتب خیال کے علماء نے اسکو بے حد پسند فرمایا ہے منکرین حدیث کیلئے تازیانہ کی حیثیت رکھتا ہے ہم نے عمدہ خوشخط کتابت و طباعت کے ساتھ اعلیٰ کاغذ پر طبع کیا ہے۔ دورنگہ حسین سرورق اور مضبوط جلد معہ دورنگہ حسین گرد پوش نے اس میں مزید چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کتاب پر مختلف رسائل نے جو تبصرے کئے ہیں اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں جس سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

فاران: اپنے موضوع پر "سنت خیر الانام" بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ فاضل مولف نے شائستگی متانت اور سنجیدگی کی حدود میں رہ کر فتنہ انکار حدیث کا رد فرمایا ہے۔ **چراغ راہ:** اس موضوع پر اس سے مدلل اور مفصل کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ **چٹان:** یہ کتاب انکار حدیث کی مذموم تحریک پر پوست کندہ تبصرہ ہے۔ حدیث کے موضوع پر عربی، فارسی اور اردو میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا ماحصل زیر نظر کتاب میں آگیا ہے۔ **تسنیم:** فاضل مولف نے فی الحقیقت بڑی کاوش کی ہے کہ اس موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہنے پائے۔ طالب حق کو اس کتاب کے دامن میں اطمینان قلب کا بڑا سامان مل سکتا ہے۔ **کامران:** تحقیق و تدقیق کے باب میں مصنف کی یہ مجاہدانہ کاوش لائق صد ستائش و تبریک و تحسین ہے۔ **طلوع اسلام:** ...... اس سے مترشح ہو کہ مصنف نے اسے جذبۂ عقیدت کے ساتھ لکھا ہے۔

قیمت لاگت کے عین مطابق و انتہائی مناسب سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۳۱۲ صفحات قیمت مجلد

خواتین اسلام

مرتبہ: مفتی انتظام اللہ شہابی

اسلام کی تاریخ میں ایسی ایسی نامور بہادر اور نیک دل خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جن کی نظیر دنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت ہر فرد کیلئے بیحد ضروری ہے اردو میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر اب تک کوئی نہیں تھی جس میں خواتین اسلام کا مکمل تذکرہ جمع ہو الحمدللہ اسی ضرورت کے پیش نظر ملک کے نامور اہل قلم و عالم بے بدل حضرت مفتی انتظام اللہ شہابی جو متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں نے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے جو واقعات کے اعتبار سے بے حد مستند اور زبان کے لحاظ سے انتہائی سلیس و عام فہم ہے اسکا مطالعہ ہر مسلمان کیلئے عموماً اور خواتین کیلئے خصوصاً بے حد ضروری ہے کتابت و طباعت انتہائی خوشخط و دیدہ زیب ہے خوبصورت دورنگا گرد پوش و مضبوط جلد نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۳۱۲ صفحات کاغذ عمدہ گلیز۔ قیمت مجلد ۷/-

---

تعبیر الرؤیا مترجم

مصنفہ: علامہ امام محمد بن سیرین رح

مترجم: سید حبیب احمد ہاشمی

تعبیر کا فن مسلمانوں میں زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اس فن میں جو مہارت اور ناموری علامہ ابن سیرین رح کو حاصل ہوئی وہ آج تک کسی کو نہ حاصل ہو سکی حتیٰ کہ آپ فن تعبیر کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں آپ نے جتنی بھی تعبیریں لوگوں کے خواب کی بیان کی ہیں وہ سب سو فیصد صحیح ثابت ہوئی ہیں اس کتاب میں امام موصوف نے تعبیر کے اصول بیان فرمائے ہیں کہ فلاں چیز کو فلاں حالت میں خواب کے اندر دیکھنے سے کیا تعبیر ہوتی ہے عجیب معلوماتی و بے نظیر کتاب ہے ہم نے اصل عربی کتاب کا بامحاورہ سلیس و عام فہم اردو زبان میں ترجمہ کر کے ایک کالم میں عربی متن مقابل کالم میں اردو ترجمہ انتہائی خوشخط کتابت و آفسٹ کے ذریعہ دیدہ زیب طباعت پر طبع کر کے عمدہ مضبوط جلد کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کاغذ عمدہ گلیز سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت مجلد پانچ رو.